خوش آمدید

گذشتہ ماہ اپریل میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کا وہ اہم اجلاس منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر سرضیاء الدین احمدؐ کو عہدہ وائس چانسلر پر بالاتفاق آرا منتخب کیا گیا۔

ڈاکٹر سرضیاء الدین احمدؐ کی شخصیت علی گڑھ کی پیداوار ہی۔ موصوف کو گذشتہ پینتالیس ۴۵ سال سے کسی نہ کسی حیثیت سے علی گڑھ سے تعلق رہا ہی بحیثیت طالبعلم، پروفیسر، پرنسپل، پرو وائس چانسلر اور وائس چانسلر وہ علی گڑھ میں رہے ہیں اور ان عہدوں پر موصوف نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

گذشتہ تیس ۳۰ سال سے ڈاکٹر صاحب موصوف کو مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات سے گہرا تعلق رہا ہی اور وہ اپنے وسیع تجربے سے ان تحریکات کو مستفید ہونیکا موقع دیتے رہے ہیں اسی بنا پر ہم بلا شک و شبہ کہہ سکتے ہیں کہ اس اہم عہدے کے لئے اس وقت مسلمانوں میں ان سے زیادہ موزوں و مناسب ہستی نہیں ہے۔

ہمیں مسرت ہی کہ قوم نے انکی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اس عہدے کو منتخب کیا

علی گڑھ میگزین

جلد ۱۸ | مارچ سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۱

اداریہ

میگزین کا پیش نظر شمارہ بہت تاخیر کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے ہمارے پیشرو کے آخری پرچے اور اس پرچے کے درمیان ایک سال سے زائد کا وقفہ گذر چکا ہے۔ میگزین کی اشاعت میں تاخیر کے لئے ہمارے پیشرو مضامین کی عدم وصولی یا مطبع کی عدم توجہی کی آڑ میں پناہ لیتے رہے ہیں مگر ہمیں اس معاملے میں سب سے بڑی شکایت خود اپنے پیشروؤں ہی سے ہے۔

میگزین کی ادارت جس زمانے میں ہمارے سپرد ہوئی وہ مالیات کے اعتبار سے میگزین کی زندگی کا بحرانی ر Chaotic ، دور کہا جا سکتا ہے۔ ادارت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ہمیں یہ اطلاع بھی ودیعت کی گئی کہ میگزین بقدر تین ہزار روپئے کے مطبع کا مقروض ہے۔ چنانچہ مطبع والوں نے تاوقتیکہ ان کا روپیہ ادا نہ ہو جائے میگزین کی طباعت سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ماہ تک میگزین مرتب کیا ہوا ہمارے پاس پڑا رہا۔ خدا خدا کر کے گذشتہ نومبر

میں مطبع والے کچھ تو اس وجہ سے کہ ان کے مطالبے کا بڑا حصہ ادا ہو چکا تھا اور کچھ ہمارے ہر دلعزیز پرو وائس چانسلر پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب کی سفارش پر میگزین کی طباعت پھر دوبارہ شروع ہو گئی لیکن باوجود اس کے مطبع کا کام اس قدر سست ہوتا رہا کہ وقت پر پھر بھی پرچہ شائع نہ ہو سکا۔ مطبع والوں کے اس طرز عمل کی پشت پر غالباً یہ خیال کارفرما تھا کہ اس سست روی سے پرچہ دیر میں نکلیگا اور اس وقت تک ان کا کل مطالبہ ادا ہو جائیگا۔ بہرحال ہمیں خوشی ہے کہ ہم اپنے جانشین کے لئے راستہ ہموار کئے جا رہے ہیں اور انھیں اس قسم کی دقتوں کا سامنا نہ ہو گا۔

علی گڑھ میگزین کی اہمیت اور حیثیت پر بارہا اور بہت وضاحت سے روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ ہم اس سلسلے میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کریں گے کہ یہ رسالہ مسلمانوں کے واحد مرکزی ادارے کے افراد کی علمی وادبی کاوشوں کا آئینہ ہے اور علی گڑھ سے باہر اسی رسالے سے ہمارے علمی ذوق اور ادبی خدمات کے معیار کو متعیّن کیا جاتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ میگزین کے لئے مضامین کے انتخاب میں ہم نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا ہے۔ افسانوں کی کمی جو اس نمبر میں بہت نمایاں ہے اسی وجہ پر مبنی ہے۔ ممکن ہے ہمارے احباب کو اس سلسلے میں ہم سے کوئی شکایت ہو مگر اجتماعی مفاد، جامعہ کی فلاح اور اپنی فرض شناسی پر ہم انفرادی شہرت اور خوشنودی کو ترجیح نہیں دے سکتے۔

وقارالملک ہال اور سرسید ہال

تعلیمی سالِ رواں کے آغاز سے ڈاکٹر سید محمد طاہر رضوی صاحب وقارالملک ہال کے اور ڈاکٹر ہادی حسن صاحب سرسید ہال کے پرووسٹ مقرر ہوئے۔ اِن دونوں حضرات کو اپنے علی گڑھ کے دورانِ قیام میں یونیورسٹی کے نظم ونسق سے گہرا تعلق رہا ہے۔ خصوصاً طلباء کے معاملات میں ہمارے یہ محترم اساتذہ ہمیشہ ہمدردانہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِن دونوں ہال کے طلبا اِس نئے انتظام سے خوش اور مطمئن ہیں۔

علی گڑھ ایک اقامتی ادارہ ہے اور اسی وجہ سے طلبار کی اقامتی زندگی کا مسئلہ یہاں بہت اہم ہے۔ طلبا کی ذہنی تربیت اور جسمانی و روحانی نشو و نما کی تمامتر ذمہ داری یونیورسٹی پر عاید ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ پرووسٹ کی جگہ کے لئے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو نوجوانوں کی نفسیات اور ان کے رجحانات سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ چنانچہ انھیں نزاکتوں کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر سید محمدؐ طاہر رضوی صاحب۔ اور ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کو منتخب کیا گیا ہے۔ ہم یونیورسٹی کے حکام کو ان کی جوہر شناسی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں ان بزرگوں کے دور میں وقار الملک ہال اور سرسید ہال نمایاں ترقی کریں گے۔

آفتاب ہال

سنہ ۴۰ء سے پروفیسر غلام سرور صاحب کے پرووسٹ ہو جانے سے آفتاب ہال میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی ہے۔ اقامتی زندگی کے ہر شعبہ کو ضروری ترمیم و اضافہ کے بعد بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم اصلاحات ڈائننگ ہال سے متعلق ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت خیز امر یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں جبکہ جنس اور دیگر اشیا کی گرانی ایک پیچیدہ مسئلہ کی صورت اختیار کر چکی ہے کھانا بغیر فیس میں کسی قسم کے اضافہ کے روز بروز بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ کھانے کی بہتری کے ساتھ ساتھ ڈائننگ ہال میں نشست کا انتظام بھی پہلے سے کہیں زیادہ معقول ہو گیا ہے۔ طلبہ کو کھانے اور ڈائننگ ہال کے متعلق جو شکایت رہا کرتی تھی وہ کم ہوتی جا رہی ہیں اور اُمید کی جاتی ہے بہت جلد مزید اصلاحات کے بعد آفتاب ہال کا ڈائننگ ہال یونیورسٹی میں اپنے انتظام کے لحاظ سے نمونہ بن جائے گا۔

آفتاب مجلس ایک اہم مقصد کے لئے بنائی گئی تھی لیکن بدقسمتی سے کچھ عرصہ سے اقامتی زندگی کا یہ مفید ادارہ بالکل مردہ ہو گیا تھا خدا کا شکر ہے کہ پچھلے سال سے اس میں از سر نو زندگی پیدا ہو گئی ہے اور طلبہ روز بروز اس میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں کامن روم ریڈنگ روم بھی توجہ سے محروم نہیں رہے ہیں۔ چار سو سے زیادہ

نئی کتابوں کا اضافہ اور کامن روم کے لئے علیحدہ عمارت کا انتظام اس سال کی اہم اصلاحات ہیں۔ کتابوں اور رسائل کا انتخاب اس طرح کیا گیا ہے کہ ہر مذاق کے طلبہ کے علمی ذوق کی تشفی ہو سکے۔

آفتاب ہال کے طلبہ یونیورسٹی کے دیگر مشاغل میں بھی اپنی نمایاں حیثیت اور امتیازی شان قائم کئے ہوئے ہیں۔ نہ صرف امتحانات کے نتائج میں، یہاں کے طلبہ ممتاز رہتے ہیں بلکہ ورزشی کھیلوں، مضمون نویسی کے مقابلوں اور تقریری مباحثوں میں بھی۔ سب سے آگے رہتے ہیں۔ اِس سال نمائش کے کل ہند فٹ بال اور ہاکی مقابلوں میں آفتاب ہال کی ٹیمیں سب سے بازی لے گئیں۔ ان مقابلوں میں مقامی ٹیموں کے علاوہ بیرونجات کی بھی مشہور ٹیموں نے بھی حصّہ لیا تھا۔

آفتاب ہال کا یہ دور بجا طور پر عمومی ترقی کا دور کہا جا سکتا ہے جس کے لئے پرووسٹ صاحب موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُن کے عہد میں آفتاب ہال روز افزوں ترقی کرے گا۔

انجمن اسلامیات

یہ انجمن گذشتہ کئی سال سے گرانقدر مذہبی خدمات انجام دے رہی ہے اس کے زیرِ اہتمام وقتاً فوقتاً جلسے ہوتے رہتے ہیں جن میں مسلمانوں کے درخشاں ماضی، ان کی موجودہ پستی اور اس کے اسباب پر بہت وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔ رسولِ کریم صلعم کی سیرت، قرآن حکیم کی تعلیم اور خلفاءِ راشدین کے کارناموں پر ملک کے بہترین مقررین تقاریر کرتے ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ انجمن کے ذمہ دار اصحاب اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اِس ادارے کے طلباء اپنے مذہب سے وہ بیگانگی محسوس نہیں کرتے جو آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے ان کی گمراہی کے سبب، باعثِ فخر ہے۔ مسلم یونیورسٹی اپنی مرکزیت کے اعتبار سے اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے۔ تمام ملک کے مسلمانوں کی آنکھیں اس کی

طرف لگی ہوئی ہیں۔ یہی نوجوان جو آج یہاں تعلیم پا رہے ہیں کل قوم کی رہنمائی کریں گے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ ایک سچی اسلامی فضاء پیدا کر کے طلباء کے دل و دماغ میں اسلامی عقائد اور ایک صحیح اسلامی نصب العین کا تصور مستحکم کر دیا جائے۔

ہم انجمن کے ذمہ دار اصحاب خصوصاً ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب قبلہ اور ڈاکٹر محمود احمد صاحب محترم کو ان کی مساعی کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

انجمن تاریخ و تمدنِ اسلام

ہمارے موجودہ حکمرانوں نے جس وقت سے اپنے قدم ہمارے ملک میں جمائے ہیں ان کی انتہائی کوشش اس امر میں رہی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے زرین کارناموں اور اپنے اجداد کی درخشاں روایات کا نقش اپنے دل سے مٹا دیں اور مغربی تہذیب اور روایات کے، جن کی بنیاد خالص مادّیت پر ہے، تاثرات قبول کریں۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی سیاسیات کو اپنے اس مقصد میں پوری پوری کامیابی ہوئی۔

اس نئی اور پُرانی تہذیب کی ٹکر کا نتیجہ ایک ذہنی اختلاط کی صورت میں رونما ہوا۔ مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے تمدن کی بنیاد ان کے مذہب پر تھی جو اس "ملمع" سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے ہم مغربی تاثرات قبول کرتے گئے ہماری مذہب کی گرفت بھی ڈھیلی پڑتی گئی۔

مغربی مدبرین نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ ہندوستان میں ابتدائی مدارس سے لیکر اعلیٰ درسگاہوں تک نصاب تعلیم اس قسم کا رکھا گیا جو ہمیں ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب سے اور بھی دور لے گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں میں ایسا نصاب داخل کرنے اور اُسے قبول کرنے پر مجبور تھے۔ اگر ہم اپنے طریقے پر تعلیم دیتے

نو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہماری قوم کے نوجوانوں کو "کاسہ گدائی لیکر" "تماشائے اہل کرم" دیکھنا پڑتا۔

تعلیم کی ان کمیوں کو مسلم یونیورسٹی کے طلبار اور اساتذہ نے بر وقت محسوس کیا اور یہی احساس اس درسگاہ میں "انجمن تاریخ و تمدنِ اسلام" کو وجود میں لانیکا محرک ہوا۔

یہ انجمن گذشتہ کئی سال سے گرانقدر مذہبی خدمات انجام دے رہی ہے ان جلسوں کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً اس کے زیر اہتمام ہوتے رہتے ہیں ہر سال اس انجمن کی جانب سے اسلامی ہفتہ منایا جاتا ہے جس میں ملک کے بہترین مقرّر اور علما اسلامی مسائل اور موضوعات پر تقریر کرنے کے لئے مدعو کئے جاتے ہیں۔ اور سوئی ہوئی قوم کو مسلسل ایک ہفتہ تک جھنجھوڑا جاتا ہے۔

اس انجمن کی جانب سے بعض اہم اسلامی مسائل پر مطبوعات کا ایک سلسلہ بھی شائع کیا گیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ انجمن کے اراکین اور ذمہ دار اصحاب کی کوششوں سے یونیورسٹی میں ایک صحیح اسلامی فضا پیدا ہو گئی ہے۔

ہم انجمن کے اراکین خصوصاً ڈاکٹر امیر حسن صدیقی صاحب نائب صدر انجمن مذکور کو ان کی کوششوں کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

فلک کا آخری تارا بھی ٹوٹا

اس سال کا سب سے بڑا حادثہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام ہندوستان کے لئے، آنریبل سر شاہ محمد سلیمان کی قبل از وقت موت ہی۔ ۱۳ مارچ ۱۹۴۱ء کو مرحوم نے ایک مختصر سی علالت کے بعد اس دنیا کو الوداع کہا۔ خدا جوارِ رحمت میں مرحوم کو جگہ دے۔

مرحوم اعظم گڈھ کے ایک مشہور علمی خاندان کے فرد تھے۔ انکے مورثِ اعلیٰ ملا محمود جون پوری "شمس بازغہ" اور "فرائد" کے مصنف کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ خود سر سلیمان مرحوم ایک زبردست عالم اور ادیب تھے۔ ایسا جامع صفات شخص شاید اب دیکھنے میں نہ آئے۔ اگر ایک طرف انھوں نے قصائد ذوق اور مثنویات میر کو مرتب کیا ہی تو دوسری طرف آئنسٹائن کے نظریہ پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔ ملک و قوم کو ایک زبردست قانون دان اور عالم سائنس کا رونا ہے، لیکن ہمارا غم دوگنا ہی۔ ہم سے ہمارا ہر دلعزیز وائس چانسلر ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ افسوس۔

ان کی موت سے علمی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، افسوس کہ وہ اب پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔

خان بہادر مولانا عبدالخالق صاحب مرحوم

سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء کا تعلیمی سال مسلم یونیورسٹی کے لئے نہایت نامبارک ثابت ہوا۔ اس سال ہمیں جن نامور ہستیوں کی دائمی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا اُن میں خان بہادر مولانا عبدالخالق صاحب کی ذات بھی تھی۔

مولانا مرحوم ایک عرصہ دراز سے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے صدر کی خدمات انجام دے رہے تھے اور اس حیثیت سے ان کے معاونین اور طلبا کو ان سے گہری موانست اور قریبی تعلق تھا۔ مولانا مرحوم بیک وقت ایک شفیق استاد ایک ہمدرد بزرگ اور ایک سچے مسلمان تھے۔ ایسی ہستی کی دائمی مفارقت پر ہم جتنا بھی رنج کریں کم ہے۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے (آمین)

مولانا عبدالخالق صاحب مرحوم کی موت سے مسلم یونیورسٹی کی انجمن الفرض کو بھی بڑا صدمہ پہونچا ہے۔ مولانا مرحوم ایک عرصے سے اس انجمن کے مشیر قانونی تھے، اور بغیر کسی معاوضے کے یونیورسٹی کے اس مفید ادارے کے قانونی امور پر اپنا قیمتی وقت صرف کرتے تھے۔ مرحوم کا یہ ایثار قابلِ قدر تھا۔

ہم مولانا صاحب مرحوم کے صاحبزادے جناب حفیظ الرحمٰن صاحب محترم لکچرر شعبۂ قانون سے اُن کے اس صدمہ پر دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

"بالائے غمہائے دگر"

افسوس ہے کہ مولانا ابوبکر محمدؒ شیث صاحب، مسلم یونیورسٹی کے ناظم دینیات نے ایک طویل علالت کے بعد اپنے وطن جونپور میں ۲۷ ستمبر کی شب میں انتقال کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا مرحوم جونپور کے ایک مشہور علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے دادا مولانا سخاوت علی صاحب، نے مولانا شاہ عبدالحئی صاحب دہلوی اور مولانا اسماعیل شہید سے فیض حاصل کیا تھا۔ اور پورب میں توحید وسنت کے سب سے بڑے داعی اور اس دور میں اسلامی علوم وفنون کے بہت بڑے مدرس تھے۔ خود مولانا ابوبکر صاحب مرحوم نے مدرسہ احمدیہ آرہ میں، مولانا عبداللہ صاحب غازیپوری سے تعلیم حاصل کی تھی۔

مولانا مرحوم ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک پندرہ برس مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات رہے اور اپنے خلوص، محبت اور اخلاق کا ایسا گہرا نقش دلوں پر چھوڑا کہ ہر مشرب کے لوگ ان کے ماتم میں شریک ہیں۔

ہمیں ایک عالم سے زیادہ ایک نیک نفس انسان کی جدائی کا غم ہے۔

اُردو شاعری میں پرانا اور نیا انداز

جناب آلِ احمد سرور ایم۔ اے (علیگ)
سینئر لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خمریات

شعر و ادب میں شراب کا ذکر اس کثرت سے کیوں ہوتا ہے یہ تو اس پرانے گنہ گار سے پوچھیئے جو مست جام شراب ہونا کافی نہیں سمجھتا بلکہ غرق جام شراب ہونا چاہتا ہے میں تو توبۃ النصوح قسم کا آدمی ہوں دور سے تماشہ دیکھنے والا! میں آپ کو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ ہمارے رند کس شراب سے مست ہیں اُن کی شراب نئی ہے یا پرانی۔ شراب طہور ہے۔ یا شراب پرتگالی"۔ اُن کی مستی بادہ و ساغر والی مستی ہے یا وہ صرف "کیفیت چشم" دیکھ کر مست ہوگئے ہیں، وہ بے پیئے ہی جھومتے جاتے ہیں" یا نظر کو چند موجودہ پر جما کر بے خبر" ہوگئے ہیں۔

اردو شاعری کا ابھی بچپن تھا کہ اس پر فارسی کا اثر شروع ہوا۔ فارسی غزل کی جان ہی عشق و محبت کی داستانیں اور رندی و سرمستی کا مرقّع ہیں۔ یہ رندی و سرمستی اُردو میں کیسے نہ آتی۔ آئی اور خوب آئی۔ پہلے پہل لوگ پیتے کچھ اور تھے اور اُن کی مستی کسی اور قسم کی ہوتی تھی۔ آگے چل کر اُن کی شراب اور ان کی مستی دونوں اس دنیا کی چیزیں ہوگئیں۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا جب بے پیئے مست ہوتے تھے اور اچھے اچھے پرہیز گار شراب کے مضامین اس وجہ سے باندھتے تھے کہ اُن کے بغیر غزل مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ خمریات کے عناصر میں شراب، ساقی، پیر مغاں، جام و ساغر مستی و سرشاری، باغ و بہار سب آجاتے تھے۔ میخانہ کا مقابلہ مسجد سے ضرور تھا اور واعظ، محتسب یا زاہد یا شیخ کی پگڑی اچھالنی بھی لازم تھی۔ یہی سب مضامین فارسی میں صدیوں تک باندھے گئے۔ اُردو میں بھی اس کی تقلید ہوئی۔ جس طرح فارسی کے آغاز میں تصوف کا اثر بہت گہرا ہے اسی طرح اُردو کی ابتدائی شاعری بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاعری اور دُرویشی مترادف الفاظ تھے۔

صوفیوں کی طریقت کا راستہ شریعت سے الگ تھا۔ شریعت ظاہری حالت پر زور دیتی تھی طریقت میں باطنی کیفیت سب کچھ ہوتی تھی عالم باطنی کے مدارج طے کرنے اور معرفت الٰہی حاصل کرنے کے لئے عشق مجازی کے زینہ سے بھی گذرنا پڑتا تھا لیکن اس عالم میں عام اصطلاحات کے معنی کچھ اور تھے۔ یہاں شراب سے عرفان۔ ساقی سے ساقیٔ روز ازل اور پیر مغاں سے پیر طریقت مراد تھے اور شیخ یا زاہد کی تضحیک اس وجہ سے کی جاتی تھی کہ وہ ظاہری حالت کو دیکھتا ہے باطن پر نظر نہیں کرتا۔ جب تک تصوف کا دور دورہ رہا اس قسم کے مضامین میں کوئی چیز ایسی نہ ہوتی تھی جس کا اطلاق حقیقی رنگ پر نہ ہو سکے تصوف کے مضامین کو اس طرح بیان کرنا کہ غزل کی لطافت قائم رہے اور معرفت الٰہی کے مضامین عشق مجازی سے بالکل بے میل نہ ہو جائیں یہی قدماء کا کمال تھا۔ اُردو میں ولیؔ سے لے کر دردؔ تک کا کلام دیکھئے شراب کے مضامین ان بزرگوں کے یہاں بکثرت ملتے ہیں بلکہ ولیؔ اورنگ آبادی کے دیوان کی بعض ردیفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مادی عشق سے بھی نا آشنا نہ تھا مگر بحیثیت مجموعی اُن کے یہاں شراب کے مضامین سے وہی شراب معرفت مراد ہے۔ یہ مضامین تغزل کے دائرے میں بیان ہوتے ہیں۔

آلودہ کیوں نہ ہوئے دامان پاک زاہد — جب دست نازنین ہی جام شراب ہووے — ولیؔ
شب و روز اسطرح گذرے ہی اپنی تو نہ پوچھ کچھ — صراحی صبح کو گر ہاتھ ہے تو شام ہے شیشا — دردؔ
نگاہ مست ان آنکھوں کی کُل امید ہے ساقی — کہ ہم کم حوصلہ کے حق میں ہر اک جام ہے شیشا — ؍؍
آتش مے سے جو زاہد نے اُسے بھڑکایا — زاہد خشک ہوا خوب ہی تر پانی میں — ؍؍

اسی زمانہ میں ظاہری حالت پر طعن کرنے والوں کو شاعر کی طرف سے یہ زبردست جواب دیا گیا تھا ؎

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

دردؔ اور میرؔ کا زمانہ ایک ہی ہے لیکن میرؔ کے یہاں جو اشارے ملتے ہیں انمیں تصوف کی چاشنی سے زیادہ

عشق مجازی کی گرمی ملتی ہے۔ میر کے والد ایک درویش صفت آدمی تھے مرتے وقت بیٹے کو نصیحت کر گئے تھے کہ "عشق اختیار کرو" اس کے ساتھ دل نہایت دردمند اور گداز پایا تھا۔ چنانچہ میر کی شاعری میں عشق و محبت کی سچی اور بے لاگ تصویریں ملتی ہیں۔ اُنکا عام نقطۂ نظر متصوفیانہ ہے لیکن ایک غزل اُن کے یہاں ایسی ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ یہاں کی چیز بھی ملی ہوئی تھی۔ پوری غزل مرصّع ہے اور خمریات کا بہترین نمونہ ہے۔ جو اشخاص میر کو صرف مصورِ غم کا درجہ دیتے ہیں وہ دیکھیں کہ اس غزل میں کتنے جوش سے فلسفۂ عیش و مسرت کی تلقین کی گئی ہے۔

شیخ جی آؤ مصلّی گرو جام کرو — جنس تقویٰ کے تئیں صرف مے و جام کرو
فرش مستاں کرو سجادہ بے ننگ کے تئیں — مے کی تعظیم کرو شیشہ کا اکرام کرو
دامن پاک کو آلودہ رکھو بادے سے — آپ کو مُغبچوں کے قابل دشنام کرو
نیک نامی و ثقاوت کو دعا جلد کہو — دین و دل پیش کش سادۂ خودکام کرو
ننگ و ناموس سے در گذرو جوانوں کی طرح — پرفشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو
اُٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردنِ مینائے شراب — خدمتِ بادہ گساراں بھی سرانجام کرو
خشکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں — پاس جوشِ گل و دل گرمئے ایام کرو
سایۂ گل میں لب جو پہ گلابی رکھو — ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو

آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبح گلستاں میں بھی شام کرو

میر کے علاوہ اُن کے زمانے میں بھی اور بعد میں بھی شراب کے مضامین برابر ملتے ہیں۔ انشا جیسا درباری شاعر بھی برف میں لگا کر صراحی مے طلب کرتا ہے۔ ناسخ و آتش کے بیان خمریات میں رسمی انداز آچلا تھا یہ لوگ نہ تو بادۂ تصوف کے ذوق چشیدہ تھے نہ رند شاہد باز۔ ان کے یہاں شراب کے مضامین اس وجہ سے باندھے گئے ہیں کہ اُن سے

پہلے باندھے جاتے تھے خصوصاً محتسب کا ذکر تو تمام تر رسمی ہے اس لئے کہ ان کے زمانے میں اس کا ڈر بھی نکل گیا تھا ہاں ناصح و واعظ سے عداوت چلی آتی تھی۔ اُس زمانے میں غالب کی خمریات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جس طرح عربی میں ابو نواس اور فارسی میں خیام کی خمریات مشہور ہیں اسی طرح اُردو میں غالب کی۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے مشاہدۂ حق کی گفتگو میں بادہ و ساغر کے بغیر کام نہیں چلتا لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ غالب کے یہاں شراب کے مضامین تصوف والی شراب کے یا رسمی طور پر ہیں۔ ان کی شراب صاف صاف شراب پر تگالی ہے۔ انہیں بہشت اگر عزیز ہے تو اس شراب کی وجہ سے۔ ان سے جب کوئی کہتا ہے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو وہ فوراً جواب دیتے ہیں کہ جسے شراب میسر ہو اُسے اور کیا چاہیئے؟ اُن کے محبوب کا سب سے بڑا حسن یہ ہے کہ وہ چہرہ فروغ مے سے گلستان کئے ہوئے ہے۔ اُن کی محفل کا ہر گوشہ شیشہ باز کا سر ہے۔ اُن کی ہوا میں شراب کی تاثیر ہے وہ اپنی مستی کی آڑ میں محبوب سے آزاد بھی ہو جاتے ہیں۔ بہشت و دوزخ کا استہزاء بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ بہت سی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں غالب کے بیشتر اشعار عام طور پر لوگوں کی زبان پر ہیں چند پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب
دے بط مے کو دل و دست شنا موج شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستئ ارباب چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پر پروانہ شاید بادبان کشتئ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

اور دیکھئے توبہ کرلی ہے۔ ساغر و مینا توڑ چکے ہیں لیکن پھر بھی کس مزے سے اُن کا ذکر کرتے ہیں۔

توڑ کر بیٹھے ہیں ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا — آسمان سے بادہ گلفام گر برسا کرے

واعظ کے متعلق یہ بلیغ شعر بہت سی پھبتیوں سے اچھا ہے۔ اس میں نہ تو ذوق کی طرح اس کی ڈاڑھی کو شراب سے رنگا ہے نہ ناسخ کی طرح اُس کی ڈاڑھی کا ہر بال تبرک کرلیا ہے بلکہ اس کے ظاہر و باطن پر عجیب لطف سے تبصرہ کیا ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالبؔ کی خمریات میں ان کی رفعتِ تخیل اور لطافتِ بیان کے ساتھ ان کا شوقِ میکشی بھی شریک ہے اس شوقِ میکشی کی وجہ سے اُن کے اشعار میں شراب کی تمام مستی موجود ہے اور کہیں کہیں تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ ع آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔ اس تندیٔ صہبا کے تمام مدارج پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ ویسی ہی کوشش ہوگی جیسے غالبؔ کے رشک کے مضامین کو سلسلہ وار بیان کرنے کی۔ آپ نے دیکھا کہ خمریات کا رنگ غالبؔ کے یہاں سب سے نمایاں ہے۔ یہ نہ رسمی ہے نہ صوفیانہ بلکہ یہ اُن کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے بعد داغؔ نے بھی خمریات کے تمام مدارج کو اپنی غزلوں میں برتا۔ داغؔ کا حال بھی غالب کا سا ہے۔ دونوں ہم مشرب ہیں۔ داغؔ کی شوخی و بیباکی رندانہ مضامین میں خوب نمایاں ہوتی ہے۔ اور اگر انھیں کوئی محاورہ نظم کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو شعر اور بھی چمک جاتا ہے۔ اُن کے یہاں اور چھیڑ چھاڑ بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ طنز یا تو معشوق پر صرف ہوتی ہے یا پھر زاہد پر مثلاً ؎

زاہد کو ایک قطرۂ زمزم پہ ناز ہے — یاں خم کا خم اُڑاتے ہیں پیرِ مغاں کے ساتھ

دیکھنا پیرِ مغاں حضرت واعظ تو نہیں — کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھ کو

کی ترک مے تو مائلِ پندار ہو گیا — میں توبہ کرکے اور گنہگار ہو گیا

جا کے پی آئے وہاں آتے ہی توبہ کرلی ۔۔۔۔ اس قدر دور ہے مسجد سے خرابات ہی کیا
مئے انگور فرشتوں کی بھی قسمت میں نہیں ۔۔۔۔ اس سے محروم ہیں اک قبلۂ حاجات ہی کیا
کچھ زہر نہ تھی شراب انگور ۔۔۔۔ کیا چیز حرام ہو گئی ہے

یہ رنگ جو داغ کے یہاں وہ حقیقی ہے امیر کے یہاں رسمی اور داغ کی تقلید میں ہے اس لئے اچھے شعر کم ہیں تاہم ایک شعر میں ضرور پڑھوں گا جس کے متعلق یہ یقین نہیں آتا کہ امیر کا ہے ؎

انگور میں تھی یہ شے پانی کی چار بوندیں ۔۔۔۔ پس جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

مگر ان کے ایک شاگرد ریاض خیرآبادی نے جو مینائے امیر کی مستی پہ فخر کرتے ہیں خمریات میں خاص طور پر کمال حاصل کیا۔ ریاض کی طبیعت میں ایک غیر معمولی شوخی تھی۔ وہ ساری عمر جوان رہے اور ساری عمر عاشق حسن کی شوخی کا تو سب نے ذکر کیا ہے۔ مگر ریاض کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسی چٹیلی مسکراہٹ ایک ایسی شوخی ہے جس کا جواب حسن کے پاس بھی نہیں۔ انھوں نے ساری عمر شراب کے مضامین لکھے۔ شراب کے لئے بڑے ہی پیارے پیارے نام وضع کئے۔ ان کے تمام لوازم اپنی غزلوں میں نظم کئے مگر امیر جیسے پرہیزگار کے شاگرد کا دامن اس معصیت سے کیسے آلودہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہ مشکل سے یقین آتا ہے کہ جس شاعر کے دیوان میں بقول مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور تیرہ سو چھیاسٹھ اشعار خمریات کے ہوں وہ کیسے شراب سے بچ سکا۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت اکثر تلخ بھی ہوتی ہے چنانچہ ریاض کے حسب ذیل بے مثل شعر دراصل رسمی ہیں۔ یہاں شراب سے وہ کیفیت مراد ہے جو عشق میں حاصل ہوتی ہے یا جوانی کے راستہ سے آتی ہے ؎

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی ۔۔۔۔ تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی
جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے ۔۔۔۔ جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں   ہمیں بھی آج لطف لغزشِ مستانہ آتا ہے
مر گئے پر بھی تعلق ہے یہ میخانے سے   میرے حصّہ کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے
توبہ سے ہماری بوتل اچھی   جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے
جام مے توبہ شکن۔ توبہ مری جام شکن   سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کی
یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش   سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا
اُتری ہے آسمان سے جو کل اُٹھا تو لا   طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا
سایۂ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے   آج شیشہ میں اُسے ہم نے اُتارا کیسا
اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانہ میں ہو آئے   پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں
توبہ سے ڈرایا مجھے ساقی نے یہ کہہ کر   توبہ شکنی کے لئے اصرار نہ ہو گا

ان اشعار سے حقیقت میں اُس عام طبقہ کی تسکین ہو جاتی تھی جو شراب اس لئے نہ چکھ سکتا تھا کہ مذہب نے اُسے ممنوع قرار دیدیا تھا۔ یہ علامات جن کے ذریعہ سے قدماء کے دور میں ایک خاص کیفیت کا اظہار ہوتا تھا اب ادب اور شاعری کا جزءِ اعظم بن گئی تھی اور اچھے اچھے پرہیزگار اس کوچہ میں ساغر و مینا اچھالتے نظر آتے تھے۔ شاد عظیم آبادی کو دیکھئے انھیں اس دور کا میر کہا جاتا ہے۔ ان کے یہاں اضطراب کا عالم کس طرح بیان ہوتا ہے ؎

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی!   خم آئے گا صراحی آئے گی تب جام آئیگا

اور ان کا یہ شعر دیکھئے۔ کیا یہ صرف میخانہ تک ہی محدود ہے؟ ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی   جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مگر اس دور میں جگر کی شاعری خمریات کے لئے خاص طور پر ممتاز ہے۔ جگر ایک رند مشرب، رند وضع شاعر ہیں۔ ان کے یہاں جو شراب ہے اُسے بادۂ تصوف سے کوئی علاقہ نہیں۔ بقول ہمارے ایک نقاد کے اُن کی دلچسپی اتنی ساقی سے نہیں جتنی صہبا سے ہے۔ وہ

شراب کے لئے اور شراب اُن کے لئے بنی ہے۔ جس جوش وخروش سے وہ اپنی مستی یا بادہ وساغر کا ذکر کرتے ہیں وہ اُن کی اپنی زندگی سے لیا گیا ہے۔ اُن کی شاعری ان کی زندگی ہے اور اُن کی زندگی اُن کی شاعری دیکھئے ؎

مست جام شراب خاک ہوئے
غرقِ جامِ شراب ہونا تھا

شیشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست
آج پینے کا مزا پی کر بہک جانے میں ہے

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے اچھل رہی ہے پئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

ہم کہیں آتے ہیں واعظ تیرے بہکانے میں
اسی میخانے کی مٹی اسی میخانے میں

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
خلد شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں

مے کشو مژدہ کہ باقی نہ رہی قید مکاں
آج اک موج بہالے گئی میخانے کو

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

سرمستی ازل مجھے جب یاد آگئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

زاہد یہ میری شوخیٔ رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

غزل کے علاوہ نظموں میں بھی خمریات کا عنصر کافی ہے۔ مثنویوں میں شاعر جب سلسلہ کلام شروع کرتا ہے تو پہلے ساقی سے دو چار جام طلب کر لیتا ہے تاکہ نشۂ سخن اور زیادہ ہو۔ یہ وہی چیز ہے جو انگریزی شاعری میں بھی ملتی ہے وہاں شاعری کی دیوی سے خطاب ہوتا ہے۔ یہاں ساقی سے۔ چنانچہ ملٹن کی مشہور نظم "فردوس گمشدہ" کے ہر باب میں یہ سلسلہ اسی طرح شروع ہوتا ہے۔ مثنویوں کے علاوہ ساقی نامے علیحدہ بھی ملتے ہیں۔ ان سب میں شراب کے پردے میں کسی اور چیز کی خواہش ہے۔ ساقی نامے اس قدر مقبول ہوئے کہ مرثیہ جیسے مخصوص اور محدود عنوان کے تحت میں بہار اور ساقی نامہ کا عمل دخل ہو گیا۔ انیس نے بہار کا ذکر کیا تو ان کے نواسے پیارے صاحب رشید نے ساقی نامہ کا اضافہ

کر دیا۔ ان مضامین کے ذریعہ سے صرف قدرت کلام دکھانا مقصود تھا۔ نظیر اکبرآبادی کے یہاں بھی شراب کے مضامین ملتے ہیں مگر بالکل اسی طرح جس طرح عشق و جوانی کے مضامین نظیر زندگی اور اس کی نعمتوں اور لذتوں کو بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ جہاں کہیں شراب کے مضامین ہیں ان میں علامتی رنگ غالب ہے۔ آج کل ساغر اور جوش کے یہاں خمریات کا عنصر بہت کافی ہے۔ ان کی خمریات بالکل جگر کی خمریات سے ملتی جلتی ہیں۔ جوش کے چند جرعے چکھیے یا پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چڑھتے ہوئے نشہ کے تجزیہ کی کیسی کامیاب کوشش ہے۔ ساغر جب پکارتے ہیں کہ بھر بھر کے پیالوں میں جوانی دیدے تو وہ بھی شراب مانگتے ہیں۔ ان دونوں شعراء کے یہاں شراب ہی شراب ہے اس میں علامتی رنگ بالکل نہیں۔ یہ مستی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور ان کا فلسفۂ زندگی لذتیت سے تعمیر ہوا ہے۔

اس مستی کو نیا کہئے یا پرانا اس میں اور قدماء کی مستی میں یقیناً فرق ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور قسم کی تبدیلی بھی صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ واعظ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ جو خمریات کا محبوب مضمون تھا اب ایک مستقل چیز ہوگئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں قدامت کے پجاریوں کا سب سے بڑا سہارا اور جدیدیت کی طاقتوں کو سب سے زیادہ سختی سے روکنے والا یہی زاہد یا واعظ ہے۔ ہمارے ہی رندانہ شاعری میں اس کی داڑھی پر پھبتی اڑائی جاتی تھی۔ اس کی ریاکاری کا پول کھولا جاتا تھا۔ اس کے ظاہر و باطن کا فرق دکھایا جاتا تھا۔ اب اکبر، جوش اور اقبال نے اُن کی ذہنیت پر سے نقاب اٹھایا ہے چنانچہ اقبال کے یہاں صوفی یا مُلّا یا زاہد سالوس کے خلاف بہت کچھ ملتا ہے۔ اکبر ملّا پر اس لئے چوٹ کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑے طنز نگار ہیں اور جہاں کہیں انہیں فساد نظر آتا ہے وہ بغیر اپنا نشتر استعمال کئے نہیں رہ سکتے۔ جوش کی طنز میں قدیم اور جدید رنگ کا اتصال ملتا ہے۔ واعظ پر یہ اعتراض ہے کہ وہ شرابی کیوں نہیں۔ اقبال اس سے اس

لئے ناراض ہیں کہ وہ صحیح معنی میں مسلمان نہیں ہے اور وہ ملت کی رہنمائی کے قابل نہیں رہا۔ اس کے علاوہ چکبست نے کہیں کہیں بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کا بھی "نوحۂ قومی" چھیڑا ہے اپنی زمانہ کی نیم خود مختار حکومتوں کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے — ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے
یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اسکے ساقی ہیں — شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

آزادی کا یہ تصور پیش کرتے ہیں ؎

مے گلِ رنگ لٹتی یوں درِ میخانہ وا ہوتا — نہ پینے میں کمی ہوتی نہ ساقی سے گِلا ہوتا

اقبال نے سب سے پہلے خمریات کے پرانے کوچہ میں ایک نیا ساز چھیڑا ہے۔ بانگ درا میں وہ ساقی سے اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے — مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں — کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری — سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

لیکن اس سے زیادہ اہم ان کا وہ ساقی نامہ ہے جو بالِ جبریل میں شامل ہے اور جس میں انہوں نے دورِ حاضر کے اہم مسائل پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ ساقی نامہ اقبال کی بہترین نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ یہاں شاعر ساقی سے جو شراب مانگتا ہے۔ وہ زندگی، حرکت عمل، خودی کی بلندی اور انسان کی معراج سے عبارت ہے۔ اس کے ایک ایک شعر میں بڑے سے بڑا مضمون آگیا ہے۔ بہار کی آمد ایک شعر میں بیان ہوتی ہے ؎

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

اقبال کیا مانگتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات — وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات

وہ مے جس سے ہے سوز و سازِ ازل — وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل
اُٹھا ساقیا پردہ اُس راز سے — لڑا دے ممولے کو شہباز سے

دورِ حاضرہ پر تبصرہ ملاحظہ ہو ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشہ دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی

وہ چاہتا کیا ہے یہ بھی سن لیجئے اور پھر مجھے رخصت کی اجازت دیجئے ؎

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
امنگیں مری آرزوئیں مری — اُمیدیں مری جستجوئیں مری
مرے قافلہ میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

(باجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

"مورّخ کا گناہ"

جناب احسان دانش

دوپہر نزدیک، اور شہرِ خموشاں کی فضا
سو رہے ہیں اس جگہ وہ برق فطرت شعلہ خو
یہ سنہری کھیت خاکِ خستہ و خاموش پر
برج، مینارے، مساجد، مقبرے، احرام پاک
یہ مہذب جھاڑیاں سرو سمن کے بھیس میں
یہ ڈھلی ترشی سلاطین صورت تیغ و سناں
یہ نہروں کے راستے پر شور دریاؤں کے پل
یہ سرنگیں یہ پہاڑوں کی جگر افگاریاں

ذرہ ذرہ ہے جہاں کا فکر میں ڈوبا ہوا
ہے تمدن کی رگوں میں آج تک جن کا لہو
زرد پشمینہ سہاگن کیاریوں کے دوش پر
یہ سجی سنوری چٹانیں، یہ بلند اقبال خاک
یہ ترقی یافتہ جنگل چمن کے بھیس میں
یہ پڑھی لکھی جہالت منطق و علم بیاں
یہ مشینیں، تربیت پائے ہوئے لوہے کا عمل
یہ کھلے میدان یہ مفتوح ناہمواریاں

سو رہے ہیں ان کے موجد سیکڑوں من خاک میں
غلغلے برپا ہیں لیکن گنبدِ افلاک میں

آہ اے اندھے مورّخ، اے سیہ باطن امیں!
دامنِ تاریخ میں دولت بھی ہے عشرت بھی ہے
سلطنت کے دور تاج و تخت کے حالات بھی
رعب و داب قیصری بھی برّشِ صمصام بھی

ہے تری غماز یہ شہرِ خموشاں کی زمیں
بھیس میں تدبیر کے تقدیر کی راحت بھی ہے
طیش کی گرمی بھی، انعامات کی برسات بھی
منصفی کی صبح بھی نامنصفی کی شام بھی

لیکن اے داغ وفا، جھوٹی حکومت کے چراغ!
کر دیے نیلام تو نے اپنے احساس و دماغ!
ہضم کب ہوگا وہ کھایا ہے جو حق تاریخ کا!
او ستمگر! ہر سیاہی تھا ورق تاریخ کا!

پوچھتا ہوں تجھ سے میں اے تاجرِ ظرف و ضمیر　　عدل کا دشمن ہے کیوں اے قعرِ ذلت کے اسیر

دل جو رکھتا ہے تو کیوں آخر لہو روتا نہیں
تذکرہ ان کا ترے خامہ سے کیوں ہوتا نہیں

ابتداء میں جو مآل زندگی کو پڑھ گئے　　حق کہا اور دار کے تختہ پہ ہنسکر چڑھ گئے
فرض انساں بزم انساں پر نمایاں کر دیا　　برچھیوں کے سامنے سینوں کو عریاں کر دیا
تذکروں میں اب وہ باقی ہیں نہ دنیا میں پتا　　بھربھری مٹی کی ان گونگی فصیلوں کے سوا
ہوگئی دیکر جو البیلی دلہن کے واسطے　　کٹ گئے اٹھتی جوانی میں وطن کے واسطے
چل بسے ماؤں کو مرقد کے کنارے چھوڑ کر　　دودھ پیتوں کو یتیمی کے سہارے چھوڑ کر
عمر سے پہلے جو باپوں کو بڑھاپا دے گئے　　دلہنوں کو آئینہ دیکر رنڈاپا دے گئے
وہ بجلے صف شکن وہ فاتحِ بدر و حنین　　وہ انیس و خالد و ضرار، شہدائے حسین علیہ
وہ سپاہی جن کی بل بڑھتی مہابھارت کی جنگ　　طیش کھائے گرگ، بپھرے شیر، دیوانے پلنگ
اب نہ پیدا کر سکیں گے حشر تک یہ ماہ و سال　　انکی جرأت کا نمونہ انکی صولت کی مثال

رات دن برسوں جو اس انداز سے لڑتے رہے
خون کے دریا میں رہ رہ کر بھنور پڑتے رہے

تو نے اس تاریخ کے پہلو پہ پردہ ڈال کر　　کر دیا مجبوریٔ انسان کو مجبور تر
کارنامے ان کے گر ہوتے نظر کے سامنے　　جھک نہ سکتا آدمی زنہار زر کے سامنے
خون سے مردوں کے اب وہ جوشِ مردانہ گیا　　نازِ فرعونی بڑھا لطف کریمانہ گیا
آدمی میں آدمیت کا کوئی پہلو نہیں　　عشق میں غیرت نہیں ہے حسن میں جادو نہیں
اب نہ وہ روحیں، نہ وہ کس بل نہ وہ جوہر نہ خوں　　سرد ہے روحِ شجاعت، گم ہے تقدیسِ جنوں
اب سرِ میداں اجل کو ٹوکنے والے کہاں؟　　بڑھ کے پیشانی پہ نیزے روکنے والے کہاں

شب بسر کرتا ہی اب لاشونگے انبار وں میں کون؟ ہنسکے گاتا ہی رجز تیغوں کی جھنکار وں میں کون!
اب وہ نبض آب و گل پہچاننے والے گئے مورچوں پر ڈٹ کے سینے تاننے والے گئے
خنجر و پیکاں سے چاک دل سئے جاتے نہیں صف شکن بازو جوانوں کو دئے جاتے نہیں
اس طرح کچھ بات بگڑی ہی کہ بن سکتی نہیں کوئی ماں اب سورما اولاد جن سکتی نہیں
آج ہی کس کو گوارا روح اور تن کا فراق کون اڑا سکتا ہی تنظیم حکومت کا مذاق

اب ضمیر و دلمیں خامی کے سوا کچھ بھی نہیں
روح میں ذوق غلامی کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک پل میں بھانپ لیتی ہی حکیمانہ نگاہ یہ کتابت کی خطا ہے یا مورّخ کا گناہ
راہزن تیرے سوا کون اس رہ روشن پہ ہی تو ہے خائن خونِ آزادی تری گردن پہ ہے
تیری اس خامی کو شاعر محو کر سکتا نہیں! زخم جب ناسور بن جاتا ہے بھر سکتا نہیں
ہے تری غیرت پہ داب خسروی چھایا ہوا شیر ہے گلیوں کی روباہوں سے تھرایا ہوا

کھا چکا ہے تو زر و گوہر کے جلوؤں سے شکست!
شاعرِ مزدور ہو سکتا نہیں دولت پرست!

اُردو کے ہندو شاعر

جناب عبدالقادر سروری

اُردو کو موجودہ حالت تک ترقی دینے میں، ہندو شاعروں اور ادیبوں کا کس قدر وسیع حصّہ رہا ہے، اس پر اگر حقایق، اور واقعات کی روشنی میں غور کیا جائے، تو ہمارے لئے یہ تصفیہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے، کہ کس فرقے نے اِس کی زیادہ خدمت کی؟ ہندوؤں نے یا مسلمانوں نے، انگریزوں نے یا پارسیوں نے؟۔ ممکن ہے کہ انگریزوں کی خدمات میں کوئی غرض شامل نظر آئے، لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی خدمات، خود اپنی ذات کے لئے تھیں۔ اسی لئے اُردو کی ترقی کے ہر دور میں، ان دونوں فرقوں کے اہل قلم دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ کسی خاص زمانے میں، ممکن ہے کسی فرقے کے لکھنے والوں کی تعداد کچھ کم یا زیادہ ہو جائے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی، ہندو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد مسلمانوں سے کچھ کم نہیں ہے۔

اس کی تفصیل بہت طویل ہو جائے گی۔ اس کا اندازہ یہ ہے کہ اگر ہم ہر دور کے اچھے لکھنے والوں کی صرف فہرست گنانے لگیں تو، اس کے لئے یہ تمام صفحات بھی ناکافی ہونگے۔ اور اگر ان کا ایک محض بیانیہ تذکرہ، جیسا کہ لالہ سری رام کا "خمخانہ جاوید" ہے، مرتب کرنا چاہیں، تو کئی سو صفحوں کی کئی جلدیں تیار ہو جائیں گی۔ اتنی وسیع خدمات، ہندو لکھنے والوں نے، اُردو زبان اور ادب کی انجام دی ہیں!

یہ تقریباً ہندوستان کے ہر ادبی مرکز تک پھیلے ہوئے ہیں، اور ہر دور پر حادی ہیں۔ لیکن ہندو شاعروں اور ادیبوں کے تذکرے مرتب کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی، کیونکہ اسکی ضرورت نہیں ہوئی، اور اب سے پہلے یہ کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ ورنہ کشمیر سے لے کر بنگلے تک اور حیدرآباد سے لے کر گجرات اور لاہور تک، ہر ادبی مرکز میں، اپنے اپنے موقع پر سینکڑوں

کی تعداد میں ہندو شاعر اور ادیب نشو و نما پاتے رہے ہیں۔ چنانچہ صرف ایک کشمیر کے ہندو شعرا کا تذکرہ، "بہار گلشن کشمیر" جو کچھ عرصہ پہلے، پنڈت جگموہن ناتھ، شوق کے اہتمام سے شائع ہوا ہے، اس میں سوا تین سو سے زیادہ شعرا کے حالات درج ہیں۔ اسی طرح کے کئی اور تذکرے بھی تیار ہو سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قدر وسیع موضوع پر اظہار خیال کرنے کے لئے، ایک مضمون کی گنجائش ناکافی ہے۔ اس لئے ایک سرسری تذکرہ اس وقت کیا جا سکتا ہے۔

اُردو کا قدیم ترین دور، شعر و سخن کا دور تھا، اس دور کے پنجابی، دکنی، گجراتی کارنامے کچھ کچھ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان میں مسلمان شعرا بھی ہیں، اور نو مسلم اور ہندو بھی۔ "بہار گلشن کشمیر" جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس میں ایک شاعر، پنڈت چندر بھان کا بھی تذکرہ موجود ہے، جو برہمن تخلص کرتے تھے اور شاہ جہاں کے عہد کے شاعر بتلائے جاتے ہیں۔ یہ اکبر آباد کے رہنے والے تھے، اور ایک معزز عہدہ پر مامور تھے۔ ان کے چند شعر یہ ہیں۔

خدا نے کس شہر اندر، ہمن کو لائے ڈالا ہے — نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے، نہ پیالا ہے

خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں — نہ دونا ہے، نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں — نہ تسبی ہے، نہ سمرن ہے، نہ کنٹھی ہے، نہ مالا ہے

دہلی میں جب اُردو شاعری کی تحریک شروع ہوئی تو یہاں کے اکثر فارسی گو شاعر اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہیں میں رائے انند رام مخلص، لالہ ٹیک چند بہار اور بندرابن راقم وغیرہ بھی تھے۔ یہ میر اور سودا کے معاصر تھے۔ میر نے اپنے تذکرے میں ان کا اور ایک اور شاعر بیخو کا حال لکھا ہے۔

رائے انند رام مخلص، فارسی کے عالم اور شاعر تھے۔ مرزا بیدل سے انہیں تلمذ حاصل تھا۔ اُردو میں یہ سراج الدین علی خان آرزو سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ لالہ ٹیک چند بہار کی فارسی تصانیف بڑی

قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ "بہارِ عجم" اس کی شاہد ہے۔ ایسا کارنامہ اس موضوع پر آج تک تیار نہ ہو سکا یہ بھی سراج الدین علی خاں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ میرؔ جیسا نقاد اُن کی اُردو شاعری کی تعریف کرتا ہے کہ وہ نہایت رنگین کلام شاعر تھے اور ایک ایک نقطے سے شعر میں معنی کے ہزار ہزار گل کھلاتے تھے۔ اُن کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وہی ایک ریسماں ہے، جس کو ہم تم تار کہتے ہیں　　کہیں تسبیح کا رشتہ، کہیں زنار کہتے ہیں

اگر جلوہ نہیں ہے کفر کا اسلام میں ظاہر　　سلیمانی کے خط کو دیکھ کیوں زنار کہتے ہیں

راقمؔ، میرؔ اور سوداؔ دونوں سے یاری باری سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ وہ "مخزن نکات" کے مصنف، قائمؔ کے دوست تھے۔ کلام نہایت شستہ اور پاکیزہ ہے۔ میرؔ نے ڈھائی صفحے کا وسیع انتخاب ان کے کلام کا دیا ہے۔ ایک دو شعر ملاحظہ ہوں۔ ان کا وہی انداز ہے، جو میرؔ اور دردؔ کا ہے۔

دل کنجِ قفس میں کر، فریاد بہت رویا　　ہنسنے کے تئیں گل کے، کر یاد بہت رویا

پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب　　یارب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے

علی حسین گردیزی نے اپنے تذکرے میں ایک اور شاعر، رسواؔ کا اضافہ کیا ہے، جو نوجوانی میں فوت کر گئے۔

میرؔ اور سوداؔ کے بعد کی نسل کے شاعروں کے متعلق تذکروں سے کافی مواد حاصل ہوتا ہے۔ یہ مصحفیؔ، انشاؔ، جراتؔ اور میر حسنؔ کا زمانہ ہے۔ اِس زمانے میں اور اِس کے بعد، لکھنؤ کے عروج کے زمانے کے سخن سنجوں میں، ہزار کے قریب ہندو شاعر مل سکیں گے۔

قائمؔ نے "مخزن نکات" میں نو شاعروں کے حالات لکھے ہیں۔ اُن میں بدھ سنگھ قلندرؔ، آفتاب رائے رسواؔ، لالہ نول رائے وفاؔ اور سکھ رام بیتابؔ، بلند پایہ شاعر تھے۔

میر حسنؔ نے اپنے تذکرے میں چار پانچ شاعروں کا اور اضافہ کیا ہے۔ جن میں لالہ رام نرائن اور لالہ بینی پرشاد ظریفؔ اساتذہ کا رتبہ رکھتے تھے۔ ان کے کئی شاگرد تھے اور ان کے مکان پر

مشاعرے ہوا کرتے جن میں تمام سربرآوردہ شعرا شریک ہوتے تھے۔ ظریف کے بھائی، حریف بھی اس فن میں ان سے کم نہ تھے، چنانچہ مصحفی نے اپنے تذکروں میں ان کے کمال کی خوب داد دی ہے اور چھ چھ صفحوں کا انتخاب کلام پیش کیا ہے۔ اسی حلقہ کے دوسرے شاعر جھنولال طرب ہیں، جو استاد مانے جاتے تھے۔

علی ابراہیم خاں خلیل نے اپنے تذکرہ "گلزار ابراہیم" میں لکھنؤ کے سترہ ہندو شعرا کا حال پیش کیا ہے جن میں سے رائے سرب سنگھ دیوانہ، لالہ خوشوقت رائے شاداب، گردھاری لال طرز، بھکاری داس عزیز، لالہ صاحب رائے فریاد، راجہ رام نرائن موزوں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ دیوانہ استادی کا مرتبہ رکھتے تھے، چنانچہ مرزا جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیران ان کے مشہور شاگرد ہیں۔ ان کے دو دیوان فارسی کے اور ایک اردو کا موجود ہے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

بزم میں رات بہت سادہ و پرفن تھے، ولے
گرمیٔ بزم کہاں اُس بت عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربت دیدار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے
کیونکہ دیوانہ بھلا رہئے اب اس یار بغیر

شاداب فارسی اور اردو کے اچھے شاعر ہونے کے علاوہ، فارسی کے مشہور انشاپرداز بھی تھے۔ عزیز خواجہ میر درد کے شاگرد تھے، اور بڑی خدمتوں پر مامور رہے۔ فریاد، میر سوز سے مشورہ کرتے تھے۔ راجہ رام نرائن، موزوں، بنگالہ کے حکمرانوں کی طرف سے عظیم آباد میں صوبہ دار تھے۔ اور شیخ علی حزیں سے شرف تلمذ رکھتے تھے مجروح کشمیر کے باشندے اور مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد تھے۔

لکھنؤ کے عروج کے زمانے کے شعرا کے حالات مصحفی کے تذکروں سے دستیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ "تذکرہ ہندی گویاں" میں دس اور "ریاض الفصحا" میں (۲۷) ہندو شعرا کے حالات لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے جو مشہور اور لکھنؤ کے اکثر اساتذۂ غزل کی ٹکر کے شاعر ہیں، وہ یہ ہیں رائے جسونت سنگھ پروانہ، شجاع الدولہ کے معتمد علیہ اور سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔

قصیدے میں وہ سوداکے دبستان کے مسلم الثبوت شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ کلام کی پختگی ملاحظہ ہو

کھا تیغ نگہ، جب ترے گھائل کو غش آیا　　گویا کہ دمِ نزع میں بسمل کو غش آیا

کیا کیجئے ہمدم کہ اُسے دیکھ کے ہم تو　　ہر چند سنبھالے رہے، پر دل کو غش آیا

کرتے تو کیا قتل، یہ خوں بہتے جو دیکھا　　ٹھہرا نہ گیا سامنے، قاتل کو غش آیا

بالمکند حضور دہلی کے رہنے والے تھے، بعد میں لکھنؤ آ گئے تھے۔ خواجہ میر درد سے تلمذ رکھتے تھے ان کی ذہانت کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ مشاعرہ میں میر درد کی غزل، طرح مقرر ہوئی تھی، جس کی ردیف "اور" یعنے طرف تھی۔ لکھنؤ کے سخن سنجوں کو یہ لفظ ناپسند تھا، اس لئے انہوں نے "اَور" باندھا۔ لیکن بالمکند حضور نے، جو غزل لکھی اُس میں اس کو دونوں طرح نباہ لیا تھا۔ غزل کا ایک شعر ہے۔

رکھتا ہوں، میر صاحب و قبلہ سے میں سند　　میں جانتا نہیں کہ زباں ہے کہاں کی اَور

دوسرے مشہور شعرا لالہ کانجی مل صبا فدوی لاہوری، مجنوں لاہوری، لالہ کنور سین مضطر، اور لالہ درگا پرشاد مضطرب ہیں صبا مصحفی کے بڑے دوست تھے، فدوی نے مثنوی یوسف زلیخا کو منظوم کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی مجنوں، میر تقی کے شاگرد اور مغلیہ دربار کے مشہور امیروں میں سے تھے۔ نادر میر حسن سے مشورہ لیا کرتے تھے، ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

قاصد تو اس بہانے سے اُس پاس جائیو　　کس کا یہ خط ہے، اس کو ذرا پڑھ سنائیو

ان کے علاوہ لالہ موتی لال انیس، کنور جی زخمی، گور بخش ادیب، پنڈت طالب اور پنڈت نصرت کشمیری، جیا لال گلشن، لالہ عوض رائے مسرت، لالہ موجی رام موجی اور لالہ موتی رام بھی پختہ مشق غزل گو کی حیثیت سے، بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پنڈت دیا شنکر نسیم، کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی مثنوی "گلزار نسیم" اُردو زبان کے ساتھ زندہ رہے گی۔

اس نہایت مختصر سے خاکے سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ۔ اُردو کی ترقی اور اس کی اشاعت

میں ان سینکڑوں شاعروں کی عمر بھر کی کوششوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ انکی وجہ سے شعر و سخن کا چرچا گھر گھر پہنچ گیا تھا۔

اُردو شاعری کے جدید دور میں ہندو سخن پردازوں کے نام اور بھی زیادہ درخشاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حالی اور آزاد کی کوششوں کو فروغ دینے میں اسمٰعیل اور اکبر کے ساتھ ساتھ سرور جہان آبادی اور چکبست کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ہندو شعرا میں سرور سب سے پہلے شاعر ہیں، جو جدید خیالات سے پوری طرح متاثر ہوئے۔ اردو شاعری میں ان کا خاص متروکہ، وہ نظمیں ہیں جو ہندو معاشرت، عقائد اور تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ کالیداس کی کئی نظموں کا بھی انہوں نے ترجمہ کیا تھا۔ انکی بعض نظمیں اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ اس طرح کی ایک نظم کے چند شعر سنئے،

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سو جا — کہ گذر گئی شب آدھی، دلِ بیقرار سو جا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی، یہ ہوا کے تیز جھونکے — تجھے دے رہے ہیں لوری دلِ بیقرار سو جا
یہ تیری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے — میرے پردہ دار سو جا مرے راز دار سو جا
نہ تڑپ زمین پہ ظالم، تجھے گود میں اٹھا لوں — تجھے سینے سے لگا لوں، کروں تجھ کو پیار سو جا

چکبست نو عمری میں فوت ہو گئے، لیکن ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔ وہ سرور سے متاثر تھے۔ اور ان کا انداز اپنا خاص تھا۔ قومی اور وطنی شاعری کے علاوہ ان کی "مہابھارت" کی نظمیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ میر انیس کی طرز میں لکھی گئی ہیں، اور بہت شہرت رکھتی ہیں۔

موجودہ زمانے میں ان شاعروں کی وسیع تعداد کا اندازہ کچھ تو اخباروں اور رسالوں سے ہو سکے گا جن میں رسالہ "زمانہ" سب سے پیش پیش ہے، اور کچھ کلام کے ان مجموعوں سے ہو سکے گا جو آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کثیر تعداد میں کئی ایسے ہیں جن کے کارنامے کبھی مٹ نہیں سکتے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، منشی مہاراج بہادر برق، منشی نوبت رائے نظر، منشی تلوک چند محروم، لالہ رگھوپتی سہائے فراق، لالہ جگت موہن لال رواں، لالہ سری رام، انند نرائن ملا، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، راجہ راجیشور راؤ اصغر

مہاراجہ بہادر، قدیم اور جدید دونوں طرز کی شاعری کی ہم آہنگی اور اعتدال کا نمونہ ہیں۔ شعر وسخن سے آپ کا شغف، ضرب المثل بن گیا ہے۔ آپ کی متصوفانہ اور پاکیزہ شاعری کے ساتھ ساتھ اُردو اور فارسی شعرا کی سرپرستیوں کے تذکرے بھی، عرصہ تک باقی رہیں گے۔ پنڈت کیفی، اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں اور تمام اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اُردو زبان اور شاعری کے فنی نکات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

منشی نوبت رائے نظر "زمانہ" اور "ادیب" کی ادارت کے سلسلہ میں کافی شہرت رکھتے ہیں اور تلوک چند محروم، اپنی طباع ذہنیت کے سبب، موجودہ اُردو شاعروں میں امتیاز پیدا کر چکے ہیں۔ جگت موہن لال رواں صاحب دیوان ہیں، اور غزل اور رباعی میں، اساتذہ کا رتبہ رکھتے ہیں۔ انند نرائن ملا کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کا کارنامہ "بہارِ گلشنِ کشمیر" بھی زندہ رہے گا۔ فراق کا ذوق اور ان کی کوششیں، بہر وجہ مستحسن ہیں۔ ان کے چند شعر یہ ہیں، اور انہیں پر یہ تذکرہ ختم کیا جاتا ہے۔

اہلِ دل جس کو تری برق نظر کہتے ہیں	ہاں وہ اندازِ فنا عشق کو آیا بھی کہاں
تذکرہ اس نگہِ مست کا دل والوں میں!	دوستو! چھیڑ دیا تم نے یہ قصہ بھی کہاں
میں یہ کہتا ہوں کہ افلاک سے آگے ہوں بہت	عشق کہتا ہے، ابھی دردِ دل اٹھا بھی کہاں
ہم نے مانا کہ غمِ ہجر بھی دھوکا ہے، فراق	اور اگر غور کریں دل میں تو دھوکا بھی کہاں؟

ظاہر ہے کہ اس مختصر سے مضمون سے نہ اُردو کے ہندو شعرا کی عظیم الشان خدمات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور نہ ایک ایک جملے سے بڑے بڑے شاعروں کی اصلی عظمت بے نقاب کی جا سکتی ہے۔ بہر حال یہ ایک تمہید ہے۔ اس موضوع پر تذکرے کی طرح کا نہیں بلکہ تنقیدی طرز کا بہت کام ہو سکتا ہے۔

غزل

جناب معین احسن جذبی (علیگ)

مشعل تھے جو بحرِ ظلمت میں وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے
اور لطف یہ ہے اے طوفانو! کشتی کے بھی لنگر ٹوٹ گئے

اک یاس بھرے دل پر نہ ہوئی تاثیر تمہاری نظروں کی
اک موم کے بیس ٹکڑے پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے

کیا ماتم اُن اُمیدوں کا جو آتے ہی دل میں خاک ہوئیں
کیا روئے فلک اُن تاروں پر دم بھر جو چمک کر ٹوٹ گئے

یا اشکوں کا رونا تھا مجھے یا اکثر روتا رہتا ہوں
یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا یا لاکھوں گوہر ٹوٹ گئے

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

یہ عرشِ محبت ہے میرا اے طائرِ سدرہ ہوش میں آ
اس لاحاصل سی کوشش میں تخئیل کے شہپر ٹوٹ گئے

تو اور غمِ الفت جذبی، مجکو تو یقین آئے نہ کبھی
جس قلب پہ ٹوٹے ہوں پتھر اُس قلب میں نشتر ٹوٹ گئے!!

محمد قلی قطب شاہ اور شب برات کی اردو نظمیں

جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

یہ ان موضوعوں میں سے ہے جن پر محمد قلی قطب شاہ نے دل کھول کر اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی ہے۔ چنانچہ اس کے کلیات میں اس کے متعلق دس نہایت دلچسپ اور اہم اردو نظمیں موجود ہیں۔ محمد قلی کو پانی اور سبزہ کی طرح روشنی سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ ہر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جس میں اُسے جشن چراغاں سے لطف اندوزی نصیب ہو سکتی تھی اور شب برات میں تو وہ جی کھول کر چراغوں۔ آتشبازیوں اور شاہانہ رنگ رلیوں میں منہمک ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے کہ

جہاں شب برات آئی کہ خوشی وخرمی کی روشنی تمام دنیا میں پھیل گئی۔ یسا معلوم ہوتا ہے کہ شب برات اپنے ساتھ خوشیوں اور عشرتوں کی ایسی براتیں لیکر آتی ہے کہ اُسکی روشنی سے تمام عالم جگمگانے لگتا ہے۔ چونکہ محمد قلی پر ائمہ معصومین کی نظر عنایت ہے۔ اس لئے وہ نبیؐ اور علیؓ کے کرم کی وجہ سے پھلتا پھولتا رہتا ہے اور خود عیش وعشرت اس کی بارگاہ میں خوشی کے مارے ٹمٹیاں بجانے لگتے ہیں۔ اسی وجہ سے خدا قطب شاہ کو شاہنشاہی کا رتبہ دیکر اسکی رُوائی یا اس کی آقائی کا اعلان تمام کائنات میں پھراتا ہے۔ اور اسکے دشمنوں کو دنیا سے نیست و نابود کر کے مفقود کر دیتا ہے۔

دوسری نظم میں لکھتا ہے کہ

شب برات کی وجہ سے تمام راتوں کو شرف حاصل ہوا اور سب راتوں میں شب براتہی کو شرف حاصل ہے۔ کثرتِ چراغان کی وجہ سے رات ایسی منور ہو گئی کہ معلوم ہوتا ہے بغیر سورج طلوع ہوئے دن نکل آیا ہے۔ زمین کے ان چراغوں کا عکس جب آسمان پر پڑا تو وہ بھی آئینہ کی طرح جھلکنے لگا۔ آتشبازی اور چراغوں کی وجہ سے دنیا ایسی روشن ہو جاتی ہے کہ اس اجالے کو دیکھکر آفتاب

شرما گیا اور اسی شرم کے مارے رات کو کبھی اپنا منہ نہیں دکھاتا۔

شب برات میں جو مہتاب چھوڑے جاتے ہیں انکی تابانی ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ظلمات میں آبِ خضر۔ گلشن میں جب پھولبازیاں چھوڑی جاتی ہیں تو زمین پر سورج، چاند اور تارے اتر آتے ہیں اور انکی روشنی کی جھلک آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔ خدائے تعالےٰ نے قطب شاہ کو ایسی تجلی بخشی کہ اس نے رات کو دن سے زیادہ روشن کرکے چمکا دیا۔

ری نظم میں کہتا ہے کہ

شب برات کی مبارک رات اپنے ساتھ اپنے روزی خواروں یا ملازموں یعنی خوشی، عیش آنند اور عشرت کو براتی بنا کرلے آتی ہے۔

محمدؐ نے جنگ احد میں علیؓ کو ساتھ لے کر کامیابی حاصل کی کیونکہ ان کی تلوار کے چمکنے سے تاریکی کی فوجیں بھاگ گئیں۔

اس رات میں معشوقوں کے دہن پستے۔ آنکھیں شکر کی طرح شیریں۔ اور ہونٹ گھرمول کی مصری کی طرح نازک نظر آتے ہیں! اور اُن کے چہرہ پر پسینہ کی بوندیں خشخش کی طرح باریک نظر آتی ہیں۔

سہیلیوں کی کاجل لگی ہوئی آنکھیں سیاہ باداموں کی طرح، ٹھوڑی سیب کی طرح، اور دانت چارولیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

اسی طرح پوری نظم میں سہیلیونکے حسن اور لباس کی تعریف کی ہے۔ انکا آتشبازی چھوڑنا اور اسکی ـسے انکے جسم پر زیوروں کا جگمگا اٹھنا نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

چوتھی نظم کا تذکرہ بھاگ متی کے ذکر میں کیا جا چکا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب ـت کی تقریب میں دربار اور ڈیوڑھی کی خاص خاص طوائفیں بڑے اہتمام کے ساتھ سج دھج ـلے اور شاہی طمطراق کے ساتھ اپنے اپنے مکانوں سے آتی تھیں۔ بھاگ متی کی نسبت تاریخوں لکھا ہے کہ جب وہ دربار کو آتی تو اس کے ایک ہزار سوار اس کے جلو میں رہتے۔ جب اُس کی ـلی آمد اس شان سے ہوتی تھی تو شب برات کی تقریب میں وہ جو کچھ اہتمام کرتی کم تھا۔ اسی لئے ـناہ نے اس موضوع پر ایک خاص نظم لکھدی ہے جس میں اس امر پر زور دیا ہے کہ

وہ اپنے ساتھ آسمان کے مہر و ماہ سے زیادہ روشنی رکھنے والے لاکھوں چاند سورج لاتی ہو۔ کیا تعجب کہ زمین آسمان پر لاف زنی کرنے لگے کیونکہ وہ زمین کو صاف و شفاف آسمان کی طرح جھلکا دیتی ہے۔

پانچویں نظم میں محمد قلی لکھتا ہے کہ

شب برات پھر سے مبارک سلامت کی خبرے کر آئی ہے کیونکہ اس رات میرے بخت کا طالع سورج کی طرح جھلکنے لگتا ہے۔

میری سکھی کے چہرہ کی روشنی کے سامنے اس عید کا اجالا شرمانے لگتا ہے۔ اس عید میں سکھ اور آنند کا نور از سر نو ہر چہار کی طرح چھا جاتا ہے۔ دنیا دلہن بن کر آنند کرنے والی دوشیزاؤں کے ہاتھ سے مئے عشرت پلواتی ہے اور زہرہ الحان کے ساتھ بادشاہ کے نئے نغمہ گانے لگتی ہے۔

شب برات کے عیش کی آمد نے اپنے حسن کی ایسی جھلکاریں دکھائیں کہ دنیا کے دل میں پھر سے زندگی کا نور پیدا ہونے لگا۔ شاہ کی سب پیاریاں عید کا سنگار کرتی ہیں تاکہ بادشاہ کو ایک کا سنگار دوسرے سے زیادہ پسند آئے۔

آنند کے بھیدوں اور جادوؤں کی وجہ سے پیاری (ایک خاص سہیلی) میرے دل میں کھیلنے لگتی ہے کیونکہ وہ اپنے جوبن کے چمن میں خوشبو مہکا لیتی ہے۔

نبیؐ کے صدقے میں قطب شاہ کو ہمیشہ لاکھوں عیدیں دیکھنی نصیب ہوں کیونکہ عیسٰیؑ کی دعا اس کے لئے گل مسرت کی خوشبو لے آئی ہے۔

چھٹی نظم میں بادشاہ نے اپنی سہیلی پیاری کے آتش بازی کھیلنے کا ذکر کیا ہے اس سلسلہ میں شب برات کی آتش بازیوں کے بہت سے نام بھی ہمارے لئے محفوظ کر دیئے ہیں کہتا ہے۔

شب برات نے کوہ طور کے نور کو اب تمام عالم میں پھیلا دیا ہے اور خضر نے اپنے ہاتھ سے مجھ کو آبحیات پلایا۔

شب برات اپنے ساتھ ساتھ خوشی کی براتیں لے آئی ہے اور قطب شاہ ان براتوں کو لے کر رات اور دن آنند کے ساتھ گذارتا ہے۔ پیاری کا سرو قد ہوائی کی طرح (بلندی کی طرف مائل) اور اس کے ناک کی پھلڑی پھلبازی کی طرح ہے۔ پیشانی پر مہتاب کی طرح ٹیکہ لگائے ہے۔ اور ہونٹوں پر سورج جیسی چمک دمک نظر آتی ہے۔

اس کے رات جیسے سیاہ بالوں میں کیوڑا بھنورے کی طرح نظر آتا ہے ناؤں اور پٹاخوں کی آوازوں سے آسمان کے اندر میں خلل پڑتا ہے۔ اس کی چوٹی کا پھندنا طاؤس کی طرح ناچ رہا ہے۔ ہوائی کو اپنا حاجب بنا کر وہ اپنی درائی (مالکی) کا اعلان کرتی ہے۔

اس کے بالوں کے جوڑے میں پھولوں کی جو لڑیاں ہیں وہ ٹوکریوں کے جھیلنے کی طرح ہیں۔

اے قطب شاہ تجھ کو نبیؐ کے صدقے میں بڑی اچھی پیاری ملی ہے۔

ساتویں نظم کی ردیف ہی لفظ روشن ہے جس کی وجہ سے تمام نظم شب برات کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس عید سے قبل بادشاہ کو کسی جنگ میں کامیابی نصیب ہوئی تھی جس کی طرف مقطع میں اشارہ کرتا ہے۔

دشمنوں کے سینے پھانکوں کی طرح کیوں نہ پھوٹیں اور تڑخیں جب کہ خدا نے قطب شاہ کو ایک روشن فتح اور کامرانی عطا کی ہے۔

آٹھویں نظم طویل ہے اور اس موضوع کی اچھی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اسمیں محمد قلی لکھتا ہے کہ:

شب برات نے آکر تمام عالم اس طرح روشن کر دیا ہے جس طرح نور موسوی کی وجہ سے وادی ایمن روشن ہو گئی تھی۔

آپ رخسار کی جھلکیں دکھا کر عاشقوں کی آنکھوں کو ایک نور سے معمور گلشن بنا دیا ہے
چونکہ اس رات کو زلف خوباں کے ساتھ نسبت ہے اس لئے جس طرح معشوقوں کے
جسم پر زیبائش و آرائش کی وجہ سے نور جھلکنے لگتا ہے۔ اسی طرح اس رات کو
بھی نورانی لباس زیب دیتا ہے۔ اس عید کی لطف اندوزی کی ہوس کا دنیا کو خبط ہے
کیونکہ اس میں محبت کی ہواؤں کے جھونکے تن اور من کو شگفتہ کر دیتے ہیں۔

نبیؐ کے صدقے میں اے قطب شاہ تو آٹھ سال خوش و خرم زندہ رہ کیونکہ تیری
ہی وجہ سے اس عید میں شمع عیش روشن رہتی ہے۔

محمد قلی کی شب برات سے متعلق نویں نظم شاعرانہ کمال کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ نظم
نہایت مرصع ہے اور اس میں ایسی اعلیٰ پائے کی تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں کہ اس کو
اردو شاعری کے شہ پاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ نثر میں اس کی تمام خوبیوں
کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم قوت تخیل کا کچھ نہ کچھ پتہ چل سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

میری ماہ رویوں نے اپنے چہروں کی روشنی سے شب برات کو روشن کر دیا ہے۔
ان میں سے کوئی سورج نظر آتی ہے۔ کوئی چاند اور کوئی تارہ۔

ہر طرف سے ایک نازنین نور تن کا لباس پہن کر آئی ہے تاکہ بادشاہ کے ساتھ
چمن میں نکلے۔ شراب عشق پینے سے ان کے جسم جھلکنے لگے ہیں۔ وہ اپنے نوجوان چہروں
کے آب و رنگ، اور آفتاب جیسی جھلک سے مہتاب کو بے تاب بنا کر پگلا رہی ہیں۔

نازنین اس انداز سے محو خرام ہے کہ زلفوں کے لہرانے کی وجہ سے خوشبو آسمان
تک پہونچی ہے اور آسمان جھک گیا ہے۔ جس کی وجہ سے فرشتے فریفتہ ہو کر لاکھوں کی
تعداد میں اتر آئے ہیں۔

ایک سے ایک کے پستان زیادہ خوبصورت ہیں جن پر سیاہ بالوں کی لٹیں
ایسی نظر آتی ہیں جیسے پہاڑیوں پر کالے کالے بادل چڑھائی کرنے آئے ہوں۔

نازنین کے رخسار مہتاب اور پھولوں کے ہار۔ پھول جھڑیاں نظر آتے ہیں۔ اسکے دونوں ہو حاجبون کی طرح ایک دوسرے پر حملہ کر رہے ہیں۔

علی جیو کے یہاں سے یہ حکم لے آئے ہیں کہ یہ جہاں امن و امان کے ساتھ ہمیشہ قطب زماں کے حکم کے تلے رہے۔

شب برات کی نظموں کے سلسلے میں آخری نظم آتش بازی کی بہت سی اصطلاحوں کی آئنہ دار ہے اور عجیب بات ہے کہ ان میں سے اکثر اصطلاحیں اب بھی رائج ہیں۔ اس نظم کے چند شعر ذیل میں درج ہیں جن میں اصطلاحوں کے نیچے خط کھینچا گیا ہے۔

ہوایاں سو کے بنگر یاں چکراں جوں گھڑیاں بازیاں سو اپ جوبن کری رے
نین مستی کے گلریزاں سو بھر کر نلی طاؤس چک پھومن کری رے
پھلی ناسک جھمکنے تے ہے شب رات دھرت کون آج نس جوں گھن کری رے
لڑیاں موتیاں کیاں تج ہنسنے کیاں جھیلاں
تو جھیلاں تھے جگت دریَن کری رے

غزل

جناب رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

دل کے عناصر کا ہے یہ عالم — یکجا یکجا برہم برہم
دیکھ محبت کا یہ عالم — ساز بھی کم کم سوز بھی کم کم

اور تو کس کے لئے ہیں دو عالم — اپنے کو تو کر لے فراہم
ظلمت و نور کی موج ہے کوئی — بل کھایا قد گیسوئے پرخم

عشق کا حاصل یہ کیا کم ہے — کچھ غم کو غم کچھ مجھ کو غم
شورش عالم ساکت ساکت — دل کی صدا بھی مدھم مدھم

آہ محبت کی مایوسی — نرگس رعنا پرنم پرنم
عالم عالم عشق بھی تنہا — تنہا حسن بھی عالم عالم

قصۂ عشق یہی ہے کہ کوئی — دے بھی گیا دم کر بھی گیا رم
عشق کو پایا حسن کو دیکھا — دنیا دنیا عالم عالم

رنگ ہی کسکا روپ ہی کسکا — نکھرا نکھرا، مبہم مبہم
کم کم یوں تو ہے شورش پنہاں — ملتی چلی ہے بنائے دو عالم

عشق کی آنچ تری ہی کسر تھی — اب اکسیر ہے خاک آدم
اف تیری ہشیاری۔ لیکن — غافل بھی ہو گا تجھسا کم

دل کی جراحت اسکی محبت — ایسا زخم نہ ایسا مرہم
آتی بہاریں جاتی بہاریں — دونوں کا حاصل دیدۂ پرنم

سازِ محبت نغمۂ جنت — سوزِ محبت نارِ جہنم
عشق کے درد کو پوچھ رہے ہو — وہ تو نہ ہے کم وہ تو نہ تھا کم

یاد ہیں ان آنکھوں کے وہ دن — مستی کم کم وحشت کم کم

آج فراقؔ کو غور سے دیکھا
سوزِ مکمل دردِ مجسم

علی گڑھ تب!

جناب ڈاکٹر اختر امام۔ ایم۔ اے (علیگ)
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (بون)

گذشتہ موسم بہار کا ذکر ہے، دریائے رہائن کے کنارے ایک بنچ پر بیٹھا ہوا کانفے، رقص گاہوں اور تمام عشرت گاہوں کا نظارا کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک تو مقامی حالات کے اثرات اور دوسرے "ہجوم میں تنہائی" کے سبب میں کچھ کھو سا گیا تھا۔ گرد و پیش کی تمام چیزیں دھندلی ہوتی چلی گئیں اور چند لمحوں کے لئے علی گڑھ کے بھولے ہوئے افسانے نمایاں ہونے لگے، میں نے دل میں کہا غالب کے شعر میں ترمیم کی ضرورت پیش ہوگئی۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اے کاش اگر مرزا نوشہ "کلکتے" کے بجائے "علی گڑھ" لکھدئے ہوتے، پھر سوچا یار علی گڑھ کی تو کوئی تک نہ ہوئی اس وقت تو علی گڑھ کا خمیر بھی نہیں تیار ہوا تھا، بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو، میں علی گڑھ کو چپکانے کی کوشش کرنے لگا، لاکھ سر مارا مگر کام کی بات کوئی نہ نکلی، اس وقت اختر اور مجاز یاد آئے اپنے ان دونوں دوستوں کی شاعری ترنم، مذاق، پھبتیاں اور تمت بالخیر یہ کہ الکشن کے ہنگاموں کے بعد "جنازہ" کا مرثیہ "اے ہائے الکشن" یاد آیا۔

تیز ہوا جو چلی تو تخیل اور بہکا، طبیعت میں وارفتگی محسوس ہوئی۔ اور سر کے بال جو الجھنے لگے تو اختر کے برزخ میں آکر کچھ کہنے کو جی چاہا، اب اپنی کم علمی کا احساس ہوا اور اسی قنوطیت نے "بارگاہِ شعر" کی بھری محفل سے اٹھا دیا سوچنے لگا، دن کو دیر نہیں لگتی، علی گڑھ کی طالب علمانہ زندگی ختم ہوگئی اور بارہ سال اس طرح گذر گئے جیسے میر انیس ارشاد فرمارہے ہیں۔

"ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا"

جس طرح ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت بندرگاہ، رنگارنگ ساڑیاں، تاج محل ہوٹل دھندلے پڑنا شروع ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ سارا بمبئی ابھرنے لگتا ہے۔ اور اسکے بعد ہندوستان کا یہ دلکش شہر چھوٹا ہوتے ہوتے خود بحر عرب کی موجوں میں ڈوب جاتا ہے اسی طرح یوں سمجھئے کہ میں رعنائیوں کی لہروں میں ہر آن ڈوبتا چلا جا رہا تھا! ہندوستانی سرزمین کی جو چیزیں میرے سامنے تھیں وہ ہولی، پان، حقہ، سہرا، چنا جور گرم اور سایوں سے چھڑ چھاڑ اور علی گڑھ سے متعلق، جامع مسجد گھنٹہ گھر کتنے کی تربھیا پارٹی یونین میں میرے حکم کا نکتہ جناب! "مولانا ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے کہ آپ تشریف لائے ہیں ابھی تو ڈائننگ ہال کی روٹیاں بھی ہضم نہیں ہوئی ہوں گی" "گینڈے" "بریگیڈیر" "ڈنلپ" "خاموش خاموش ممتاز فیرنی زالا" جگر طلبا کے خوابچے "بوٹ پالیس صاحب" وغیرہ۔

کالج کھلنے کے بعد "بھیا پارٹی" کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ پریسڈنٹ کے متعلق خیال آرائیاں ہونے لگی۔ چندہ جمع ہوا، جونیر طلبا بنائے گئے اور اس فصل کے بعد پارٹیاں ہوئیں یاروں نے دلچسپ تقریریں کیں "پریسڈنٹ صاحب" کی حماقتوں پر تبصرے ہوئے اور ایک سنیر صاحب کی تجویز پر "پریسڈنٹ صاحب" کی صحت کا جام پیا گیا، اور لگے ہاتھوں گلاس کے بچے ہوئے قطروں سے آپ کے چہرہ مبارک پر گلاب پاشی بھی ہوئی، سوئمنگ باتھ کے ریستوران میں فلک شگاف قہقہے بلند ہوئے، موزوں بانا موزوں شعر پڑھے گئے خوب واہ واہ ہوئی اور "یہ شاندار جلسہ بہ تمام کامیابی ختم ہوا"

سنہ ۱۹۳۱ء کا ذکر ہے راقم نے "گرینڈیر" کے عنوان سے انٹرمیجیٹ کالج میگزین میں ایک مضمون لکھا، اس میں میرے یار نے تمام "گرینڈیوں" کو مع ان کے خطابات کے جو طلبا سے عطا ہوتے تھے، چند دلچسپ اشاروں کے ساتھ بیان کئے تھے۔ اے لیجئے مضمون کتنا غضب ہوگیا، سینیر تو خیر سینیر، جونیر حضرات بھی سینیر پن کے دھوکے میں اعتراضات

کرنے لگے، مگر ہمت کسی صاحب کی نہیں ہوئی کہ "ادیب" کو چھیڑا جائے۔ "اُدھا" "اسٹینڈرڈ" "فلٹر" "گیورا" اور "بریگیڈیر" سے جب کبھی ملاقات ہوئی تو چھینٹے ہی نظر آئے۔ میں تو ڈر گیا کہ خدا خیر کرے، لیکن الکشن کی آمد ہر سو پکار اٹھی۔

"نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی"

الکشن شروع ہوا، دماغ میں اچھوتا پن پیدا ہو گیا، پرانے الکشن باز جن کا لوہا ہم سب مانتے تھے۔ میدان میں کچھ اس شان سے وارد ہوئے جیسے

"من و گُرز و میدان و افراسیاب"

پارٹیاں دی جا رہی تھی، اور ہر امیدوار کے اوصاف حمیدہ کچھ اس زور و شور سے بیان کئے جا رہے تھے جیسے امریکہ کی صدارت کے لئے دنیا میں اگر کوئی موزوں ہے تو بس یہی ہمارا کینڈیڈیٹ، پکر بازی اور چیخ پکار میں "پرانے والے" سے ملاقات ہوئی کہنے لگے اختراب خیر مناؤ، سنا نہیں؟ میں نے کہا کیا مخالف پارٹی نے (Anti-work) شروع کر دیا۔ بولے نہیں یہ ہوتا تو کیا تھا، سید علی دوسری پارٹی سے مل گئے ہیں سید علی کا نام سنتے ہی ہوش بجا نہیں رہے، وہ الکشن لڑانے والوں کا بادشاہ ہے ظالم کو وہ وہ سوجھتی ہے کہ بس لائیڈ جارج سے کچھ ہی کم سمجھئے۔ الکشن اپنی تمام مد و جزر کے بعد ختم ہوا تو اس شان سے کہ مختلف اُمیدواروں کی کشتیاں تہِ گردابِ فنا جا پہنچی اور کامیاب نمائندوں کی خوش قسمتی پر۔

"شورِ تحسین" وہ فانی لب "یونین" سے اٹھا

یہاں پر ایک بات عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اوپر کے مصرع میں "یونین" بھی بیٹھتا نہیں ہے، یہ بھی اتفاق دیکھئے کہ "علی گڑھ" اور "یونین" دونوں کھینچ تان کے بعد بھی چپک نہ سکے، خیر یونہی سہی، امید ہے کہ "شاعری کا مکمل سٹ" خریدنے کے بعد ان دشواریوں کو عبور کر جاؤں گا۔

بھائی عصمت مجھ سے جونیر تھے مگر سینیر بننے کا شوق رکھتے تھے، ایک دن اختر کے ہاں جو ملنے گیا تو آپ کو دیکھا کہ اردو شاعری پر تنقید فرما رہے ہیں، میں نے کہا افسوس کہ علی گڑھ سے سینیر اٹھتے جاتے ہیں، اب وہ سینیر کہاں جو بے جھنیپ ہوں، مسعود ٹامی کی داستان ہی داستان باقی رہ گئی ہے، اختر بھی سینیروں کے کارنامے بیان کرتے جاتے تھے۔ بھائی عصمت سے کہاں ضبط ہوتا کہ ان کو لوگ سینیر سے کمتر سمجھنے کہنے لگے صاحب یہ تو کہنے کی باتیں ہیں، سینیر اب بھی ہیں مگر ان جواہر کو پرکھنے والا کوئی نہیں، اس پر میں نے کہا، یار سینیر تو وہ جو بے جھنیپ کے اشارہ پاتے ہی ناچنے لگے، بھائی عصمت سے نہ رہا گیا آپ جھٹ کھڑے ہو گئے اور ناک پر انگلی رکھ کر۔

بریلی کے بجار میں جھمکا گرا رے . . .

کے ساتھ تھرکنے لگے اس وقت ہم لوگوں کی جو حالت ہوئی نہ پوچھئے، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منٹو اے کا کمرا قہقہوں سے "اڑا جاتا ہے منزل کو" کمرے میں جتنے لوگ تھے ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور بھائی عصمت پر جو گذری سو گذری۔

جس طرح وسطی یورپ میں ہندوستان کا نام آتے ہی اہل فرنگ کے سامنے ہمالیہ، مقدس گنگا کی لہروں پر کنول کے پھول، گاندھی، سادھو، سینیرے، ٹیگور، تاج محل اور فقیر دیپ گھومنے لگتے ہیں اسی طرح دریائے رھائن کی سرسبز و شاداب وادیوں میں "علی گڑھ" "سنتے" یا خیال آتے ہی، ملّا کی دکان، نمائش، اسٹیشن، میرس روڈ، تانگا ہوٹل جھلکنے لگتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغرب سنی سنائی باتوں پر خیال آرائیاں کرتا ہے اور میں آنکھ دیکھی باتوں پر اس لئے ظاہر ہے کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔

تو سنئے، فروری کا مہینہ تھا۔ میں انٹرمیجیٹ سے نکل کر یونیورسٹی میں قدم رکھ چکا تھا۔ نمائش اپنی تمام رنگینیوں، پراٹھوں، "شلغم کا آچار" "ہر مال یہاں ہے چھ آنے" اور کچھ رات گئے مرزا نوشہ کا متحرک مصرعہ ذرا ترمیم کے ساتھ۔

"شعلۂ حسن سبہ پوش ہوا میرے بعد کے ساتھ جلوہ گر تھی مجازؔ سے علیک سلیک ہوئی تو دیکھا کہ آپ کچھ کھوئے کھوئے نظر آرہے ہیں کہنے لگے ۔ اختر کچھ نہ پوچھو' یاد ہے تم کو وہ شعر؟ میں نے دیکھا کہ میرا شاعر کہیں اور ہے تو مجھکو بھی شرارت سوجھی کہا' یار یاد تو ہے مگر بھول گیا ہوں' دوسرے دن مجازؔ نے نمائش والی نظم مجھکو سنائی ۔

نظم کیا تھی مشرقی رنگ کی عطر آگیں" شان زرے لی ژے" سمجھئے شاعرانہ توصیف کے لئے تو آب حیات' کاشف الحقائق اور شعرا الهند کی اوراق گردانی کئے بغیر موزوں الفاظ مثلاً نیکھا پن' تیور معاملہ بندی اور بکر شاعرانہ ۔ مل نہیں سکتے' سیدھے سادے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وائنا' بوڈاپسٹ' پیرس اور برلن کی پر کیف صحبتوں میں اصنام "نمائش" جلوہ گر ہیں۔ میں اکثر سوچتا تھا اگر مجازؔ میرے ساتھ ہوتے تو اقبال سے روٹھ جاتے ۔

"یہ حوریانِ فرنگی دل ونظر کا حجاب"

نمائش کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے' "آل انڈیا ڈیبیٹ" کی تیاریاں بڑے زور وشور سے ہو رہی تھیں' ایک دن شام کے وقت میرس روڈ پر[1] ادھا "سے ملاقات ہوئی دیکھا کہ آپ" کوڈک" لٹکائے خراماں چلے آرہے ہیں' میں نے کہا کہاں جارہے ہو "آجکل" ہنومان" سے بنتی ہے یا نہیں' بولے یار ہٹاؤ بھی ان باتوں کو میں تو ڈیبیٹ کے مضمون میں الجھا ہوا ہوں' مجوز میں ہی ہوں' مقابلہ ہے با چھو سے! تم تو جانتے ہی ہو کیسا بے پناہ بولنے والا ہے۔ اس کے بعد" انعامی مباحثہ" کا فکر ہے' میں نے کہا یار تم آگئے' دیکھو رہے گی آگرے کی سیر' ان سے وعدہ وعید کے بعد" جب بات پکی ہو گئی" تو ہم دونوں آنے والے

---

[1] پیرس کی سب سے پُر فضا اور رنگین سڑک ۔

الکشن پر غور و فکر کرنے لگے" "ادھے" نے کہا یار انٹرمیجیٹ کا الکشن کچھ اور تھا یہاں کا نقشہ کچھ اور ہے دیکھو کس کو کھڑا کر رہے ہو؛ باتیں ہوتی رہیں اور ہم لوگ گرد اور دھوپ کھاتے ہوئے بورڈنگ پہونچے۔ تاریخ مقررہ پر ڈیبیٹ شروع ہوئی' ایک بیرونی مقرر صاحب' جو صورتاً مقرر سے زیادہ گھوڑوں کے جاکی معلوم ہوتے تھے' جیوں ہی انجمن آرا ہوئے' پھبتیوں' اور "آپ کی تعریف؟" کا سیلاب امڈا اور آپ کو بہالے گیا' آپکی صورت یاد ہے' اگر شاعر یا چغتائی ہوتا تو بس آپ اُن کو دیکھ کر غالب کو خوب سمجھتے!
"اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے"۔

بیچارے مقرر جو ذرا نروس ہوئے تو جناب صدر نے دلاسا دینے کی خاطر "خاموش" "خاموش" گرجتی آواز میں حکم دیا اس کے بعد مقرر صاحب سے مخاطب ہوکر بولے آگے بڑھئے" (go on) اس پر ایک منچلے نے گیلری میں منھ چھپا کر زور سے کہا "سو گز" (Hundred Yard) پھر قہقہوں سے یونین ہال گونج اٹھا' مقرر صاحب کو اب غصہ آگیا آپ نے اپنے گھونسوں سے یونین کے (Stand) کی خاطر تواضع شروع کردی' اور آواز میں تحکم کا رنگ پیدا کیا' اس پر مجمع کی پچھلی نشست سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور اپنی عقیدت کی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ جناب صدر کے ذریعہ مقرر سے مخاطب ہوئے "مولانا مجھ کو ڈر ہے کہیں آپ (Stand) کو توڑ نہ ڈالیں" ——— پھر وہی قہقہے! اسپیکر صاحب جو کچھ رٹ رٹا کر آئے تھے اس بدحواسی میں بھول گئے۔ اس کے بعد انھوں نے پھر اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے مطلع فرمایا:۔

"ہندوستان ایک بڑا شہر ہے.....!"

احمد علی کا الکشن لڑایا جا رہا تھا' اختر سی ہال کو کنٹرول کر رہے تھے اور میں "کجی بارک" میں ووٹروں کو پٹا کر رہا تھا' میں نے جب "بھیا پہاڑی" جن کے متعلق "جلسہ نام زدگی" (Nomination Meeting) میں خاکسار نے آپ کا نام گرامی نائب صدر کے لئے تجویز

کرتے وقت عرض کیا تھا۔

"یحیٰ بارک کی جان ہے پیارے
سرحدی اک پٹھان ہے پیارے"

سے کہا کہ یار اب بھی سیریس ہو جا، مگر میرا المبو دوست گول ہو گیا۔ "بھیتا پارٹی" کو کلون (Cologne) میں جب وہ شعر سنایا تو محبت بھرے انداز میں علی گڑھ اور اس کے خصوصیتوں کو یاد کرتا رہا۔ الکشن لڑا، اور خوب تگڑے طریقے سے۔ جب کامیاب نمائندوں کا اعلان ہوا۔ اور میرے "کینڈیڈیٹ" کی فتح ہوئی تو پھر نہ پوچھئے، اختر مجاز اور میں نے جھٹ پٹ مرثیئے تیار کئے، مخالف پارٹی کا جنازہ نکالا گیا۔ "بریگیڈیر" آگے آگے گھنٹا بجاتے جاتے تھے۔ محامدین پیٹتا تھا۔ اور قدوائی کے گلے میں ہارمونیم لٹکایا گیا تھا، ٹنکر پھول اچھالتا جاتا تھا، ارمان سے کہ۔

"عاشق کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے"

کوئی ڈھائی بجے تک یہ برات گشت کرتی رہی، دوسرے دن جو "ہنومان" کو دیکھا تو رات والا مصرعہ یاد آیا۔

"چہرہ ہے غم میں نقشہ، لٹکا ہوا بنا ہوا"

آفتاب ہوسٹل سے، لگے ہاتھوں، میکڈانل کو بھی ہو لیا، کھوسا اپنے کمرے کے سامنے دھوپ میں کرسی پر سوکھ رہے تھے۔ دیکھ کر بولے "اختر تو بڑا شریر ہے" رات کیا لکھ مارا" میں نے گانے کی کوشش کی۔

قسمت کا بھی چکر ہے تو داڑھی کی بھی الجھن!
اے وائے الکشن!

جو لوگ سن رہے تھے، کھلکھلا کر ہنس پڑے خود کھوسا سے بھی ہنسی ضبط نہ ہوئی، کچھ اس طرح ہنسنے لگے جیسے رات کچھ ہوا ہی نہیں!

مشاعرے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ میرے کمرے میں میرے شاعر دوستوں کے جمگھٹے رہا کرتے تھے، ویسے میں تھا تو "معتمد اعزازی انجمن حدیقۃ الشعر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" مگر جہاں تک شاعری کا تعلق ہے میں اس مضمون میں "کم سخن واقع ہوا تھا۔ مجاز اور اختر سے کہا یار مشاعرے کا اعلان ہو چکا ہے، ایک دن ہم تینوں بیٹھ کر علی الٹپ چلائیں بات یہ طے پائی کہ دو دن بعد ہم لوگ جمع ہو کر "فکر" کریں گے۔ چنانچہ مشاعرے کی شام کو ہم تینوں ایک کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے، مجاز کے ذمہ خدمت یہ سپرد ہوئی کہ وہ پنسل اور کاغذ لیکر بیٹھ جائیں خود موزوں کرتے اور کہتے جائیں اس کے علاوہ اختر کے اور میرے جتنے شعر ہوں ان کو اسی سطر میں سلسلہ وار لکھتے چلے جائیں پھر بیس بائیس شعر بعد ہم لوگ تین سے تقسیم کر ڈالیں، شکر ہے کہ آدھ گھنٹہ میں یہ مہم طے ہوئی اور ہم لوگ فاتحانہ انداز میں کمرے سے باہر نکلے اور لگے اپنی اپنی دھن میں گنگنانے مشاعرہ شروع ہوا رسمی خوش آمدید کے بعد "حضرتے" اور "جنابے" آ آ کر دادِ سخن دینے لگے۔ "واہ وا" "مولانا کمال کر دیا ہے" "حضت مقطع تو ارشاد ہو" کی آوازیں شروع ہوئیں۔ ہندوستانی مشاعرہ اپنے انوکھے پن میں کسی طرح بھی "ہولی" اور چنا جور گرم سے کم نہیں۔ ہندوستانی تہذیب کی دو چیزیں بڑی دلچسپ ہیں ایک تو یہ کہ نام کے بعد "صاحب" کا استعمال دوسرے یہ کہ مشاعرے میں اساتذہ اپنی غزلیں بعد کو پڑھیں، سنا ہے کہ بعض مشاعروں میں تو صرف "کہیں آگے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا" والا مضمون ہو جاتا ہے۔ استاد وہ جس کی غزل بے بدل کے بعد کسی کو "خرافات" بکنے کی جرات ہی نہ ہو، قلم توڑ دئے جائیں، دواتیں چکنا چور کر دی جائیں تمام فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے شعراء استاد کا لوہا مان لیں۔ خیر تو اسی نظام کے تحت مشاعرہ ہو رہا تھا۔ غزل نمبر غزلیں پڑھی جا رہی تھیں، کہ اتنے میں ایک "جنابے ......" رات کے گیارہ بجے بھیروں کی دھن میں چل نکلے۔

"ملتی ہے صور سے تری پازیب کی صدا
ڈرتا ہوں حشر میں کہیں محشر بپا نہ ہو"

ادیب سے فقرہ چست ہوا "آے سبحان اللہ کیا پازیب باندھی ہے" اس پر قہقہہ ہوا، شاعر صاحب سمجھے داد مل رہی ہے چنانچہ آپ داد لینے کی خاطر چوکھی گھومنے لگے، کبھی ادہر مڑے اور کبھی واہ وہ پر اُدھر، غرضیکہ سرکس کا لطف آگیا۔ میرے محترم استاد حضرت علامہ احسن مارہروی کہتے رہے کہ صاحب بس کیجئے مگر شاعر نے غزل میں جان لڑا دی تھی وہ سگنل کھینچنے سے رُکتے کیسے؟ مقطع پر آکر دم لیا۔ اسی طرح بعد کے شعراکی بھی اچھی خاصی گت ہوتی رہی۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے ہم لوگ باہمی اعتماد اور اخفائے راز سے بازی لے گئے مگر جب ادیب بننے کا شوق ہوا، تو دیکھا یہ کہ پڑھے بغیر لکھنا آتا نہیں۔ اس زمانے میں "موپساں" "لیرمنتوف" "انتون چیخوف" اور "طالسطائی" کے تراجم کی گرم بازاری تھی، رافو سے کہا یار اب واقعی سیر سس ہو جائیں۔ مجاز اور اختر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی، غلام احمد بول اُٹھے، جہاں تک ادب میں خوش مذاق اور بلند پایہ مزاحیہ نگاری کا تعلق ہے اسکا ٹھیکہ میں لیتا ہوں۔ مجاز کو "محقق" بننے کا شوق چرایا، اس پر اختر نے کہا مولانا ذرا صورت تو ملاحظہ ہو آپ اور محقق؟ لفظ "محقق" کے معنی بھی جانتے ہیں، مجاز نے کہا "اماں یار یہی حقّہ پینے والے! یہ کون مشکل کام ہے"۔ میرے ذمہ "علی گڑھ لائف" کو مختلف رنگوں میں پیش کرنے کی خدمت سپرد ہوئی، باقی رہے۔ رافو۔ انھوں نے وعدہ کر لیا کہ اسی رنگ میں، فطرت کی حقیقتوں کو بے نقاب کریں گے۔ اب یہ سنئے کہ مضمون لکھے کس طرح جاتے تھے؟ بات یہ طے پائی کہ سب لوگ رافو کے کمرے میں جمع ہوں، اور ان کو اپنے "قدوم میمنت لزوم" سے عزت بخشیں رافو ہم لوگوں کے منتظر کھڑے ہوتے، انگیٹھی پر چاء کا پانی دھرا رہتا، چھوٹی چھوٹی میزوں پر پان

اور سگرٹ کا اہتمام رہتا، اس کے بعد میزبان صاحب ہر ایک مضمون نگار کو الگ الگ کاغذ عنایت فرماتے، اور چند لمحوں بعد اردو زبان جو بقول ہدی کے "کل کی نوخیز چھوکری تھی۔ اپنی چھل بل دکھانے لگتی۔ لکھتے چلے جاتے، اور کبھی کبھی کمرے کی چھت کو کچھ اس انداز سے تکتے جیسے" بادل سے چلے آتے ہیں مضمون میرے آگے" کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک صریر خامہ نوائے سروش" رہتا اس کے بعد "کھیل" ختم۔ اسی طرح ہر ہفتہ کبھی مجاز کبھی اختر اور کبھی غلام احمد کے ہاں منچلوں کا اجتماع ہوتا، اور یہ ادیب "جیفوت" "مولیئے" "ہنرک ابسن" اور "شا" کے کان کاٹ لیتے کچھ عرصہ بعد اختر میگزین کے ایڈیٹر ہو گئے ایک دن عثمانیہ میں مجھ سے ملنے آئے آپ نے تحکمانہ انداز میں ارشاد فرمایا "لکھتے ہو یا نہیں؟ بند کروں دروازہ؟ کوئی عذر قابل سماعت نہیں ہے، بس ابھی بیٹھو، اور لکھنا شروع کر دو ورنہ مار بیٹھوں گا"۔ میں نے کہا یہ زبردستی کی مضمون نگاری؟ اور فرض کردم کہ لکھنا شروع بھی کیا تو کس موضوع پر ہونے کچھ ہی سہی مگر لکھو ضرور۔ یقین مانئے اسی وقت کاغذ نکال لکھنا شروع کیا، عنوان رکھا "جہالت کی شاعری" پہلے تو ارادہ تھا کہ خود اختر کی رنگین اور نشاط انگیز شاعری کی دھجیاں اڑاؤں اور ثابت کر دوں کہ یہ جہالت کی شاعری ہے، مگر چونکہ ایم۔ اے میں عربی لے رکھی تھی اس لئے لفظ "جہالت" سے صحرائے نجد کی طرف بہک گیا، کچھ باتیں معلوم تھیں، علی الشپ چلانیکی مشق ویسے ہی تھی، ایک اچھا خاصا مجموعۂ جہالت تیار ہو گیا اور دوسرے ہی دن پریس کی نذر ہو گیا۔ ڈیڑھ ماہ بعد" باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی "بڑی آب و تاب سے میگزین میں شائع ہوا، اسی طرح بعد میں بھی جو کچھ لکھا وہ صرف اس ڈر سے کہیں اختر سے دھینگا مشتی اور تو تو میں میں کی نوبت نہ آ جائے۔

اگر المانوی ادب ولہلم بش (Wilhelm Busch) کی سنجیدہ ظرافت پر ناز کر سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ میں "بھائی عصمت" "گیورا" اور "حکیم محمد چھوٹے" پر فخر نہ کروں۔ ان میں مؤخر الذکر کے علاوہ بقیہ دو اپنی نوعیت کے اعتبار سے خوب ہی تھے "بھائی عصمت"

رنگین مزاج تھے، بالائے قلعہ میں رہتے تھے اور آدھی رات کو در رعشق یا کھٹمل کی نشتریت سے آسمان کے تارے گنا کرتے، جب کبھی مجازؔ اختر یا مجھ سے ملتے تو ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کرتے تھے کہ آپ کسی لڑکی پر عاشق ہیں اور گفتگو میں کبھی کبھی "ڈوپٹہ" "چلمن" "چوڑیاں" "عطر سہاگ" اور "سعادت یار خاں رنگینؔ" کو نہ بھولتے گرمی کی چھٹیوں کے بعد جو ملنے آئے تو اچھے خاصے برمن کمپنی کے "استعمال کے بعد" والے اشتہار معلوم ہوتے تھے" یہ قابل رشک تندرستی، اس پر عاایک سلیک کے بعد آپ نے فرمایا' دوست نہ پوچھو چھٹیاں کس طرح گذریں' گلابی ڈوپٹے کا خونی تصور گہری نیند سے چونکا دیا کرتا تھا۔ رات رونے میں بسر ہوتی تھی' ایک رات' جس کو ابھی کوئی ڈیڑھ مہینہ ہوا ہوگا میں نے صحیح معنوں میں سمجھا کہ میرؔ نے اپنے اس شعر

"اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد سا پیدا ہوتا ہے
ہم رات کو اٹھ اٹھ روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے"

کے یہ معنی رکھے ہیں' پھر اخترؔ سے جو ملنے گئے تو ارشاد فرمایا جان! تمہارے' اختر امام اور مجازؔ کے علاوہ یونیورسٹی میں کوئی بھی اس راز سے واقف نہ ہو سکا کہ میں اس سال امتحان میں فیل کیوں ہو گیا' پھر ٹھنڈی آہیں بھر کر' چھت کو مخاطب کرکے' گرم سخن ہوئے۔

"جوانی! ....!

"گپورا" دبلے پتلے تھے، ظاہری ٹیپ ٹاپ کا بڑا لحاظ رکھتے تھے جوتوں میں پالش کے سختی سے پابند تھے مگر سر کے بال دانستہ طور پر الجھائے رکھتے تھے' ایک جگہ دل دے آئے تھے اور چوڑیوں کے ٹکڑے بڑی حفاظت سے اٹیچی کیس میں رکھتے تھے' بے تکلف دوستوں کو دکھلاتے اور دادِ عشق لیتے۔ ایک دن میرے کمرے میں وارد ہوئے تو ہاتھ ملائے بغیر آئینہ کی طرف لپکے اور مختلف زاویوں سے خود آرائیاں کرنے لگے۔ ان کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہیگا' گرمیوں کی رات تھی ہم لوگ سامنے میدان میں اپنی چارپائیوں پر پڑے سو رہے تھے' آپ نے مجھ کو آکر جگایا' میں نے سمجھا یار پر کسی نے ایکیٹو نٹی کر دی ہے آنکھیں

ملتا ہوا مدد کے لئے اٹھا تو آپ نے فرمایا "سچ بتاؤ میں کالا تو نہیں ہوں"؟ میں نے کہا "یار اب ایسے بھی کیا کالے ہو" یہ سنکر اطمینان کا سانس لیا اور بولے میرا شبہ غلط نکلا' کوئی اور بات معلوم ہوتی ہے۔ کہا "ہاں"۔

حکیم محمد چھوٹے ان سبھوں سے نرالے تھے۔ آپ کے کمرے کے سامنے ایک پنجرا لٹکا ہوتا' شامائیں چہچہاتی رہتیں' اور خود عابد دولت کمرے میں محو گپ۔ آپ کا لوفر بننے کا شوق عشق کی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ جب کبھی علیک سلیک ہو جاتی تو اپنے شاندار کارناموں کو مزے لے لے کر بیان کرتے' ایک دن میں نے کہا' سنا ہے تو نے پڑھنا شروع کر دیا ہے'؟ چیں بجبیں ہو کر بولے' یار کیوں بدنام کرتا ہے۔ واللہ نہیں! خاطر تواضع میں پان تک اکتفا کرتے' ان سے چاء پینے کی آسان صورت یہ تھی کہ ان کی شرارتوں کا ذکر چھیڑا جائے ایک دن ہم لوگوں نے حکیم سے کہا' یار تجھسے تو باتیں کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے' بورڈنگ کے لڑکے دیکھ کر دل میں کہہ رہے ہوں گے' یہ لوگ لوفر سے گپیں لڑا رہے ہیں تو یار ڈرتے ہیں کہیں تیری طرح لوفر مشہور ہو جائیں' اس پر حکیم بہت خوش ہوئے کہنے لگے یار اب تو لوفنگر چھوڑ دی ہے صرف جوبلی ہوسٹل جاکر شرارتیں کرآتا ہوں' پرسوں خوانچہ والے کو ایک ڈانٹ بتائی جگر بھام روتا تھا اور سنو' ایکیٹو یٹی کے تین چار گھڑے تو ابھی باقی ہی رہ گئے ہیں... یار چلو سوئمنگ باتھ رسیتوران' ہم لوگ انکے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے سوئمنگ باتھ پہنچے' کیک' پیسٹری' نمک پارے' اور کباب کھائے گئے' چاء پی گئی اور پھر حکیم صاحب مستند لوفر کی شان سے "خدا حافظ" کہتے ہوئے منٹو سرکل سدھارے۔

"دریائے رہائن کے کنارے بیٹھ کر علی گڑھ" پر خیال آرائیاں کر رہا تھا' کیا معلوم تھا کہ یہاں آتے ہی میگزین کے ایڈیٹر صاحب' سنت دیرینہ کے بموجب مجھسے زبردستی لکھوائیں گے۔ شکر ہے کہ لکھ کر جان بچی۔

غزل

جناب جگر مرادآبادی

اللہ رے، اِس گلشنِ ایجاد کا عالم
جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم

اُف رنگِ رخِ بانیٔ بیداد کا عالم
جیسے کسی مظلوم کی فریاد کا عالم

آتی نہیں پتھروں سے دھڑکنے کی بھی آواز
کیا جانئے کیا ہے دلِ ناشاد کا عالم

اربابِ چمن سے نہیں پوچھو یہ چمن سے
کہتے ہیں کسے نکہت بر باد کا عالم

منصور تو سر دے کے سبک ہو گیا لیکن
جلاد سے پوچھے کوئی جلاد کا عالم

میں اور ترے ہجر مسلسل کی شکایت
تیرا ہی تو عالم ہے، تیری یاد کا عالم

کیا جانے کیا ہے مری معراج مقامی
عالم تو ہے صرف اک مری افتاد کا عالم

غالب کا مسلک

جاں نثار اختر

اگلا مضمون "نیا دھارا" بعض وجوہ سے خارج کر دیا گیا ہے
اس وجہ سے صفحات ۶۴ - ۶۸ نکال دیئے گئے ہیں
قارئین متوحش نہ ہوں۔

"ذہنی افکار و عقائد کی
ندات کا غیر شعوری

غالب شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے اور توحید رسالت اور امامت کے عقائد اُن کو وراثتہً پہونچے۔ بچپن کی تربیت اور ماحول نے مذہب کے یہ بنیادی اصول اُن کی فطرت میں داخل کر دیئے تھے لیکن اُن کا فطری رجحان اور طبعی افتاد آزادانہ تھی جس نے غالب کو فقہ کی جزئیات سے محترز رکھا۔ غالب فقہی مسائل کی قیل و قال کو وقت کی بربادی تصور کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ وقت دل و دماغ کی تربیت میں صرف ہونا چاہیئے میر سرفراز حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ، جو آدمی بنا چاہے"

غالب دراصل انفرادی طور پر روحانی تربیت کے قائل ہیں۔ وہ انسان کے ذہنی اور روحانی نشو و نما پر کسی طرح کی پابندی عائد کرنا پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی منقبت میں محض اظہار نیاز ہے کسی قسم کا تبلیغی جذبہ نہیں پایا جاتا۔ اخلاقیات کا عنصر بھی غالب کے شعروں میں موجود ہے لیکن یہاں بھی غالب نے اخلاق کے پردے میں مذہب کی تعلیم نہیں دی بلکہ وہ انسانی عملی زندگی کے تعلق میں ہیں۔

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم ۔۔۔ اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے
غرّہ اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو ۔۔۔ اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

به پیچ و تاب ہوس مسلک عافیت معلوم	نگاہ عجز سر رشتہ سلامت ہے

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی	نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی	بخش دو گر خطا کرے کوئی

غالب نے نعت بھی لکھی ہے منقبت بھی کہی ہے اور مرثیہ بھی پڑھا ہے لیکن یہ مخصوص موضوعات ہیں جن میں غالب نے شعوری محنت و کاوش صرف کی ہے۔ یہ مذہبی قصائد یا منظومات ہیں اور اُن کی حیثیت رسمی اور خصوصی ہے۔ غالب کی عام شاعری میں دراصل اُن کے مسلک کا سُراغ ملتا ہے۔ اُن کی اُردو اور فارسی غزلیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اُن کی طبعی آزاد خیالی کو مشرقی شعرا کی وسیع مشربی نے اور فروغ دیا ہے۔ حافظ، عمر خیام اور خسرو نے اہل مذہب کے خلاف جو آہنگ شاعری میں داخل کیا غالب کے لئے اُس کے تاثرات فطرۃً ناگزیر تھے۔ غالب انہی آزاد مشرب شعرا کی صف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

غالب کے ماحول میں ایک تحریک ایسی ملتی ہے جس نے غالب کی اس آزاد خیالی کو اور بھی تقویت پہونچائی۔ یہ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تحریک اصلاح تھی۔ سید احمد خاں نے اس کو لوتھر کی تحریک "ریفارمیشن" کے ہم مثل بتایا ہے۔ یہ تحریک تقلید کی مخالفت میں تھی دہلی کے تمام اہل الرائے اس تحریک کے سبب دو گروہ میں منقسم ہو گئے تھے۔ غیر مقلدین میں سب سے زیادہ رسائل شاہ اسمٰعیل اور سید احمد خاں نے لکھے اور مقلدین کی ترجمانی فضل حق خیر آبادی نے کی۔ شاہ نصیر نے اس کی مخالفت میں نظمیں لکھیں۔ مومن سید احمد بریلوی کے مرید اور اس تحریک کے موافق تھے۔ غالب کے کلام میں عقائد وہابیہ کے خلاف ایک فارسی مثنوی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ دراصل فضل حق خیر آبادی کی زبردستی تھی جو غالب کے بے حد دوست تھے۔ یہ مثنوی امتناع خاتم النبیین کے مسئلہ پر ہے۔ شاہ اسمٰعیل کی رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے ممتنع بالذات نہیں۔ آنحضرتؐ کا مثل اس لئے پیدا نہیں

ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے اس لئے نہیں کہ خدا اُس کے پیدا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ بر خلاف اس کے فضل حق کے نزدیک خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے، جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا اُسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا غالب کا نقطہ نظر فضل حق سے مختلف تھا۔ اس لئے اُنھوں نے مثنوی لکھی تو اپنے نظریہ کی ترجمانی کر گئے۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است　　قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است

خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے　　ہم بود ہر عالمے را خاتمے

در یکے عالم دو تا خاتم مجوئے　　صد ہزاراں عالم و خاتم بگوئے

مولوی فضل حق نے اس کو اپنے خیال کے مطابق نہ پایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر لاکھ عالم بھی خدا پیدا کرے گا تو خاتم النبیین آنحضرتؐ ہی رہیں گے۔ غالب کو دوست کی رضا جوئی مقصود تھی، انھوں نے مولوی فضل حق کے حکم کی تعمیل میں مثنوی کے آخر میں چند شعر ان کے خیال کے مطابق بڑھا کر کلام کو مربوط کر دیا۔

. . . .

منشاءِ ایجاد ہر عالم یکے ست　　گر دو صد عالم بود خاتم یکے ست

لیکن بعد کے شعر غالب کے اپنے خیالات کے ترجمان نہیں۔ حالی نے جیسا یادگار غالب میں لکھا ہے غالب کا نقطۂ نظر شاہ اسمٰعیل سے ملتا جلتا تھا۔ غالب دراصل اس تحریک سے خوش تھے۔ جس جرأت اور بیباکی سے شاہ اسمٰعیل صدیوں کے بت گرا رہے تھے اُس کے ذہنی اثر سے غالب کی آزاد مشربی کو اور تازیانہ لگا اور شاعری میں جہاں تک مذہبی خیالات کا تعلق ہے اُن کی آزادی اور وارستگی اور زیادہ ہو گئی۔ انہی اثرات کے تحت غالب مذہبی رسمیات سے متنفر ہو گئے اور کبیر کی طرح۔ پوجا، سیوا، نیم، ورت، گڑیوں کا سا کھیل، سمجھنے لگے۔ مذہب کی رسوم اور قیود اُن کے لئے بے معنی ہو گئیں۔

زنہار ازاں نزم مباش کہ فریبند حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

یہی نہیں، غالب جنت و دوزخ، عذاب و ثواب اور جزا و سزا کسی کے قائل نظر نہیں آتے وہ ان تصورات کو انسان کے روحانی ارتقا میں سدّراہ سمجھتے ہیں۔

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم با ماسخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

ان مذہبی اعتقادات اور تصورات پر غالب نے جابجا طنز کیا ہے۔ غالب کی یہ طنزیہ ذہنیت سی بڑھی ہوئی آزاد خیالی کی پیدا وار ہے۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جنت اور دوزخ سے غالب کی بے نیازی دیکھیے۔

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

عام طور پر غالب کے اس طنزیات پر ظرافت کا پردا ڈالا جاتا ہے۔ لیکن ان شعروں میں ظرافت کی تہ سے طنز پھوٹ نکلا ہے۔ حقیقت یہ ہے وہی طنز زیادہ نشتریت لئے ہوتا ہے جس میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اُس ظرافت یا خوش طبعی کو ادبی حیثیت حاصل ہو۔

غالب ہر مذہبی فرقے کو چند رسموں کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے کوئی فرقہ اُن کی نظر میں اہمیت نہیں رکھتا۔ ابوبکر کی خلافت اور علی کی تفضیل کے اختلافات اُن کے نزدیک لایعنی مباحث ہیں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

حرم و دیر کا تعین اور امتیاز بھی اُن کے لئے کوئی چیز نہیں بلکہ وہ ہر مذہب کی ظاہرا ہیئت و تشکیل کے خلاف ہیں۔

دیر و حرم آئنۂ تکرار تمنّا　　　واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

تمام مذاہب سے غالب کی یہ ذہنی بیگانگی ان کے مطالعہ کی بھی مرہون ہے۔ غالب نے "مہر نیم روز" میں ابتدائے آفرینش کے متعلق ہند و عقائد کا جو خلاصہ درج کیا ہے اُس سے اور اُن کی مثنوی "تحفہ دیر" سے ہند و مذہب کے عقائد سے اُن کی مکمل واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ عبدالصمد ہرمزکی وجہ سے غالب کی واقفیت پارسیوں کے عقائد سے بھی بڑھ گئی تھی۔ "دبستان مذاہب" اکثر اُن کے مطالعہ میں رہتی تھی۔ ممکن ہے مذاہب عالم کے مطالعہ سے یہ دلچسپی ہرمز کی تعلیم اور صحبت کا اثر ہو۔ بہرکیف اس مطالعہ سے غالب کے لئے تمام عوارض اور اعتبارات فنا ہوگئے تھے۔ وہ صرف "وحدت" کے قائل رہ گئے تھے۔

وحدت اور تصوف کے دیگر مسائل کی ترجمانی غالب کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ دراصل وہ تصوف نگاری ہے جو شاعری کا جزو بن گئی تھی۔ غالب چونکہ فارسی اور فارسیت سے انتہائی شغف رکھتے تھے اور اُن کی شاعری کا سلسلہ حزیں، بیدل، ظہوری، عرفی اور نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچتا ہے اس لئے تصوف اُن کے کلام میں براہ راست فارسی ادب سے منتقل ہوا۔ لیکن غالب کا تصوف اس لحاظ سے کہ وہ خود صوفی نہ تھے اور نہ کسی خاص صوفیہ فرقہ سے تعلق ذاتی رکھتے تھے، رسمی ہے۔ وہ تصوف کے علم کو جانتے تھے اور اُس کے نکات کو سمجھتے تھے اُن کے ان اشعار میں واردات کی جھلک نہیں ملتی۔

شاعری میں تصوف نگاری نے جب روایت اور رسم کی صورت اختیار کی تو شعرا کی آزاد مشربی کے لئے ایک پناہ بن گئی۔ غالب کو تصوف سے نفسیاتی لگاؤ نہ تھا۔ انھوں نے تصوف کے مسائل نظم کئے لیکن اس آڑ میں اُن کی آزاد خیالی کو وسیع میدان ہاتھ آگیا یوں بھی موجودہ تصوف کو اسلامی شرع سے گہرا لگاؤ نظر نہیں آتا۔

اقبال نے (The Development of Metaphysics in Persia)
میں موجودہ تصوف کے پیدا ہونے اور بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ ابوحنیفہ، شافعی، مالک اور حنبل کی سخت گیری اور زہد خشک سے مجبور ہو کر لوگ ایسا راستہ ڈھونڈنے لگے تھے جس سے یاد خدا میں دلچسپی ہو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس ذہنی تبدیلی نے اسلامی تصوف میں بیرونی اثرات کے لئے گنجائش پیدا کر دی تھی۔ اسلامی تصوف کا صحیح مرقع خود پیغمبر اسلام اور اُن کے صحابہ کی زندگی تھی۔ جنید بغدادی۔ رابعہ بصری۔ شیخ جیلانی، شیخ سہروردی، مرشد اجمیری، خواجہ نقشبندی، اور مجدد سرہندی اس مسلک کے سچے رہبر اور رہنما تھے اس دور آخر میں بھی شاہ ولی اللہ دہلوی کی ذات اسلامی تصوف کی علم بردار رہی ہے۔ علم تصوف کی تاریخ بتاتی ہے کہ شیخ جیلانی اور شیخ سہروردی تک کی تصانیف میں یہ اسلامی رنگ قائم رہا۔ اس زمانہ کے بعد ہی شیخ ابن عربی کے اثر سے نظام تصوف میں فلسفیانہ عنصر کا غلبہ ہوا اور رفتہ رفتہ اس عنصر کو تقویت ہوتی گئی۔ وحدت وجود، عقل اول، ہیولی وغیرہ کے عقائد اور مسائل حکمائے یونان، مصر، ہندوستان اور ایران کے اثر سے تصوف میں جگہ پانے لگے۔ خود حکمت الاشراق نے تصوف پر گہرا اثر ڈالا؛ عیسائی مذہب کی رہبانیت، ہندو مذہب کا برہم یا آتما کا فلسفہ، اور بودھ مت کا نروان کا مسئلہ اسلامی تصوف پر اثرانداز ہوئے۔ ان بیرونی اثرات نے تصوف کی اصلی شکل کو بالکل مسخ کر دیا یہاں تک کہ اُس کا خالص اور بے آمیز تصور بھی باقی نہ رہا۔ تصوف کی موجودہ شکل یونانی اوہام، ایرانی تخیلات، ہندی مراسم اور دیگر غیر اسلامی عناصر کا مجموعہ ہے جس کے صرف بعض اجزا اسلامی کہے جا سکتے ہیں۔

غالب کی شاعری میں اسلامی تصوف کے نظریات اپنی موجودہ اور مسخ شدہ ہیئت میں ملتے ہیں۔ غالب تصوف کا کوئی مخصوص نظریہ نہیں رکھتے۔ تصوف کے مختلف اصولوں اور مختلف فرقوں کے متائن اور متضاد عقائد کو انہوں نے اپنے شعروں میں

جگہ دی ہے۔ وحدانیت کے مسئلہ میں غالبؔ نے وحدت وجود اور وحدت شہود دونوں کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اُن کی دلچسپی وحدت وجود سے ہے اور سے اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ۔

وحدت وجود کے ماننے والے غیر اللہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ کثرت بالذات اُن کے نزدیک کوئی چیز نہیں۔ فریدالدین عطار جو وحدت وجود کے قائل ہیں اُن کے نزدیک تو لا الٰہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ بھی کہنا شرک ہے۔

شرک ذ وہست چوں خفی و جلی — ہر دو را پیش تو کنم تکرار
اے پسر لا الٰہ الا اللہ ، — خود ز شرک خفی ست آئینہ دار
ہست شرک جلی رسول اللہ — خویشتن را ازین دو شرک برار
چوں ازیں شرک ہا خلاص شوی
شوی آں وقت صوفی ستار

غالب کا بھی یہی مسلک ہے۔ موجودات کی نفی سے وحدت کو ثابت کرنے میں اُن کو خاص انہماک ہے۔ اور غالب تو اس وحدت کو "ہست" سے بھی تعبیر نہیں کرتے بلکہ "غیر ہست" بتاتے ہیں۔ یہی اُن کے مسلک کا سب سے بلند آہنگ ہے۔

پیروئی وہم مکن زنہار — سر ز گریبانِ حقیقت بر آر
ساقیٔ ہمت کہ صلا می دہد — بادہ ز خمخانۂ "لا" می دہد

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہم وجود — ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

پیدا و نہاں مشغلۂ حب ظہور است — چوں پردہ بر افتد نہ نہاں ست نہ پیدا

غالبؔ ایک منقبت کی ابتدا میں اپنے اس مسلک "لا" کی تفصیل بیان کر گئے ہیں۔

جس کو فی الواقع توصیف و تفضیلِ علی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم — لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم — دردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس — وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں
موجِ خمیازۂ یک نشہ چہ اسلام چہ کفر — کجیٔ یک خطِ مسطر چہ توہم چہ یقیں
قبلہ و ابروئے بت یک رہِ خوابیدہ شوق — کعبہ و بتکدہ یک محملِ خوابِ سنگیں

نہ تمنا نہ تماشا نہ تحیر نہ نگاہ
گردِ جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں

لیکن اس "لا" میں غالب کی کوئی صوفیانہ عقدیت مضمر نہیں بلکہ اُن کی آزادمشربی کے لئے "لا" ایک آڑ ہے۔

غالب تُرا بہ دیر مسلماں شمردہ اند
آرے دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند

دیوانگی :-

جناب ریاض رؤفی (علیگ)

"—— ایک کتا کہیں سے روٹی کا ٹکڑا اچرا لایا —— بھوکے کتوں کے غول نے دیکھا
بس جھپٹ پڑے —— بھوں، بھوں شروع ہو گئی —— اور پھر —— لڑائی ——
لڑائی —— لڑائی ——"

....

آج کل طبیعت بڑی پریشان رہتی ہے۔ دماغ میں عجیب عجیب خیالات گھومتے رہتے ہیں۔
—— ذرا چین نہیں —— کتاب پڑھتے پڑھتے، کسی خاص جملے پر تو بس جی چاہتا ہے کہ
—— اپنے بال نوچ لوں —— کپڑے پھاڑ ڈالوں —— اور کہیں نکل جاؤں ——
یہ کتابیں انسانیت کی کیسی عریاں تصویریں پیش کرتی ہیں جیسے انسانی جسم کا ایکس ریز فوٹو۔
—— اف! صداقت کس قدر تلخ ہوتی ہے —— کسی صداقت کا اچانک انکشاف
بھی انسان کو دیوانہ کر دینے کے لئے کافی ہے —— اور کبھی کبھی تو ایسا
جی چاہتا ہے کہ ان تمام کتابوں کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دوں —— اس قدر باریک
باریک ٹکڑے کہ وہ ہوا میں اڑتے ہوئے دنیا کے مختلف گوشوں میں پہنچ جائیں ——
شاید پھر کبھی یکجا ہو جائیں —— جلا کر راکھ کر دینا بہتر ہے کہ نہ دنیا انھیں دیکھ سکے، نہ پڑھ
سکے —— نہ کسی کی طبیعت پریشان ہو نہ لوگ دیوانگی کا الزام دیں۔
اور یہ اخبار انہیں کیا کیا جائے؟ —— بس آدمی کا پاگل ہو جانا بہتر ہے ——
خدا نہ کرے کہ کوئی کچھ سوچ سمجھ سکے ——

لڑائی —— لڑائی —— لڑائی —— بہت سے کتوں کی لڑائی ——

روٹی کے ٹکڑے کے لئے ـــــ ڈ ڈاکو ؤں کی لڑائی چوری کے مال کے لئے ـــــ
ـــــ تم دنیا کو لوٹتے ہو، اپنی طاقت کے بل بوتے پر ـــــ لو ہم بھی طاقت ور ہو چلے ہیں ـــــ اب اپنی لوٹ میں ہمیں بھی شامل کرو ـــــ یا حصے بخرے کرلو ـــــ نہیں مانتے ـــــ تو آؤ ذرا زور آزمائی ہو جائے۔

دشمن سر پر آگیا ـــــ ہر طرف سُرخ سُرخ بدلیاں چھا رہی ہیں ـــــ اب تو خیر نظر نہیں آتی ـــــ یوں کام نہ چلے گا ـــــ کوئی نیا فتنہ جگایا جائے۔

دودھ پلا پلا کر آستین میں ناگن پالی تھی ـــــ سمجھتے تھے کہ اشارہ کرتے ہی دشمنوں کو ڈس لیگی ـــــ پھر ہمارے لئے میدان صاف ہے ـــــ مگر وہ تو اُلٹی ہم پر حملہ آور ہوئی۔

مداری کے تھیلے میں دنیا بھر کے عجائبات بھرے پڑے تھے ـــــ اُسے نئے نئے منتر یاد تھے ـــــ سیکڑوں گُر جانتا تھا ـــــ سمجھتا تھا کہ دنیا میری مٹھی میں ہے ـــــ جدھر چاہو نگا پھیر لونگا ـــــ آخر یہ جادو کب تک کام دیتا ـــــ ذرا اثر کم ہوا تو لوگ بیدار ہوئے۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سب کچھ مداری کے تھیلے میں پہنچ گیا ـــــ بس زندگی ہی زندگی رہ گئی ہے ـــــ ساری بستی کانپ اُٹھی۔ غصے سے تمتما اُٹھی ـــــ مگر کیا کرتی ـــــ گذشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط ـــــ مداری کو ضرورت پڑی انسانی خون کی ـــــ اس نے پھر اُنہی سادہ لوحوں کو پھانسنا چاہا ـــــ مگر وہ ہوشیار ہو چکے تھے اُنہوں نے غصے سے گھور کر مداری کی طرف دیکھا ـــــ "اب تم ہمیں بیوقوف نہیں بنا سکتے"۔
مگر مداری پھر نام کا مداری تھا ـــــ اُس نے چھوٹے چھوٹے خوبصورت، رنگین سانپ ٹوکری سے نکالے اور فضا میں بکھیر دیئے ـــــ کیسے خوبصورت، خوشنما سانپ تھے ـــــ کیا

معشوق کی کمر ــــــ معشوق کی زلف ــــ معشوق کی ابرو ــــــ یہ جمہوریت ہی ــــ
یہ انصاف ــــ یہ حق ــ یہ تمدن ــــ اور یہ ــــــ بُتی رام ہو رہی ہی ــــ
مگر ان کے کاٹے کا علاج ؟ ــــ کون جانے ؟ ۔

ذرا آرام نہیں ــــ سکون نہیں ــــ میرا دماغ مجھے مارے ڈالتا ہے ــــ یہ خیالات میرا پیچھا نہیں چھوڑتے ــــــ بیٹھو دہی ــــ لیٹو دہی ــــــ کتاب پڑھ رہے ہیں ۔ چل رہی ہیں پھر رہے ہیں ــــــ مگر دماغ میں دہی بھرا ہے ــــــ اُف جینا مشکل ہو گیا ۔

حد ہو گئی ــــــ خواب میں دیکھتا ہوں :ــــــ

ایک نوکیلی چٹان پر انسانیت نیم عریاں چیتھڑے لگائے کھڑی ہے ــــ ہر طرف سے بڑے بڑے سیاہ ، خوفناک اژدہے منہ کھولے نگلنے چلے آرہے ہیں ــــ اُنکے اطراف ایک خون کا دریا ہے ۔ جس کی طلاطم خیز موجیں آسمان تک اونچی اٹھتی ہیں ــــــ زہریلی آتشیں ہواؤں کے طوفان چلے آرہے ہیں ــــ بجلی کی کڑک بادل کی گرج ــــــ اف ایک قیامت ہے ــــ یکایک انسانیت کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلتی ہے ــــــ میں بستر پر کانپتا ہوا ہوشیار بیٹھا ہوں ــــــ کاش میں پاگل ہوتا ۔

میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ بھائی صاحب کچہری سے واپس آئے اور والد صاحب سے کہنے لگے ــــــ "آج شہر میں ایک قتل ہو گیا"

"کیسے" ــــ والد صاحب نے گھبرا کر پوچھا ۔

"ارے وہی حسن پور کے مالگذار کے لڑکے نے اپنی بیوی کو گولی مار دی" ــــــ

ــــ میں اخبار پھینک کر کمرے میں چلا آیا ــــ آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گیا ــ مگر اُس پر

تو کانٹے بکھرے ہوئے تھے ——— آرام کہاں ——— چین کہاں - میرے دماغ کے سفید پردے پر ایک رنگین فلم دکھائی جا رہی تھی :———

"شیلا! تم کتنی حسین ہو - کتنی سندر ؟" پریم نے کہا ——— "اور یہ تمہاری بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی گہرائی ——— جیسے دور افق کے کنارے پانی ڈول رہا ہو ———

اور یہ تمہارے لانبے لانبے سیاہ بال ——— جیسے رات کو چاند نکلتے وقت درختوں کے وسیع تاریک سائے ———" اور اس نے شیلا کا ہاتھ پکڑ کر کہا ——— "اور یہ تمہاری پتلی پتلی نازک انگلیاں ——— نکلتے سورج کی کرنیں ——— اور یہ تمہارے لب" اس نے ایک پیاسے کی طرح اس کے گلابی ہونٹوں کو تکتے ہوئے کہا ——— "جیسے شبنم آلودہ گلاب کی دو پنکھڑیاں بادِ سحر کے لطیف جھونکوں سے وا ہو گئیں ——— اور یہ ———"

بہرحال وہی ہوا جو ہونا تھا ——— آپ بھی کسی دوشیزہ کے سامنے اس کے حسن کی تعریف کیجئے ——— پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے ؟ ——— شادی ہو گئی ——— چند دن خوب مزے رہے اور پھر ——— نڈھال ——— جیسے آفس کے کلرک یا مل کے مزدور دن بھر کے تھکے ماندے بستر پر گرے پڑتے ہیں - فطرت تو تغیر و تبدل کی طرف مائل ہے ——— تشنگی پھر بڑھ گئی - پریم جیسے جوان اور مالگذار کے لڑکے کے لئے جوانی کا بستی میں کیا کال تھا ——— خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے ——— کتنی ہی ہوں گی جن کے گلابی رخساروں کی چمک دمک کو پریم کے آتشیں نفس نے جھلس ڈالا ——— کتنی ہی ہیں جو راستے میں سامنا ہونے پر شرم سے پرے ہٹ جاتی ہیں ——— اُسے منہ بنا بنا کر خوب گالیاں دیتی ہیں ——— کوستی ہیں ——— شریر ——— کمینے ——— ذلیل ——— لیکن ان کی نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی ہیں ——— اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گھر واپس لوٹتی ہیں -

شیلا بیچاری ——— آخر وہ بھی انسان تھی ——— کیا کرتی ——— پریم کے دوست

سے تعلق ہو گیا ـــــ میرے دماغ نے آخری تصویر پیش کی ـــــ پریم شیلا کو گولی کا نشانہ
بنا رہا تھا ـــــ "اف ظالم" میرے منھ سے نکلا ـ میں اٹھکر بیٹھ گیا ۔ میرے کانوں
میں طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں ـــــ "بہت اچھا کیا! ـ بہت اچھا کیا!!
وہ عورت ہی بڑی دیسی تھی ـــــ راستہ چلتوں کو تاکا کرتی تھی ـــــ
کوئی مجھے تھوڑا سا کلوروفارم دیدے ـــــ کچھ دیر کے لئے تو سکون مل جائیگا۔

علی الصبح انوار تشریف لائے ۔ مجھ سے کہنے لگے: ـــــ "آج دوپہر کو انجمن انسداد گدا
گری" کا پہلا جلسہ ہے ـــــ میں نے تمہارا نام بھی لکھوا دیا ہے ـــــ اور ہاں! تمہیں
وہاں تقریر بھی کرنی ہوگی ـــــ"

میں پھٹ پڑا ۔ جیسے کسی نے بارود کو دیا سلائی دکھا دی ـــــ "تمہیں شرم نہیں
آتی ـ آخر کب تک اس طرح دنیا کو دھوکا دوگے ـــــ انجمن انسداد گداگری ـــــ
انجمن انسداد مفلسی ـــــ انجمن انسداد بے روزگاری ـــــ آخر یہ کیا ڈھونگ رچا رکھے
ہیں ـــــ آنکھ رکھتے ہوئے اندھے بنتے ہو اور دنیا کو اندھا بنانا چاہتے ہو ـــــ آخر
کب تک؟ ـــــ کب تک لوگوں کو اس طرح بیوقوف بناؤگے؟

"تم یہ کیا بک رہے ہو؟" انوار نے متعجب ہو کر پوچھا ۔

"میں بک رہا ہوں! جی ہاں میں بک رہا ہوں!! ـــــ میرا مطلب ہے کہ
جھوٹ کی عمر پانی کے بلبلے کے مانند ہے ـــــ تم زیادہ عرصے تک لوگوں کو
بیوقوف نہیں بنا سکتے ـــــ تم ایک شخص کو رات کو زہر دیتے ہو اور صبح مزاج پرسی
کو جاتے ہو ـــــ تمہارے لگائے ہوئے زخموں سے ایک شخص قریب المرگ ہے
اور تم ہی زخم پر مرہم رکھتے ہو ـــــ یہ جانتے ہوئے کہ درخت کی جڑ کو دیمک
چاٹ چکی ہے تم اُسے پانی دیتے ہو ـــــ اُس کی رکھوالی کرتے ہو ـــــ کیا یہ دھوکا

نہیں ـــــ فریب نہیں ـــــ اور کیا جھوٹ کے سینگ ہوتے ہیں "

"کیا اچھے اچھے الفاظ تراشے ہیں تم نے ـــــ انجمن انسدادِ گداگری ـــــ انجمن انسداد بے روزگاری ـــــ انجمن انسداد عصمت فروشی ـــــ کڑوی کونین کی گولیوں پر شکر چڑھائی جا رہی ہے ـــــ یہ رنگین نقاب ـــــ یہ انجمن سازیاں ـــــ اب زیادہ کام نہ دیں گی ـــــ پہلے شہر میں ہیضے کے جراثیم پھیلا دینا ـــــ پھر کنوؤں میں دوا ڈالتے پھرنا ـــــ اور اپنے ہم خیال ساتھیوں کی جماعت کا نام رکھنا ـــــ انجمن انسداد ہیضہ ـــــ یہ ہے خدمت عامہ ـــــ کیوں؟ ـــــ ٹھیک ہے نا؟ ـــــ مگر ہاں! میں تمہیں اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ وہ زمانہ اب بہت قریب آرہا ہے جب گداگری اور مفلسی خود بخود کم ہو جائیگی ـــــ بھک منگوں کی بستی میں کون لے اور کون دے ـــــ مگر انسان مرنے سے رہا ـــــ شاید اُس کی خودداری بیدار ہو جائے اگر پیٹ خالی ہے تو ـــــ جیل بھی تو خالی ہیں ـــــ پیٹ نہیں بھرتے مگر جیل تو بھرے جا سکتے ہیں۔"

"انوار! ـــــ تم بھڑکیلے اور نفیس ملبوس میں انسانیت کے جسم کے داغوں کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتے ـــــ تم پھوڑے کے منہ پر مرہم لگا کر مطمئن ہو گیا یہ نہیں جانتے کہ وہ اندر ہی اندر بڑھتا جا رہا ہے ـــــ"

"میرے دوست! جاؤ ـــــ جاؤ ـــــ جس عمارت کی بنیادیں کھوکلی ہو چکی ہوں وہاں مرمت سے کام نہ چلے گا ـــــ اُسے ڈھا دو ـــــ اور ایک نئی عمارت تعمیر کرو ـــــ"

ـــــ انوار بڑے بڑے دیدے نکالے عجیب وحشت بھری نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھ رہا ہے ـــــ میں کہتا گیا ـــــ

"جاؤ میاں! جاؤ!" اُس نے ٹوپی سر پر رکھی اور دروازے کی طرف چلا۔

"جاؤ ـــــ اور اب بھی اگر نہ سنبھلے تو یہ سمجھ لو کہ وہ زمانہ اب قریب آرہا ہے جب چند دن کی فاقہ کشی کے بعد قید خانے کی کدال اور بیلچے تمہارے لڑکوں کے پیٹ بھرنے کا ذریعہ

بن جائیں گے ـــــ اور بازاری کوٹھوں کی اجڑی ہوئی رونق تمہاری لڑکیوں کی زندگی کا آسرا ہو جائیگی ـــــ" لیکن وہ میرے آخری جملے سننے سے پہلے ہی کمرے سے نکل چکا تھا ـــــ "ہاں! وہ مجھے پاگل سمجھ رہا تھا ـــــ پاگل ـــــ حواس باختہ ـــــ اس لئے کہ میں کھوکل دیواروں پر پلاسٹر چڑھانے کے بجائے اُسے ڈھا دینا چاہتا ہوں ـــــ میں گھوڑا کیا اگر انسان کو بھی خطرناک مرض ہو تو گولی مار دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے مہلک جراثیم دنیا میں نہ پھیلا سکے ـــــ میں سماج کے جسم کے ناسور پر مرہم لگانا نہیں چاہتا میں جسم کا اتنا حصّہ کاٹ دینا چاہتا ہوں ـــــ میں پاگل ہوں ـــــ پاگل ـــــ دیوانہ"

ہم سب کیفے میں بیٹھے تھے ۔ میں ۔ انوار ۔ شاہد ۔ نسیم ـــــ سامنے سڑک سے دنیا گذر رہی تھی ـــــ ایک منظر پر میری نگاہیں جم گئیں ـــــ میرے خیالات نے پھر پلٹا کھایا ـــــ میری آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔ دوستوں نے گھبرا کے ادھر دیکھا ـــــ چند سپاہی ایک نیم عریاں، کمزور، لاغر انسان کو بیڑیوں کا زیور پہنائے لئے جا رہے تھے۔ ـــــ "ارے یہ وہ ہے" انوار نے تیزی سے کہا۔ "کل اُس نے ایک مہاجن کے گھر گھس کر غلّہ چُرایا تھا ـــــ"

"چوری کی تھی، اس نے؟" میں بم کی طرح پھٹ پڑا ـــــ "چوری کی تھی ـــــ اس نے" ـــــ ذرا اس کی طرف دیکھو ـــــ دیکھو ـــــ کیا وہ چوری کر سکتا ہے ـــــ عقلمندو! اسے خود کسی نے لوٹ لیا ـــــ تباہ کر ڈالا ـــــ اُس کی ہستی کو جونک کی طرح چوس ڈالا ـــــ چوری! ـــــ کیا وہ چوری کر سکتا ہے؟ ـــــ"

"تمہارے دماغ کو تو فلسفے کے کرم نے چاٹ لیا ہے" نسیم نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ یہ جو سارا شہر جانتا ہے کہ اُس نے چوری کی تو کیا یہ سب پاگل ہیں؟ ـــــ"

"جی! نہیں ـــــ میں خود پاگل ہوں ـــــ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے ـــــ اُف"

میں نے سر تھام لیا ——— میرے دوست ہنس رہے تھے۔

میں سائبان میں کرسی ڈالے پڑا تھا ——— اختر اور نسیم آگئے۔ شاید بڑے بھائی صاحب نے ان سب لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ میں دن بھر کمرہ بند کئے اندر پڑا بڑبڑایا کرتا ہوں ——— لوگوں کو خیال ہو چلا تھا کہ اگر یہی حالات رہی تو میں بہت جلد پاگل ہو جاؤں گا ——— اے کاش ایسا ہوتا۔

" منروا میں آج بڑی اچھی پکچر ہے ——— ہم تمہیں ضرور ساتھ لے جائیں گے"۔ ان کا اصرار تھا ——— "اور یاد رکھنا اگر وہاں ایسی ویسی حرکت کی تو اس سر میں "نسیم نے میرے بال کھینچتے ہوئے کہا ——— "جتنی گرمی چڑھ گئی ہے سب نکال دوں گا"

اتنے میں ایک قسمت کے مارے اچھے ہٹے کٹے فقیر صاحب کا نزول ہوا۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ جیسے کسی نے مجھے بجلی کا تار چھوا دیا ——— اس نے اپنی تقریر کا پہلا فقرا ——— "حضور صبح کا بھوکا ہوں" ——— دوہرایا ہی تھا کہ میں نے کرسی پر سے کود کر اس کے گال پر تڑاق سے ایک تمانچہ رسید کیا ——— "بھر گیا پیٹ ——— "میں نے دانت پیستے ہوئے کہا ——— "اب خاموشی سے یہاں سے چلے جاؤ ——— ورنہ میں تمہارا سر کچل دوں گا ———"

" یہ کیا حرکت تھی تمہاری ؟" فقیر کے جانے کے بعد نسیم نے غصے سے کہا ——— "کیا اس حرکت سے بھی تمہیں دماغی سکون حاصل ہوتا ہے ؟"

" ہاں ! یقیناً !! ——— تھوڑا سا سکون ضرور ملا" ——— میں کرسی پر دراز ہو گیا ——— "کاش آج سے وہ اپنے میں احساس خودداری اور جذبۂ انتقام پیدا کرلے"

" کیا مطلب تمہارا" نسیم نے تیزی سے پوچھا ——— کیا وہ آج سے اس طرح در، در پھر کر، گڑگڑا کر بھیک نہ مانگے ——— تو کیا چوری کرے ؟ - ڈاکے ڈالے ؟ "

" بس ! بس !! ——— میرا سر نہ کھاؤ ——— "میں نے چیخ کر کہا ——— "وہ کچھ بھی کرے۔

چولھے میں جائے ـــــ اگر ہاتھ پاؤں اور محنت اور مشقت کی تذلیل نہ کرے ـــــ چوری کرے ـــــ ڈاکے ڈالے ـــــ ساری دنیا میں آجکل یہی ہو رہا ہے ـــــ"

ـــــ میں نے تازہ اخبار کھولا ـــــ پہلی ہی خبر سے میرا خون کھولنے لگا اُف! ـــــ اخبار میز پر پٹک کر میں بستر پر لیٹ گیا ـــــ مگر اُس پر تو کانٹے بکھرے ہوئے تھے ـــــ ذرا چین نہیں ـــــ آرام و سکون کا کوسوں پتہ نہیں ـــــ میرے سر میں جیسے گھوڑ دوڑ ہو رہی تھی ـــــ مجھے چکر آنے لگا میں نے محسوس کیا کہ ہزاروں فیٹ کی بلندی سے زمین پر گرا جا رہا ہوں ـــــ آخر میں یہ تکالیف کب تک سہوں ـــــ یہ دکھ کیونکر برداشت کروں ـــــ "کہئے مزاج کیسے ہیں ؟" نسیم اندر داخل ہوا ـــــ " دماغ کا پارہ تو انتہائی بلندیوں پر دکھائی دیتا ہے ـــــ کہیں بھاپ بن کر نہ اڑ جانا ـــــ" اُس نے ہنستے ہوئے کہا کرسی پر بیٹھ کر اخبار پر نظر ڈالی ـــــ زور سے پڑھنا شروع کیا ـــــ پہلی ہی سرخی تھی۔

" کانپور میں ہندو مسلم فساد "

" بس خاموش " میں نے ایک تکیہ اُس کے سر پر کھینچ مارا۔

" کیوں ! کیا دماغ خراب ہو گیا "

میں نے اپنا سر دوسرے تکیے میں چھپا لیا ـــــ کانپور ـــــ ہندو ـــــ مسلمان مر گئے ـــــ زخمی ہو گئے ـــــ گائے ـــــ باجا ـــــ مذہب ـــــ آزادی ـــــ اور معلوم نہیں کیا کیا ؟" ـــــ میرے دماغ میں خیالات کا دریا پوری روانی پر بہا جا رہا تھا۔

نسیم نے دوسری سرخی پھر زور سے پڑھی : ـــــ

" لکھنؤ میں شیعہ سنی میں پھر فساد ہو گیا "

دوسرا تکیہ زور سے نسیم کے سر پر پڑا ـــــ واقعی میں پاگل ہو گیا۔

"جاؤ ـــــ نکل جاؤ کمرے سے باہر ـــــ نکل جاؤ ـــــ فوراً نکل جاؤ ـــــ اسیوقت

نکل جاؤ" ——— یہ چیختے ہوئے میں نے گلدان ہاتھ میں اٹھایا ———

.... اف! حد ہو گئی ——— میرے خیالات مجھے چین نہیں لینے دیتے ——— عجیب عجیب خیالات دماغ میں گشت کرتے رہتے ہیں ——— اور کبھی کبھی تو ایسا جی چاہتا ہے کہ میز پر رکھی ہوئی تمام کتابوں کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ اس قدر باریک باریک ٹکڑے کہ وہ ہوا میں اڑتے ہوئے دنیا کے مختلف گوشوں میں پہنچ جائیں ——— نہیں جلا کر راکھ کر دینا چاہئیے ——— نہ کوئی انہیں دیکھ سکے ——— نہ پڑھ سکے ——— نہ کسی کی طبیعت پریشان ہو ——— نہ لوگ دیوانگی کا الزام دیں۔

غزل

جناب شکیل بدایونی

دل ہی سوزِ دروں سے جل جاتا　　کوئی ارمان تو نکل جاتا
ہے جو سب کچھ تو دل نہیں لگتا　　کچھ نہ ہوتا تو دل بہل جاتا
ہم خوشی سے جو تیرا غم سہتے　　غم کا عنوان ہی بدل جاتا
تم نگاہیں چرا چرا لیتے　　رنگِ محفل بدل بدل جاتا

صحبتِ شامِ میکدہ کے نثار
کاش یہ دن ابھی سے ڈھل جاتا

غزل

جناب منظور حسین شور (علیگ)

ناکام آرزو کا ہے مختصر فسانا — روتی رہیں وفائیں ہنستا رہا زمانا
کہتے رہے ابھی تک اپنا ہی ہم فسانا — کل داستاں ہماری دہرائیگا زمانا
ہے ہر نظر میں پنہاں اک درد کا فسانا — آنکھوں سے اشک ٹکرائے غم ٹپک نہ جانا
اشکوں سے بھی تجھے آگے اے غم قدم بڑھانا — اِن منزلوں پہ ظالم! آکر ٹھہر نہ جانا
رم خوردہ جنوں کی منزل کا کیا ٹھکانا — منزل کو بھی تو ہم نے منزل کبھی نہ جانا
سرشار ہیں فضائیں بدمست ہے زمانا — مطرب رباب لینا! ساقی سبو اٹھانا!

اے شور اب یہ میرا دستور ہو گیا ہے
ہر کش مکش میں ہنسنا، ہر غم میں مسکرانا،

غزل

جناب اصغر شعری بھوپالی

یوں اُن سے ربط وضبط بڑھاتا چلا گیا — خود کو بھی درمیاں سے ہٹاتا چلا گیا
جتنا میں اس سے آنکھ چراتا چلا گیا — اتنا ہی وہ مجھے نظر آتا چلا گیا
جلوے کی وسعتوں کو بڑھاتا چلا گیا — دل کو بھی میں نگاہ بناتا چلا گیا
محسوس ہو سکی نہ تجلی جمال کی — کچھ اسطرح وہ مجھ میں سماتا چلا گیا

تنہا روی سے کام لیا میں نے عشق میں
نقشِ قدم بھی اپنا مٹاتا چلا گیا

شہنشاہِ ایران

اَنسہ عائشہ بلقیس عربی۔ اے فائنل

رضاشاہ پہلوی کی ولادت کو تقریباً ۶۶ سال گذر چکے ہیں۔ صحیح تاریخ پیدائش وجائے ولادت کا کسی کو علم نہیں۔ یہ شہنشاہ چالیس سال کی عمر تک ایک غیر معروف معمولی افسر کی زندگی بسر کرتا رہا جب پچاسویں سال میں قدم رکھا تب بادشاہ منتخب ہوا تعلیم حاصل کرنیکا وقت اسے بہت کم ملا۔ بچپن میں کسان لڑکوں کی طرح گلہ بانی کرتا اور جھونپڑے میں رہتا تھا آغاز شباب میں ہی وہ ایرانی فوج کے ایک ایسے دستہ میں شامل ہوگیا جس کے افسر روسی تھے۔ کمزور ایران اندنوں ٹھگوں اور لٹیروں کا عرصۂ پیکار بنا ہوا تھا۔ شمالی علاقہ روسی غلبے کے زیر اثر تھا۔ جنوب میں ایرانی بندوقچین برطانوی افسروں کے ماتحت کارفرما تھیں۔ طہران میں سویڈن کے سپاہی قیام امن کی کوششوں میں مصروف تھے۔ الغرض رضاشاہ کی سپاہیانہ زندگی کے ابتدائی بیس سال اس قسم کی سیاسی فضا میں بسر ہوئے۔ بالآخر وہ ایک افسر کے عہدہ پر تعینات کردیئے گئے۔

دوران جنگ میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایران کو اس کی اصطلاحی غیر جانبداری کے باوجود برطانیہ اور روس ملکر ہڑپ کرجائیں گے۔ لیکن بالشویکی انقلاب اتحادیوں کی دخل اندازی کا باعث ہوا۔ اور سنہ ۱۹۲۰ء تک برطانیہ نے ملک پر اپنا اچھا خاصا اقتدار قائم کرلیا۔ ایک برٹش کرنل نے رضا کو ایک ہمت ور پُرخلوص سپاہی سمجھکر منتخب کرلیا اور کاسک فوج کا افسر مقرر کردیا۔ اگر یہ عہدہ نہ ملتا تو شاید رضا کی زندگی تاریکی اور عدم شہرت میں ہی گزر جاتی۔

جب برطانیہ اور روس ایران سے علیحدہ ہوگئے تو طہران میں طوائف الملوکی کا

دور دورہ ہوا اور ملک بھر میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا۔ اس زمانے میں حکومت کی باگ ڈور احمد شاہ جیسے نابکار شخص کے ہاتھ میں تھی۔ یہ رعایا کے مفاد سے بادشاہی نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ کوتاہی برتنے والا تھا۔ لوگوں نے اسے شاہی بنئے کا خطاب دیا تھا کیونکہ ایک دفعہ قحط کے زمانہ میں اس نے ملک بھر کے غلّہ کی فصل خرید کر غریب قحط زدہ فاقہ کش رعایا کے ہاتھ بہت گراں قیمت پر غلہ فروخت کیا تھا۔

اس کے بعد ایک ایسا اہم واقعہ پیش آیا جس کی مثال ایران کی تاریخ میں چنگیز خاں کے بعد سے نہیں ملتی۔ چند نوجوانوں نے طوائف الملوکی کا خاتمہ کرنے کا ایک عجیب و غریب ذریعہ سوچا۔ رضا کو انہوں نے اپنا عسکری معاون منتخب کیا۔ اس نے ۲۵۰۰ آدمیوں کی مدد سے ۱۹۲۱ء میں ۲۰ فروری کی رات کو طہران پر بلا قتل و غارت کے اپنا پورا قبضہ جما لیا۔ ایک نئی وزارت کا اعلان کیا گیا اور رضا کو فوج کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔

جلد ہی اس نے حکومت کے حلقہ میں کافی اقتدار حاصل کر لیا اور کئی برس کے بعد پارلیمنٹ میں احمد شاہ کو تخت سے معزول کر دینے کی تجویز منظور کر دی ۲۵ اپریل ۱۹۲۶ء کو سابق عسکری معاون رضا شاہ پہلوی سلطنت ایران کے تاج سے سرفراز کئے گئے۔ انہوں نے اپنے لئے نیا تاج بنوایا اور نپولین کی طرح اسے خود ہی اپنے سر پر رکھا۔ شہنشاہ کی شکل صورت اور وضع قطع بہت با اثر ہے بڑی بڑی سفید مونچھوں پر رعب چہرے اور چوڑے کندھوں سے شاہی وقار ٹپکتا ہے۔ سپاہیانہ طبع اور تنظیمی رعب داب نے انہیں عوام کی نظروں میں ایک عجیب شان اور عظمت بخشی ہے۔

ایران کی رعایا مقروض نہیں ہے۔ شکر۔ چائے۔ نمک۔ افیون کی تجارت غیر ممالک کے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن یہ تمام روپیہ عوام ہی کے مفاد کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کو رعایا کی بہتری و بہبودی کا اتنا خیال رہتا ہے کہ حال ہی میں اُنہوں نے اپنا ذاتی زر و مال بھی ملک کی نذر کر دیا۔

شہنشاہ سخت محنت کے عادی ہیں۔ صبح پانچ بجے بیدار ہوتے ہیں ہر اعلیٰ افسر کسی وقت بھی دن ہو یا رات شاہ کے حضور میں طلب کیا جا سکتا ہے۔ وزارت کی مجالس میں وہ اپنے کارکنوں

ہمت افزائی کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کے قلوب میں اپنے سپاہیانہ جوش کی روح پھونکنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ انہیں محنت کرنے اور ایران پر فخر کرنے کا سبق سکھاتے ہیں۔

شہنشاہ کو ایران کا سب سے بڑا زمیندار خیال کیا جاتا ہے۔ اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں انہوں نے فتنہ خیز زمینداروں کی طاقت توڑنے کا عہد کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کی جائدادوں کو اپنے قبضہ میں لا کر اس ارادہ میں باسانی کامیاب ہوئے۔ ایران میں سفر کے ذرائع اور مسافروں کی سہولت کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہیں۔ اکثر سرائیں اور قیام گاہیں شہنشاہ کی ذاتی ملکیت ہیں وہ ذرائع سفر کو ایک نظام کے ماتحت لانا چاہتے ہیں تاکہ بیرونی مسافروں کو کسی قسم کی تکلیف یا وقت نہ ہو۔ وہ کبھی کسی کو مدعو نہیں کرتے اور کوئی ان کا ذاتی یا شاہی مہمان بنکر ان کے یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ نہ آسانی سے ان تک رسائی ہو سکتی ہے۔ صرف ایک غیر ملکی اخبار نویس کو ان سے حسب خواہش ملاقات کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ ان کے راز دان بہت کم ہیں۔ احباب بھی معدودے چند ہیں۔ وہ رعایا کے ساتھ مساوات برتنا چاہتے ہیں کسی ایک جگہ پر ایک ہی افسر کئی برس تک نہیں رہ سکتا۔ غالباً وہ دنیا کے سب سے بڑے خلوت پسند اور گوشہ نشین مدبروں میں سے ہیں۔ شہنشاہ اکثر ایسے لباس میں اپنے ملک کے حالات کا معائنہ کرنے کے لئے سفر کرتے ہیں جس پر گولہ یا بارود کا اثر نہیں ہو سکتا۔ ان کے ساتھ ہمیشہ سفر میں سولہ موٹریں رہتی ہیں اور ہر اس سڑک پر جو ان کے استعمال میں آتی ہے ایک روز پہلے سے بندش لگا دی جاتی ہے۔ ہر اس گاؤں کے لئے جہاں وہ دوران سفر میں ٹھہرتے ہیں قانوناً لازم ہے کہ مکانات پر سفیدی کی جائے اور چوبی جنگلوں کو سبز رنگا جائے۔ ان کی آمد کے موقع پر اسکول کے بچّوں کو نئی وردیاں ملتی ہیں اور کئی دن پیشتر سے قواعد سکھا کر تیار رکھا جاتا ہے۔ شہنشاہ اپنی زندگی میں صرف ایک بار ایران سے باہر تشریف لے گئے ہیں۔ یعنی غازی مصطفٰے کمال اتاترک سے شرف نیاز حاصل کرنے کے لئے۔ جن کے طرز حیات نے ان کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا۔ انہوں نے ملک کے متعدد شہروں کے نام بدل دیئے ہیں۔ تقریباً بیس شہر ان کے منتخب کردہ ناموں سے موسوم ہیں۔

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے انہوں نے ملک کا نام ہی بدل دیا ہے۔ یعنی فارس سے ایران کر دیا ہے۔ اس لئے کہ فارس اصل میں محض ایک مختصر صوبہ کا نام ہے۔ اور ایران ایک نہایت وسیع خطہ کا نام ہے یعنی ترکی سے لیکر افغانستان تک کا حدب عظیم۔

شہنشاہ کی خانگی زندگی کے متعلق معلومات محدود ہیں۔ وہ کئی شادیاں کر چکے ہیں۔ اور سات بچوں کے باپ ہیں۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے محمد رضا کے لئے فرائض حکومت کی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کیا گیا ہے شہنشاہ نے اسے سوئیزرلینڈ کے ایک اعلیٰ مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ اس کے بعد فوجی تربیت دلوائی۔ اور اب ہر جگہ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ سیاسی پہیوں کی گردش کا مشاہدہ کرکے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی اہلیت حاصل کر سکے شہنشاہ کی دو لڑکیاں ہیں ان کی شادیاں سیاسی مفاد کو مدِنظر رکھ کر کی گئی ہیں۔

ڈاکہ زنی ایران میں صدیوں سے مختلف صوبوں کے امن وامان کے لئے ایک مستقل خطرہ کی صورت اختیار کئے ہوئے تھی شہنشاہ نے ابتدائے حکومت میں اس کا انسداد کرکے خطرہ کو دور کر دیا۔ انہوں نے ملک میں کئی نئی سڑکیں بنوائی ہیں اور نئے بندرگاہ تعمیر کرائے ہیں۔ عسکری نظام میں تو نئے سرے سے زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ بہت سی نئی فوجیں جدید قواعد پر مرتب کی ہیں شہنشاہ تعلیم کے بہت حامی ہیں۔ ملک میں زیادہ سے زیادہ درسگاہیں قائم کی ہیں۔ مخلوط تعلیم کو مفید سمجھ کر رواج دینے میں کوشاں ہیں معمّر لوگوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے۔ انہوں نے جدید تجارتی اور تعزیراتی نظام قائم کئے اور اس طرح مذہبی عدالتوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے جدید طبی مکتبوں میں علم تشریح کی اجازت دیدی ہے۔ جو ایران کی تاریخ میں پہلی مثال ہے شادی کے متعلق یہ قرار دیدیا کہ شادیاں اور طلاق محض رسمی ہی نہیں بلکہ قانونی بھی ہیں۔ ملاؤں نے غضبناک ہوکر ان اصلاحوں کا سختی سے مقابلہ کیا لیکن انہیں آسانی سے زیر کر لیا گیا۔

وہ خواتین کی آزادی کے بہت حامی ہیں۔ چنانچہ انہیں اجازت ہے کہ وہ طعام گاہوں اور عام دلچسپی و تفریح طبع کے مقامات سے فائدہ اٹھا سکیں اور زندگی کے عام کاروبار میں مردوں کے دوش بدوش رہ سکیں۔ لڑکیوں کے نکاح کے لئے کم از کم پندرہ سال کی عمر قانوناً مقرر کی۔ خواتین کو حق دیا گیا کہ اپنے شوہروں سے طلاق لے سکیں۔ انہوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ خواتین کو نقاب پوشی سے باز رکھنے کی کوشش کی چنانچہ ملکہ بے نقاب ہو کر عوام کے سامنے آگئیں۔ شہنشاہ نے طہران کی بہترین سڑکوں اور خرید و فروخت کے مرکزوں کو عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ تاکہ وہاں بے نقاب ہو کر گھوم سکیں۔

شہنشاہ کی خارجی حکمت عملی عام فہم اور روایات کے مطابق ہے۔ یعنی روس اور برطانیہ کو ایک دوسرے کے خلاف لڑاتے رہنا۔ اس لئے کہ روسی اور برطانیہ ایران میں کچھ نہ کچھ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور رضا شاہ ان کے راستہ میں حائل نہیں ہوتے۔

ایران میں حال ہی میں ایک نئی ریلوے لائن تعمیر ہوئی ہے۔ جو بحر خزر اور خلیج فارس کو ملاتی ہے۔ یہ موجودہ شہنشاہ کے دور حکومت کا شاہکار ہے۔ اس کی تجارتی اور فوجی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ایران کے پاس اس سے قبل کوئی ریلوے لائن نہ تھی اس لئے کہ ساخت کی مشکلات تقریباً ناقابل تسخیر تھیں۔ ایک ہزار لمبی لائن دو پہاڑوں کو جو ۱۰۰ میل چوڑے ہیں پار کرتی ہے۔ اور ایک ایسے صحرا سے گزرتی ہے جس میں آمدورفت کے ذرائع اب تک ناپید اور غیر ممکن تھے۔ اس لائن کی تعمیر میں ۱۵ کروڑ ڈالر صرف ہوئے ہیں لیکن اس [illegible] وہ اخراجات شامل نہیں جو دو نئے شہروں کی تعمیر میں صرف ہوئے ہیں۔ یہ شہر لائن کے [illegible] یہاں جس کی ایک ایک پائی ایران نے خود ادا کی ہے۔ باہر کے کسی ملک سے قرض [illegible] کا خاتمہ کر دیا اور ملکی تجارت [illegible]

قطعات

جناب اختر انصاری بی اے (آنرز) بی۔ ٹی (علیگ)

آرزو

دل کو برباد کئے جاتی ہے　　غم بدستور دئے جاتی ہے
مر چکیں ساری امیدیں اختر　　آرزو ہے کہ جئے جاتی ہے

حسرت

کون سی شے تمہاری نذر کروں　　آہ اے صبح و شام کوہ مری
مجھ تہی دست زندگی کے پاس　　اک جوانی ہے وہ بھی درد بھری

رقاصہ

کر دیا حافظے میں حشر بپا　　اور ماضی میں زندگی بھر دی
انگلیوں کو فضا میں لہرا کر　　تو نے اک داستاں رقم کر دی

چاندنی رات

چاند پگھلی ہوئی سرد آگ سی برساتا ہے　　یا زمانے کو فلک نور میں نہلاتا ہے
آج کی رات ہے اس قہر کی رنگیں اختر　　کہ مجھے اپنی جوانی پہ ترس آتا ہے

ساقی نامہ

جناب محمد حسن جعفری (علیگ)

ساقی نامہ اقبال کے بال جبرئیل کا شاہکار ہے۔ بال جبرئیل میں اس کی وہی حیثیت ہے جو جسم میں روح کی ساقی نامہ ہماری شاعری میں فارسی شاعری ہی سے آیا ہے۔ اس کی حیثیت ایک صنف کی سی ہے۔ اس صنف یا عنوان کے تحت عموماً ہماری شاعری میں مے ومیخانہ، موج ومینا، اور رندی ومستی کی محفلیں آراستہ کی گئی ہیں یا حسن وشباب اور رنگ و بو کی داستانوں سے صفحے کے صفحے رنگے گئے ہیں۔ بعض قدیم ساقی ناموں میں شراب یا حسن وعشق کے پردہ میں تصوف کے مسائل کی ترجمانی بھی کی گئی ہے۔

اس صنف میں ساقی سے تخاطب کے دو وجوہ سمجھ میں آتے ہیں۔ اول یہ کہ فارسی اور اردو شاعری دونوں کا یہ روائتی انداز ہو گیا ہے کہ بار بار ساقی کو پکارا جاتا ہے۔ دوسرے اس میں یہ رعائت مدنظر ہے کہ شراب جذبات وکیفیات میں شدت پیدا کر دیتی ہے۔ اور شاعر چاہتا ہے کہ اپنے جذبات کو چاہے وہ شراب کے متعلق ہوں یا حسن وشباب یا الٰہیات سے وابستہ ہوں انتہائی جوش سے پیش کرے اور اس غرض سے وہ اوّل شراب کا خواہاں ہوتا ہے۔

اقبال کے ساقی نامہ میں میخانہ بھی، پیمانہ بھی، مینا و قلقلِ مینا بھی ہے۔ اور ان سب کی روح بھی یعنی شراب لیکن اسکی شراب شراب خودی ہے جو جسم بے جان میں جان ڈالتی ہے۔ انسان کی سوئی ہوئی قوتوں کو ابھارتی ہے دل کی ڈوبتی ہوئی نبضوں کو پھر سے متحرک کر دیتی ہے اور دماغوں سے وہ پردا ہٹا دیتی ہے جس نے اس سے سوچنے سمجھنے کی قوت چھین لی ہے۔

اقبال کے کلام کو عموماً تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ فطرت نگاری، وطنیت اور اسلامیات ساقی نامہ اقبال کے آخری دور (اسلامیات) کی یادگار ہے۔ لیکن اس میں ان کے ابتدائی دور

(فطرت نگاری) کو بھی ہم واضح دیکھتے ہیں۔ ساقی نامہ کی ابتدا ہی فطرت نگاری سے ہوتی ہے ؎

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

یہ اشعار منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے پس پردہ اقبال کی روحانی قوت کام کر رہی ہے۔ دوسرے شعرا کی منظر نگاری اور اقبال کی منظر نگاری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقبال نیلی نیلی پر سرور فضا میں طیور کو اڑتا دیکھ کر عارضی خوشی نہیں حاصل کرتا، جوئے کہستاں کو ناگن کی طرح لہراتے دیکھکر اُس کے دل و دماغ میں کسی محبوبہ کی کاکلِ پیچاں کا تصور نہیں آیا بلکہ اسکی روانی سے زندگی کو حرکت کا مرادف سمجھا ؎

ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

اس فطرت نگاری اور رنگ و بو کے پردے سے اقبال کے پیام کا سرچشمہ شروع ہوتا ہے۔ زندگی کی طرف اُس کی توجہ منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اب وہ زندگی اور اس کے مسائل کو فلسفہ اور شعر کے امتزاج کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔

فلسفہ ایک خشک چیز ہے جس سے عام دماغ الجھن محسوس کرتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ فلسفہ کا آغاز ہی الجھن، سوچ بچار یا حیرت سے ہوتا ہے۔ شعر کے ساتھ اس کی ہم آہنگی اجتماعِ ضدین سے کم نہیں لیکن اقبال نے ان دونوں کو اس طرح شیر و شکر کیا ہے کہ یہ محال ممکن ہو کر آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔

فلسفہ اور شعر کے متعلق ڈاکٹر عابد لکھتے ہیں۔ "فلسفہ حقیقت کی خشک اور بے جان تعبیر ہے! اور شعر اس کی زندگی سے جھلکتی ہوئی تفسیر۔ فلسفی صورتِ کائنات کا ذہنی ادراک کرتا ہے اور اپنے ادراکات کو مجرد تصورات میں بیان کرتا ہے جو ہماری لوحِ فکر پر درج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور

شاعر نبض کائنات کی تڑپ قلب حیات کی دھڑکن کو محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے احساسات کو متحرک نقش اور نغمے میں ادا کرتا ہے۔ جو ہمارے دل میں اتر کر خون کے ساتھ گردش کرنے لگتے ہیں، اقبال کی شاعری کو فلسفیانہ شاعری کہنے کے یہ معنی نہیں کہ اس میں صرف حکمت کے ٹھوس اور خشک نظریات کے سوا کچھ نہیں اس کی شاعری میں زندگی کا سوز و ساز بھی ہے اور حرکت و عمل کا درس بھی۔

عابد صاحب فرماتے ہیں " جب شعر کے لئے فلسفہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو فلسفہ کی صرف ایک صفت مدنظر ہوتی ہے۔ یعنی موضوع کی کلیت اور ہمہ گیری۔ اقبال کا کلام فلسفیانہ اسی معنی میں ہے کہ وہ ایک کلی تصور حیات پیش کرتے ہیں۔ ان کا موضوع فرد اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے۔ جسے ہم فلسفہ تمدن کہہ سکتے ہیں، اقبال کے کلام میں فلسفہ اور شعر کا تعلق یہی ہے۔

فلسفیانہ تصور حیات کے ساتھ ساتھ اس کے طرز بیان میں وہی رنگینی، چاشنی، تڑپ اور سوز و گداز موجود ہے۔ جو دوسرے شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اور جن کا گہرا تعلق رومانی دنیا سے ہے۔ چنانچہ ساقی کو دیکھ کر ان کے دل میں بھی امنگ اٹھتی ہے۔ اگرچہ ان کی شراب اور ہے لیکن طرز تخاطب میں وہی رومانیت اور رنگینی ہے ؎

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز　　　کہ آتی نہیں فصل گل روز روز

اب اس مے کی تعریف بھی اقبال ہی کی زبان سے سن لیجئے ؎

وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات　　　وہ مے جس سے ہے مستی کائنات
وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل　　　وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے　　　لڑا دے ممولے کو شہباز سے

آخری مصرع میں حرکت اور قوت جس کو اقبال زندگی کا اساس سمجھتا ہے اس کی تلقین کتنے لطیف پیرایہ میں کی ہے۔ ان مراسل کے بعد وہ اصل موضوع پر آیا ہے اور اپنا نظریہ حیات اور

فلسفہ خودی پیش کیا ہے۔

فطرت نگاری کے اس پس منظر کے بعد اصل موضوع کی تمہید کے لئے تغیرات زمانہ کی طرف اشارات کئے ہیں ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش راز فرنگ — کہ حیرت میں ہی شیشہ باز فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر وسلطان سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا

زندگی کے مسائل سے بحث کرنے کے لئے یہ تمہید نہایت موزوں اور ضروری تھی۔ انقلاب زمانہ کی اس سے بہتر تصویر ایسے سادہ الفاظ میں کھینچ دینا اقبال کا کمال فن ہے۔ اور اس تصویر میں رفتار زمانہ کا غائر مطالعہ جھلکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نظم کے مطالعہ سے اقبال کے حیات اور خودی کے تصورات اور اخلاقی و معاشرتی اصولوں کی تعلیم کو پوری طور سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس آئینہ میں عشق، زندگی اور خودی سبھی کچھ موجود ہے۔

اس کے بعد اقبال کی نظر مسلمانوں کی گمراہی کی طرف گئی اور اس نے ان توضیحات کو غلط بتایا ہے جو ایرانی فلاسفہ اور ہندوستانی صوفیہ نے مسئلہ وحدت الوجود کے تعلق میں کی ہیں۔ اور جن کے ذریعہ ایسی روایات اور اعتقادات اسلام کا جز بن گئے ہیں جو قطعاً غیر اسلامی ہیں۔ دولت عباسیہ میں اسلامی تعلیم و تصوف میں فلسفہ کا امتزاج صحیح معنوں میں ابن عربی کے ہاتھوں ہوا۔ یہ عنصر تھوڑے ہی عرصہ میں کافی تقویت پا گیا۔ چنانچہ ملا جامی کی لوائح اچھی خاصی فلسفیانہ تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ ہندو مذہب کے آتما کے فلسفہ اور بدھ مت کے نروان کے مسئلے نے اپنا اثر ڈالا عیسائی مذہب کے اثر سے راہبانہ زندگی اور خانقاہ کا تصور اسلام میں داخل ہوا۔ قلندر اور سدا سہاگن راہبوں کی زندگی کا نمونہ ہیں انھیں غیر اسلامی اجزا کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے ؎

تمدن تصوف شریعت کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

اقبال کے اس تمام فلسفیانہ پیام پر اسلامیات کا گہرا رنگ ہے۔ اسے مغربیت سے انتہائی نفرت ہے اسے یہ موجودہ تہذیب و تمدن نہیں بھاتا۔ وہ اسی اسلامی معاشرت اور اسی جذبہ اسلامی کو پھر دیکھنا چاہتا ہے چنانچہ سے نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس تہذیب کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا

وہ اس اسلامی روح کو تلاش کرتا ہے جس نے خیبر شکن ایسی ہستیاں اور صدیق ایسے برگزیدہ بندے اور فاروق ایسے جری اور بہادر انسان پیدا کئے۔

قبل اس کے کہ فلسفہ حیات و خودی پر بحث کی جائے اقبال کے پیام کی وسعت پر ایک نظر ضروری ہے۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اقبال کے پیش نظر کل بنی نوع انسان نہیں بلکہ صرف مسلمان ہیں۔ اور ان کا خطاب صرف مسلمانوں سے ہے۔ ان کی زندگی کے نظریات اور تہذیب و تمدن کے بنیادی اصولوں سے صرف مسلم افراد ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور وہ جس زندگی کا نصب العین پیش کرتے ہیں وہ صرف ایک ہی ملت اور فرقہ کے لئے ہے۔ اور یہ ان لوگوں کے نزدیک اقبال کی تنگ نظری اور بہت بڑی نفسیاتی کمزوری ہے۔ اقبال نے اسلامی فلسفۂ زندگی اور اس کے نادر و نایاب اخلاقی و معاشرتی اصولوں کو آئیڈیل (Ideal) قرار دیا ہے۔ اسلام خود تمام بنی نوع انسان کے لئے آیا تھا نہ کہ کسی خاص فرقہ یا کسی خاص گروہ کے لئے۔ اس لئے اس کا فلسفہ زندگی بھی ہر اس زندہ ہستی کے لئے تھا جو اپنے کو انسان کہے۔ سر تیج بہادر سپرو مولانا عبدالحق کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بڑی بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر ہے۔ یہ کہنا اس کے دائرۂ اثر کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفۂ اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہکر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا یا کالیداس کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا اسکے اثر کو نہ محدود کیا اور نہ دوسرے مذہب کے آدمیوں نے اس کی قدر میں کمی کی۔ اگر وہ اسلامی تاریخ کے بڑے بڑے کارناموں کے بارے میں یا اسلامی عظمت کا تذکرہ کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم اس کی قدر دانی نہ کریں۔" اس بنا پر اقبال کے پیغام کو محدود نہیں کہا جا سکتا۔ وہ فی الحقیقت اپنے پیش کردہ تصور حیات و خودی کو جو بلا شبہ اسلامی تعلیم کا بڑی حد تک مرہون منت ہے صحیح محسوس کرتا ہے۔ کل عالم کو اس طرف چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ کوئی بھی پیغام ہو لیکن وہ کسی نہ کسی مخصوص مسلک پر ضرور اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ دنیا کا کوئی شاعر یا آرٹسٹ ایسا نہیں گزرا جس نے اپنا پیغام کسی خاص پلیٹ فارم سے نہ دیا ہو۔ اس قسم کے اعتراضات سے شاعر یا آرٹسٹ کے خلوص کو مجروح کرنا خود معترضین کی تنگ نظری اور نفسیاتی کمزوری کہی جا سکتی ہے۔

اب ان کے ان نظریات پر نظر ڈالنی چاہیئے جن کو اقبال نے اپنی نظم میں شعریت کے لباس میں پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے اس نے عشق کو سمجھایا ہے، پھر زندگی اور ارتقاء سے بحث کی ہے۔ پھر خودی کی پنہاں قوتوں کو بیان کیا ہے۔ اس جگہ ہمیں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ اقبال کے تمام فلسفہ پر اگر ایک طرف اسلامی مفکرین بالخصوص جلال الدین رومی کا اثر ہے تو دوسری طرف مغربی مفکرین خصوصاً نطشے کا اثر نمایاں ہے۔

اقبال کی شاعری میں عشق و عقل کا تقابل ہر جگہ موجود ہے۔ وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے اس بارہ میں وہ رومی اور نطشے دونوں کا ہم خیال ہے۔ دونوں جذباتی اور جمالیاتی کیفیات کو استدلال پر فوقیت دیتے ہیں جس طرح رومی اور نطشے موسیقی کو استدلال پر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح اقبال شعر کو خشک فلسفہ پر۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد

بڑی حد تک عشق پر رکھی ہے ؎

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینوں میں بیدار کر

یہاں یہ فرق یاد رکھنا چاہیئے کہ اقبال نطشے کی طرح جذباتی کیفیات کو صرف عالم امکان تک محدود نہیں رکھتا۔ وہ خدا کا بھی قائل ہے اور اس کا جذبہ عشق عالم امکان کے ساتھ ساتھ اسے خدا سے بھی وابستہ کرتا ہے لیکن یہاں رومی کی طرح وہ ذات میں محو ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ وہ عشق کے پہلو کو ارتقائے انسانی کا پہلو سمجھتا ہے۔ وہ اس عشق کے جذبہ کو نوجوانوں میں محکم دیکھنا چاہتا ہے ؎

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے

زندگی کو اقبال حرکت، عمل اور جد و جہد سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ اس کو فانی اور زوال پذیر نہیں سمجھتا بلکہ اسے ابدیت سے معمور پاتا ہے ؎

دما دم رواں ہے یم زندگی — ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

انسان کی انفرادی زندگی مٹ جانے والی ہے لیکن زندگی بالذات ختم ہونے والی نہیں۔ ارتقائے حیات کی کوئی منزل مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اقبال، نطشے اور رومی تینوں، اس کے قائل ہیں۔ لیکن نطشے نے اپنے حیات اور ارتقائے حیات کی بنیاد ڈارون کے نظریہ پر رکھی ہے اس کے نزدیک آنے والا انسان موجودہ انسان سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا موجودہ انسان کیڑے مکوڑے سے ہے۔ اس کا یہ نظریہ انسانی نصب العین کے لئے بہت حوصلہ افزا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ دوسری طرف زندگی کی تکرار کا نظریہ بھی رکھتا ہے۔ یعنی زندگی اپنے کو دہراتی ہے، جس حالت سے زندگی گزر چکی ہے اس حالت سے پھر گزرے گی۔ انسان جس

منزل سے گزر چکا ہے اسے اس منزل سے پھر گزرنا ہے۔ ارتقا اور تکرار کا یہ تناقض نطشے کے نظریہ کو مہمل بنا دیتا ہے۔

جہاں تک ارتقا کا تعلق ہے رومی اور اقبال نطشے کے ساتھ ہیں اور تکرار حیات میں نطشے کے مخالف۔

اقبال کہتا ہے ؎

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں　　　کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

رومی کہتا ہے ؎

مُردم از حیوانی و آدم شدم　　　پس چہ ترسم من ز مردن کم شدم

ارتقا کے مسئلے میں بھی رومی اور اقبال نطشے سے اس حد تک مخالف ہیں کہ نطشے میں برگساں کی دہریت موجود ہے۔ اقبال نے برگساں کی دہریت اور اسلام کی توحید کو ملا کر ارتقا کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ برگساں ارتقائے حیات کا قائل ہے۔ لیکن وہ اس ارتقا کی علت کسی پس پشت قوت کو نہیں سمجھتا بلکہ خود آپ کو بالذات آمادۂ ارتقا سمجھتا ہے۔ اقبال جہاں تک حیات کو مائل ارتقا سمجھنے کا سوال ہے برگساں کے ساتھ ہے لیکن اس ارتقا میں ایک پنہاں قوت کا ہاتھ تسلیم کرتا ہے۔ یہی پنہاں قوت اس کے نزدیک ذات باری تعالےٰ ہے۔

اقبال نے خودی کے وہ معنی نہیں کئے ہیں جو عام طور سے رائج ہیں وہ "اسرار خودی" کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ "یہ لفظ بمعنی زور نہیں استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا یقین ذات ہے۔" چنانچہ اس بنا پر قبال نے خودی کے مختلف خوبصورت محل تیار کئے ہیں ؎

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات　　　خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
ازل سے یہ ہے کشمکش میں اسیر　　　ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے　　　فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اقبال کے نزدیک خودی کا استحکام یہ ہے کہ انسان اپنے طبعی ماحول سے جنگ کرتا ہے عابد صاحب کے الفاظ میں اسے یوں سمجھئے "وہ ہمیشہ اپنے لئے نئے نئے مقاصد متعین کرتا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے۔ اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا اپنی راہ سے رکاوٹ کو دور کرنا اور مشکلات کا مقابلہ کرکے ان پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اسطرح سے اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی جاتی ہیں اور اس کے سینہ میں خودی کی آگ مشتعل ہوتی جاتی ہے۔"

اقبال نے خودی کے تین مدارج بتائے ہیں:۔

"مرحلۂ اول را اطاعت، مرحلۂ دوم را ضبطِ نفس، مرحلۂ سوم را نیابت الٰہی نامند" خودی اسکے نزدیک حد اطاعت اور ضبطِ نفس کے مراحل طے کرکے نیابت الٰہی کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو انسان مسخر کائنات ہو جاتا ہے۔ لیکن اس زمان و مکان کی تسخیر ہی خودی کی آخری منزل نہیں بلکہ وہ اس کو پہلی منزل سمجھتے ہیں ؎

خودی کی یہ ہے منزل اولین — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسم زماں و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کے تمام فلسفہ پر دائرہ کھینچے ہوئے ہے۔ اس تصور میں بھی وہ رومی اور نطشے سے متاثر نہیں تسخیر کائنات اور علوئے آدم کے تینوں قائل ہیں۔ لیکن ایک فرق یاد رکھنا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ نطشے کے یہاں جلال کا پہلو غالب ہے اور رومی کے یہاں جمال کا۔ اقبال نے جلال اور جمال دونوں میں توازن پیدا کر دیا ہے۔

علوئے آدم کا تصور جو خودی کے سلسلہ میں ہے تینوں میں پایا جاتا ہے اس میں آپس میں ذرا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ نطشے خدا کا قائل نہ تھا۔ اور مذہب کو دشمن خودی تصور کرتا ہے اس کی نظر صرف فطرت اور انسانی محکمات تک ہے۔ برخلاف اس کے رومی اور اقبال

دونوں کے یہاں خدا بھی موجود ہے۔ اس سلسلہ میں یہ جملہ بہت مشہور ہے اور فی الواقع صحیح بھی۔ رومی کا مرد عارف' نطشے کے فوق البشر سے مل کر اقبالی انسان بن گیا ہے۔

اقبال اور رومی نے جہاں خودی کا تعلق خدا کے ساتھ بتایا ہے وہاں ان کے تصورات میں تھوڑا فرق ہو جاتا ہے۔ رومی کے نزدیک خودی جب خدا سے ملتی ہے تو انفرادیت انسانی قائم نہیں رہتی اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے قطرہ دریا میں مل جائے۔ اقبال وصل کا قائل نہیں۔ ان کے یہاں جو وصل ہے وہ ایک خاص حالت ہے جس میں اضطراب اور بے چینی اور دو نی ہو جاتی ہے۔ خدا سے مل کر بھی اس کے نزدیک احساس خودی قائم رہتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے سورج کی روشنی میں چراغ۔ ساقی نامہ مجموعی حیثیت سے اقبال کی بہت مکمل نظم ہے۔

شعر اور فلسفہ کا امتزاج جیسا اس نظم میں ہے سوائے بانگ درا کی "شمع و شاعر" کے اقبال کے بقیہ اردو کلام میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

لمحۂ نور

(کشمیر کی ایک حسین رات کے تاثرات)

جناب آل احمد سرور ایم اے (علیگ)
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

شفاف چاندنی بھی ہے آبِ رواں بھی ہے
لیلائے شب کا حسن عیاں بھی نہاں بھی ہے

نغمے برس رہے ہیں ہر اک آبشار سے
بکھری ہوئی انہیں میں مری داستاں بھی ہے

موجوں کو دیکھتا ہوں کبھی آسمان کو
گویا کہ ماہتاب یہاں بھی، وہاں بھی ہے

طاری ہے سارے سلسلۂ کوہ پر جلال
بہتا ہوا جلال کا اِک کارواں بھی ہے

کہسار کی جبیں پہ فرشتوں کی مہر شوق
موجوں کے لب پہ میرے لبوں کا نشان بھی ہے

آغوش میں تڑپتی ہوئی بجلیاں بھی ہیں
ایمن بنی ہوئی ہے تجلی جہاں بھی ہے

فرشِ زمردیں پہ مچلتی ہوئی بہار
رعنائیِ شباب کا منظر یہاں بھی ہے

ان لالہ فام، مست بہاروں کے سامنے
پروردگار کیا کوئی طاقت خزاں بھی ہے؟

رہتے ہیں کیوں بہشت کی خواہش میں روز و شب
کہہ دو جناب شیخ سے جنت یہاں بھی ہے

میاں خوجی نے ریل کا سفر کیا

جناب خواجہ مسعود علی ذوقی (علیگ)

مرزا جی۔ اجی خواجہ صاحب! خدا کے لئے ذرا تیز تیز قدم اُٹھائیے۔ واللہ گاڑی چھوٹ گئی تو قیامت ہی آجائیگی۔

خوجی۔ [ہانپتے ہوئے] اُمہ مرزا جی۔ تمہاری اس جلد بازی سے مجھے چڑھ ہے ـــــــــ دیکھتے نہیں ہو، اس دھکم دھکا میں کس خوبصورتی سے بدن چرا کر چل رہا ہوں کہ کہیں کسی کے چوٹ چپیٹ نہ آجائے ـــــــ کہیں خدا نخواستہ کوئی مسافر ٹکر کھا کے پُل پُلا گیا تو! ـــــــ ابے او پگڑ والے گنوار راستے سے ہٹ کے کھڑا ہو۔ بدتمیز ـــــــ بھئی منشی جی میری گٹھری ذرا ہوشیاری سے سنبھالے رہنا۔

منشی جی۔ لیجئے صاحب وہ سامنے ہماری ریل کھڑی ہے۔ یہ مرزا جی تو ناحق غل مچا کے بوکھلائے دیتے ہیں۔ ابھی تو انجن پانی پینے جا رہا ہے ـــــــ اور پھر حضت یہ تو جنکشن ہے۔ یہاں تو آدھ گھنٹے سے زیادہ ریل کھڑی رہتی ہے۔

مرزا جی۔ لو اب بسم اللہ کر کے اسی سامنے والے ڈبے میں چلے چلو نا۔

منشی جی۔ دو قدم اور آگے بڑھے چلئے حضت یہ دوسرا درجہ ہے۔

خوجی۔ [بگڑ کر] دوسرا اور تیسرا کیسا جی۔ جب دام دئے ہیں۔ ٹکٹ خریدا ہے تو اپنی جانب کا جہاں دل چاہے گا بیٹھیں گے . . . . اب رکھدے قلی سب سامان اسی درجے میں ـــــــ آغا صاحب ذرا دروازے کے پاس سے ہٹنا۔ دیکھتے نہیں ہو ہم اپنا سامان رکھوا رہے ہیں۔

منشی جی۔ یار خوجی۔ خواہ مخواہ ضد پر اڑے ہوئے ہو۔ آگے بڑھ چلو بھائی۔

خوجی۔ کیا کہا ؟ خوجی ! پھر تو کہنا ۔ اجی خوجی کس مردک کا نام ہے ؟ خیر اب کہا تو کہا پھر ایسی گستاخی کی تو چچا بنا کے چھوڑوں گا ——— آغا ۔ او آغا ۔ ذرا دروازہ چھوڑ کے کھڑے ہو ایں۔ ہم چلا رہے ہیں اور یہ گو کھا سنتا ہی نہیں ۔ کھڑکی میں سے آدھا دھڑ نکالے بجو کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہا ہے ——— امہ ہم تم سے کہہ رہے ہیں جی۔ سنتے ہو کہ نہیں ۔ دروزہ کھولنے دو۔

خان ۔ [اپنے مخصوص افغانی لہجے میں] یاں کاں چلا آرآاے بائی۔ آگے جاکے بیٹو۔ یہ دوسرا درجہ اے (یہاں کہاں چلے آرہے ہو بھائی۔ آگے جاکے بیٹھو۔ یہ دوسرا درجہ ہے)

خوجی۔ دوسرا درجہ ہے تو تمہارے ٹھینگے سے۔ تمہارے باپ کی ریل ہے کیا ؟ کہنے لگے دوسرا درجہ ہے ——— چل بے قلی ۔ میری صورت کیا دیکھتا ہے۔ رکھ دے اسباب اسی درجہ میں ۔

مرزا جی ۔ بھئی خواجہ صاحب۔ کیا غضب کر رہے ہو۔ افغانی آدمی کے منہ نہ آنا پھر گیا تو کچومر نکال کے رکھ دیگا ۔

خوجی۔ ہم نے بہت دیکھے ہیں ایسے ایسے افغانی ۔ وہ تو کہو سفید پوش سمجھ کر طرح دے رہا ہوں ۔ نہیں تو قسم قرآن کی وہ جھانپڑ رسید کروں کہ دن کو تارے دکھائی دینے لگیں ——— ابے او کلاہ والے خان ! ابے اب ہٹتا ہی کہ دوں دھکّا۔

خان۔ [غصّے میں چلا کر] تم بوت گستاخ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ام تمہاری گوشمالی کر کے درست بنائیگا [کھڑکی سے کان پکڑنے کے لئے ہاتھ باہر نکالتا ہے]۔

منشی جی ۔ بچانا خواجہ صاحب ۔ کان بچانا۔ اجی وہ تو سچ مچ کھڑکی میں سے ہاتھ نکال رہا ہے۔

[افغانی خوجی کا کان زور سے پکڑ لیتا ہے۔ خوجی زور لگا کر چھڑانا چاہتے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوتی]۔

خوجی ۔ ارے ارے یہ کیا مسخرہ پن ہے ؟ اجی خان صاحب ۔ چھوڑو میرا کان ——— واللہ دل لگی کی حد ہوتی ہے ۔ ارے بھئی خان صاحب کان گیا ——— ابے او گیدی ۔ جان نکلی یہ

کیا کر رہا ہے۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ بھونک کے قیمہ بنا دیتا ـــــ ارے بھئی افغانی صاحب قسم پروردگار کی سخت درد ہو رہا ہے۔ للہ کان چھوڑ دیجئے۔

خان ۔ نئیں ۔ نئیں ۔ تم بدمعاش ۔ آج ام تمارا کان اُکاڑ کے پھینک دے گا۔

خوجی ۔ اکنون واللہ خان صاحب سخرگی بگزار ۔ دل لگی چھوڑئیے ۔ میرا کان گیا۔ سر عزیز کی قسم بھائی، گوشِ من رفت۔ منہ پر طمانچے مار کے وعدہ کرتا ہوں کہ اب ازرخ ابن سمت نہ خواہم کرد ۔ واللہ نہ دانستہ بودم کہ شما ایسقدر قوی ہیکل جوان ہو کہ گوش من از بیخ و بن خواہد اکھاڑید۔

منشی جی ۔ (آہستہ سے) منع کرتے تھے۔ منع کیے تے تھے کہ نہ الجھو۔ اب منہ کی کھائی تو لگے فارسی بولنے۔ لے اب صبح تک گوشمالی کراتے رہئے۔ بندہ درگاہ تو چل کے دوسرے ڈبہ میں بیٹھتے ہیں۔

خوجی ۔ ہُنہہ ۔ گوشمالی کی ایک ہی کہی! ـــــ اجی آپ کو کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ یہ ہمارے آبا جان مرحوم کے جگری دوست، سردار گل محمد خاں کی سگی بھتیجی کے دیور ہیں۔ ان سے تو ہمارا پرانا مذاق کا رشتہ ہے ـــــ (درد سے کراہتے ہوئے) افوہ۔ کان اکھڑ جائیگا ظالم۔ واسطے خدا کے اب دل لگی چھوڑ۔

خان ۔ اچھا جاؤ۔ تمارا چوٹا چوٹا (چھوٹا چھوٹا) آت پاؤں (ہاتھ پاؤں) پہ رحم کرکے ـــ کان چوڑے (چھوڑے) دیتا ہے ۔ ۔ ۔ اب کبھی زبان درازی نہ کرنا۔ [کان چھوڑ دیتا ہے]

خوجی ۔ یار خان صاحب۔ پہلے تو تم اتنے تگڑے نہ تھے۔ قسم قرآن کی چٹکی ہے یا لوہے کا شکنجہ۔ واللہ کان کا دیوالہ نکال دیا ـــــ اچھا بھئی پھر ملیں گے اس وقت ذرا سفر کی جلدی میں ہیں۔ [خوجی معہ ہمراہیوں کے آگے بڑھتے ہیں] لاحول ولاقوت۔ کس دل لگی باز سے سابقہ پڑا تھا ـــــ بھئی مرزا جی۔ یہ لوگ غیر ملک کے ہیں تو کیا۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ ہوتے ہیں بڑے خوش مزاج ـــــ اجی ذری غور سے دیکھنا منشی جی۔ یہ تیسرا درجہ ہے نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تیسرا تو ہی ہے ـــــ آئیے۔ آئیے۔ بس اسی میں نکل چلئے۔ لا بھائی قلی۔ اسباب ادھر رکھ دے۔ اس طرف۔ ہاں یہاں ـــ اور لے بھائی یہ ہیں تیرے پیسے تم تو منشی جی ہماری گٹھری لیکے

اس کونے میں بیٹھ جاؤ ——— اور آؤ مرزا جی ہم تم یہاں بیٹھیں۔ اس کھڑکی کے پاس۔ بھئی منشی جی ذرا گٹھری کا خیال رکھنا۔

مرزا جی۔ (اطمینان کی سانس لیکر) یا اللہ تیرا شکر ہے۔ خدا خدا کر کے جگہ تو مل گئی ——— اب جا کے جان میں جان آئی۔

خو. جی۔ (اکڑ کر) جگہ کیسے نہ ملتی؟ ارے بھائی خواجہ بدیع الزمان ساتھ ہیں کہ مذاق ہے۔ قسم ہے جوانی کی تل دھرنے کی گنجائش نہ ہوا اور اپن جانب جھگڑا بھر جگہ نکال لیں۔ برسوں کمیدانی کی ہے۔ بھاڑ نہیں جھونکا ہے ——— واللہ صورت سے وہ شانِ افسری ٹپکتی ہے کہ لوگ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کے اٹھ جاتے ہیں۔

منشی جی۔ بے اب بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ ——— اس وقت تو ایسی کرکری ہوئی ہے کہ کہیں چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے۔

خو. جی۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ لگے اوٹ پٹانگ اڑانے۔ ارے بھائی کہہ تو دیا کہ خان صاحب سے ہمارا دل لگی کا رشتہ ہے۔ جبھی تو ہم نے برا نہیں مانا ——— اور جو کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا میرے ساتھ یہ حرکت کرتا تو قسم خدا کی وہ مرمت کرتا' وہ مرمت کرتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ——— ارے بھئی مرزا صاحب ذری یہ سامنے تو دیکھنا۔ وہ جو کتے کی زنجیر پکڑے میم کھڑی ہے۔ یہ آخر مجھے یکساں گھورے کیوں جاتی ہے؟ ارے یجیئے صاحب۔ وہ تو مسکرا بھی رہی ہے۔

منشی جی۔ جی آپ ہیں بھی تو چشم بد دور بڑے بانکے ترچھے جوان۔ لاکھ دو لاکھ میں آپ جیسا ایک ہی نکلے گا ——— اور ہاتھ پاؤں تو خدا کے فضل سے آپ نے ماشاء اللہ ایسے لاجواب پائے ہیں کہ بڑے بڑے پہلوانوں کا کلیجہ سامنے آتے ہوئے پانی ہو جائے ——— اجی حضرت وہ مسکرا رہی ہے آپ کی قطع پر ——— یہ ماشہ ماشہ بھر کے ہاتھ پاؤں۔ یہ ٹھڈی کی نوک پر بنے کا چھوٹا سا گھونسلا۔ یہ املی کے بیج کے برابر بڑی بڑی آنکھیں۔ یہ ساڑھے تین فٹ کا

لمبا تڑنگا قد ـــــ بھلا اس میم بیچاری نے کبھی کاہے کو دیکھا ہوگا ایسا طرحدار جوان رعنا۔ !!

خوجی۔ (انکسار کے لہجے میں) ارے بھئی کیوں خواہ مخواہ تعریف کرکے شرمندہ کرتے ہو۔ واللہ تمہارے سرعزیز کی قسم، فرانس میں ہم جدھر نکل جاتے تھے لوگ ہمارا دم خم اور چہرے کی آب وتاب دیکھ کے محو حیرت رہ جاتے تھے۔ اور لیڈیاں تو بس یوں سمجھو کہ جان چھڑکتی تھیں۔ جہاں ذرا ہم نے ہنس کے بات کر دی اور بس، رلیۃ غشی ہو گئیں ـــــ بھئی منشی جی ذرا ہماری گٹھری سنبھالے رہنا۔ اجی آرام سے پاؤں اٹھا کے بیٹھ جاؤ۔ اور گٹھری کو رکھ لو اپنے گھٹنے کے نیچے بس پھر کوئی کھٹکا نہ رہیگا۔

منشی جی۔ (بگڑ کر) گٹھری۔ گٹھری۔ لاحول ولاقوت۔ گٹھری نہ ہوئی۔ قارون کا خزانہ ہو گیا۔ اماں کوئی ستّرہ دفعہ تو گٹھری کی یاد دلا چکے ہوگے۔

خوجی۔ یار تم تو کچھ سمجھتے ہو نہ بوجھتے ہو۔ اماں گٹھری کی کس مردود کو پروا ہے۔ ہمیں تو اپنی ڈبیہ کی فکر ہے جو اس میں بندھی ہوئی ہے۔ سفر کا معاملہ ہے خدا نخواستہ خدا نخواستہ اگر کہیں گٹھری ادھر سے ادھر ہو گئی تو۔ من خواجہ بدیعا کا تو سمجھ لیجئے کہ بے افیم کے انتقال ہو جائیگا ـــــ ارے ہاں یار مرزا جی۔ ذری پوچھنا تو اس خونچے والے کے پاس کھیر کے پیالے بھی ہیں یا نہیں۔

مرزا جی۔ آپ کی بھی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ یہ پان سگرٹ والا ہے کہ کھیر کے پیالے بیچتا ہے؟ دیکھتے نہیں ہیں آپ بنے ہوئے پان نکال نکال کے مسافروں کے ہاتھ بیچ رہا ہے۔

خوجی۔ اجی تو احتیاطاً پوچھ لینے میں کیا مضائقہ ہے بھائی کیا عجب جو اس کے پاس کھیر کے پیالے بھی نکل آئیں۔ اب دیکھئے نہ وہ جو ہمارے محلے میں شیخ گھسیٹے ہیں۔ کہنے کو تو بساط خانے کی دکان رکھتے ہیں لیکن آخر ان کے یہاں کھانے کا تمباکو بکتا ہے کہ نہیں ـــــ بس اسی سبب سے تو ہم ریل کے سفر سے گھبراتے ہیں۔ یہاں نہ کھیر کے پیالے بکتے ہیں نہ گنڈیریاں ہیں نہ حلوہ سوہن اب دیکھئے کہ وقت ہو گیا ہے اور بے طرح عمل کرنے کو جی چاہ رہا ہے لیکن اس ڈر سے افیم نہیں گھولتے کہ چسکی لگا کے منہ کاہے سے میٹھا کرینگے ـــــ (چلّا کر) ابے ہائیں ہائیں۔ او

مسافر کے بچے۔ کہاں سر پر چڑھا آرہا ہے ــــــ ے اب ہٹاتا ہے میری گٹھری پرسے اپنا بستر اکہ جاؤں ایک دھپ ــــــ گنوار لٹھ کہیں کا۔ واللہ بھانت بھانت کا جانور ہے کہ گھستا چلا آتا ہے۔

منشی جی۔ اجی خواجہ صاحب کچھ اور بھی دیکھا تم نے۔ اس میم کے پاس تو دیکھتے ہی دیکھتے اچھا خاصہ پرستان جمع ہو گیا (گنتا ہے) ایک۔ دو۔ تین ۔چار۔ اور ایک وہ پانچ ــــــ لیجئے حضرت اکدم سے چھ چھ پریاں اکٹھا ہوگئیں ــــــ اور بھئی مجھے تو شک ہوتا ہے کہ سب تمہاری ہی طرف دیکھ دیکھ کے مسکرا رہی ہیں اور آپ ہیں کہ ان کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتے۔

خوجی۔ (ہنس کر) کڑھنے دو۔ کڑھنے دو ان مہ جبینوں کو ــــــ واللہ اس طرح جلانے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے ــــــ اور بھئی سچ پوچھو تو جب سے ہم نے فرانس کی پری جمال عورتیں دیکھی ہیں، قسم ہے اپنی اٹھتی جوانی کی، ساری دنیا کے حسین دل سے اتر گئے ــــــ ہائے ہائے اب بھی ان کی یاد آجاتی ہے تو کلیجے پہ سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ وہ انکا باتوں باتوں میں آنچل سے مُنہ چھپا کے مسکرانا۔ وہ پان کھا کے رومال کے کونے سے بار بار ہونٹوں کا پونچھنا۔ وہ کالی کالی بادام جیسی مچھوئی آنکھیں۔ وہ کمر تک لہراتی ہوئی گھنیری زلفیں وہ ان کا ....

منشی جی۔ (بات کاٹ کے) امہ گھولنے سے پہلے ہی مزے میں آگئے۔ لگے ایران توران کی اڑانے کیا خوب۔ فرماتے ہیں (خوجی کی نقل کرتے ہوئے) وہ باتوں باتوں میں مسکرا کر آنچل سے مُنہ چھپانا۔ وہ پان کھا کے بار بار رومال کے کونے سے ہونٹوں کا پونچھنا ــــــ یورپ کی عورتیں نہ ہوئیں آپ کے حساب لکھنؤ کی شرمیلی بیگمیں ہوگئیں۔

خوجی۔ واللہ منشی جی تمہاری انہیں کج بحثیوں سے میرا جی جلتا ہے۔ پوری بات سنی نہیں تھے پر ٹوک دیا۔ (روٹھ کر) لاحول ولا قوت۔ اب اپنے حساب مردود ہو جو تم سے بات کرے۔

مرزاجی۔ بھئی یہ بیچ میں ٹوکنے کی عادت تمہاری بہت واہیات ہے منشی جی ــــــ ہاں تو پھر کیا ہوا خواجہ صاحب۔

خوجی۔ ہوا کیا صاحب۔ فرانس میں یوں سمجھئے کہ بڑے بڑے گھرانے کی شہزادیاں ہم پر لٹو

تھیں ــــــ اور ایک لیڈی تو ہم پر اتنی ریجھی کہ سایہ کی طرح ہر وقت ساتھ رہتی تھی۔ واللہ سایہ کی طرح۔ کہتی تھی ہم سے شادی کرلو ہم تمہارے ساتھ ہندوستان چلیں گے۔ مگر جناب کیا حسن و جمال پایا تھا اس نازنین نے انسان کیا تھی جنت کی حور تھی۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

منشی جی۔ اے سبحان اللہ سبحان اللہ کیا موقع کا شعر پڑھا ہے۔ واللہ طبیعت پھڑک اٹھی۔

خوجی۔ تسلیم تسلیم۔ بندہ کس لائق ہے ــــــ تو جناب پھر جب این جانب اس پری وش محبوبہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر باغ میں چہل قدمی کرتے تھے تو تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کیا چاند سورج کی جوڑی ہے۔ کوئی کہتا تھا ماشا اللہ دونوں چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں ــــــ اور ہمیں واللہ ذری سا جوانی جوانی پر یا حسن پر گھمنڈ ہو آپ جانیں غرور تو ہمیں چھو نہیں گیا ہے۔

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا۔ آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔

منشی جی۔ خوب۔ خوب۔ برمحل شعر خوانی کے تو تم بادشاہ ہو۔ واللہ مانتا ہوں۔

مرزا جی۔ اہاہا۔ بھئی طبیعت خوش کر دی۔ کیا لاجواب شعر پڑھا ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ نہایت موقع سے۔

خوجی۔ جی تو کیا آپ سمجھتے تھے کہ این جانب نرے سپاہی ہیں۔ اجی جناب۔ بندہ فقط تلوار کا دھنی نہیں ہے، اہل قلم بھی ہے۔ قلم گوید کہ من شاہ جہانم ۔ قلم کش را بدولت می رسانم ــــــ ــــــ اب سنئے کہ ایک فرانسیسی جوان جو اس نوخیز حسینہ سے شادی کرنا چاہتا تھا ہمارے درپے ہو گیا۔ لاگ ڈانٹ تو خیر بہت دنوں سے چلی ہی آتی تھی۔ مگر ایک دن بیچ بازار میں اس نے ٹوک دیا۔ بس جناب آگ ہی تو لگ گئی تن بدن میں ــــــ میں نے ڈپٹ کے کہا "ٹھہر تو گیدی! ابھی مارے قرولیوں کے تیری چٹنی نہ بنا دوں تو میرا نام خواجہ بدیع الزماں نہیں" اب جو اس نے دیکھا کہ ایک لحیم شحیم گراں ڈیل جوان غصہ میں شیر کی طرح کھڑا ڈکار رہا

ہے تو ساری سٹّی پٹّی بھول گیا مردک ۔ وہ دم دبا کے بھاگا مردود کہ آج تک خیال کرتا ہوں تو مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں ۔

منشی جی ۔ مگر بھئی خواجہ صاحب ۔ اس دن نخاس میں بڑی خیریت ہو گئی ۔ جو میں آپ کو سنبھال نہ لوں تو اس کمبخت ٹھیلے والے کے جھپیٹے میں آ کر آپ کچل ہی گئے تھے ۔

خوجی ۔ کون کچل گیا ہوتا ؟ میں ! اجی توبہ کیجئے ۔ استغفراللہ ۔ وہ تو کہئے کہ مجھ میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ آپ اپنے زعم میں گر پڑتا ہوں ـــــ بھئی اس دن ہوا یہ کہ میں خدا جانے کس دھن میں گردن جھکائے لپکا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک مرتبہ نظر جو اٹھاتا ہوں تو ٹھیلہ بالکل سر پر یا الٰہی اب کیا کروں ۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ۔ اگر ایک طرف ہٹتا نہیں ہوں تو ڈر ہی کہ میری ٹکر سے ٹھیلے کے پرخچے نہ اڑ جائیں ۔ بس جناب ، پھرتی سے جھکائی دیکے بجلی کی طرح جو ایک کنارے مڑتا ہوں تو بدن کا لنگر نہ سنبھل سکا ۔ اب میری جگہ کوئی دبلا پتلا آدمی ہوتا تو صاف اپنے کو بچا لیجاتا ۔ این جانب ٹھہرے کئی من کے بیل تن جوان ۔ آپ اپنے جھونک میں نیچے آ رہے ۔

منشی جی ۔ (طنز سے) اور وہ بھی منہ کے بل ! ـــــ امہ جاؤ ۔ بڑے جوانمرد بنتے ہو ۔

خوجی ۔ بس اسی نکتے کو تو سمجھتے نہیں ہو تم لوگ ۔ اجی این جانب پہلوان ابن پہلوان ہیں ۔ سینکڑوں ، ہزاروں دنگل سر کئے بیٹھے ہیں ۔ تم نے کوئی اناڑی سمجھا ہے کہ چت گرتے عزیزمن یاد رکھو ۔ اکھاڑے کا لڑا ہوا پہلوان جب گریگا منہ کے بل گریگا ـــــ سمجھے ۔ (الفاظ پر زور دیکر) جب گریگا منہ کے بل گریگا ـــــ کیا مجال جو زمین سے پیٹھ لگ جائے ۔

منشی جی ۔ اوہو ہو ہو ! مانتا ہوں استاد بھئی کیا بات پیدا کی ہے ۔ شاباش یہاں تو ہم بھی قائل ہو گئے ۔

خوجی ۔ اچھا تو لے اب اسی بات پر ہماری گٹھری ادھر لاؤ دوست ۔ ذری سی افیم گھول کے دو ایک چسکیاں لگاؤں تو جان میں جان آئے ۔

منشی جی۔ تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔ گاڑی چھوٹ جائے تو گھولنا افیم۔
خوجی۔ واہ یہاں قسم خدا کی جماہیوں پر جماہیاں آ رہی ہیں۔ توڑ کا وقت ہے۔ اب ہم سے صبر نہیں ہوتا۔
منشی جی۔ تو لیجئے حضت۔ سنبھالئے اپنی گٹھری ——— لیکن بھئی خدا کے لئے مارے ہو کے بہت سی نہ گھول لینا کہ پیتے ہی غیں ہو جاؤ۔ بات کرنے کے بھی قابل نہ رہو۔
مرزا جی۔ ہاں خواجہ صاحب۔ ذری کمی بیشی کا خیال رکھیئے گا۔ کہیں آپ پینک میں ا غفیل ہو گئے تو ہم لوگوں کا بھی سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔
خوجی۔ اجی توبہ کیجئے۔ یہاں ایسی سدھی ہوئی چٹکی رکھتے ہیں واللہ۔ کہ کیا مجال جو رتی کم یا زیادہ ہو جائے۔ لے اب میں ذری گٹھری کھول کے ڈبیا نکال لوں (گٹھری کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح کانکھے جاتے ہیں کہ گویا بہت زور پڑ رہا ہے۔) اوہ توبہ۔ کس قدر کسی ہوئی گرہ ہے۔ لاحول ولا قوت کھلتی ہی نہیں۔ اوہنہ۔ یہ کس مردود اس قدر کس دی ہے گرہ کہ کھولے نہیں کھلتی۔ میں نے تو اس سلیقہ سے گرہ لگائی تھی کہ ناخنوں کے سہارے کھل جائے (پھر کانکھتے ہوئے گرہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں) اوہنہ ——— بھئی میں نہ مانوں گا۔ اس گٹھری کو کسی پاجی نے چھوا ضرور ہے۔ یہ ہرگز ہرگز میری لگائی ہوئی گرہ نہیں ہو سکتی۔ اوہنہ ——— بات تمہارے کی (اطمینان کے لہجے میں) اب جا کے کھلی ——— اپنے آپ (آہستہ آہستہ) ایں تھیلی کیا ہو گئی۔ اس کا تو کہیں پتہ ہی نہیں۔ (زور سے چلا کر) ارے یار اس میں وہ تھیلی تو ملتی نہیں جس میں افیم کی ڈبیا تھی۔
منشی جی۔ (بناوٹی لہجے میں) یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ گٹھری کسی نے چھوئی بھی تو نہیں۔
خوجی۔ (رونی آواز میں) ہائے۔ ہائے۔ ہائے۔ غضب ہو گیا۔ ارے بھائی منشی جی ہم تو نانا جان کی قسم بے موت مرے۔ واللہ بے موت ——— خدا جانتا ہے قیامت ٹوٹ پڑی۔
مرزا جی۔ اجی ذری حواسوں سے ڈھونڈھو۔ تھیلی جائے گی کہاں؟ کپڑوں کی تہ میں کہیں ادھر

سے ادھر ہو گئی ہو گی۔

خوجی ۔ (بین کے لہجے میں) ادھر سے ادھر کہاں ہو گئی ہو گی صاحب ؟ ایک ایک کپڑا تو جھاڑ کر دیکھ رہا ہوں۔ اے یہ لیجئے۔ (پھر دوسرا کپڑا جھاڑنے کی آواز) اور اے ——— یہ لیجئے (پھر تیسرا کپڑا جھاڑنے کی آواز) اور صاحب یہ لیجئے ——— ڈوایک انگلی بھی نہیں پورے ڈیڑھ بالشت کی تھیلی ہے۔ آخر زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا ؟ ——— بھائیوں میں تو لٹ گیا۔ واللہ کہیں کا نہ رہا (تقریباً روتے ہوئے) گٹھری بندھی کی بندھی رہ گئی اور کوئی گرہ کٹ صاف تھیلی نکال لے گیا ——— ہائے ہائے۔ آنکھوں میں خاک جھونک کے بھری کی بھری ڈبیا کوئی مُوس لے گیا۔

مرزاجی۔ آخر لے کون جائیگا۔ گٹھری نگاہوں کے سامنے سے بھی تو نہیں ہٹی۔

خوجی۔ (چِلّا چِلّا کر بین کرتے ہوئے) ارے خدا غارت کرے اس ملعون کو۔ اس نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا ——— اُف دل بیٹھا جاتا ہے۔

ایک مسافر۔ کیا ہوا کیا ؟ کوئی چیز جاتی رہی کیا ؟

دوسرا۔ کوئی تھیلی اڑا لے گیا ہے بیچارے کی۔

پہلا مسافر۔ کتنا روپیہ تھا اس تھیلی میں ؟

دوسرا۔ کوئی بھاری رقم ہو گی جب تو بیچارا پچھاڑیں کھا رہا ہے۔

پہلا مسافر۔ (خوجی کے قریب آکر) ابھی تو گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔ پولس میں رپورٹ کر دیجئے۔

دوسرا مسافر۔ (خوجی سے) قریب آکر میاں جی۔ آخر آپ کی تھیلی میں تھی کتنی رقم ؟

خوجی۔ (اپنی دُھن میں، روتی آواز سے) ڈھیروں تھی بھائی۔ کئی روز چلتی۔ سب لے اُڑا اٹھائی گیرا ——— اور افیم گھولنے کی دو ننھی ننھی چینی کی پیالیاں گھاتے میں ——— ہائے اب جینے کے لالے پڑ گئے۔ کیونکر زندگی ہو گی ! ——— ارے بھائی کوئی سنبھالو مجھے۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا رہا ہے۔

منشی جی۔ (ڈانٹ کر) کیا عورتوں کی طرح واویلا مچا رکھی ہے ذرا سی چیز کے لئے ـــــ جیسے آپکی جان ہی تو اس ڈبیا میں بند تھی۔ ـــــ چلو اگلے اسٹیشن پر اتر کر ہم تمہیں افیم کے کھیت میں چھوڑ دیں گے۔ پیٹ بھر کے چر لینا۔

خو جی۔ (نڈھال آواز میں) بھائی یہاں جان نکلی جا رہی ہے۔ تمہیں دل لگی سوجی ہے۔ خدا کے لئے اس وقت ہمیں پریشان نہ کرو ـــــ اف مارے رنج کے کلیجہ پھٹ جائیگا۔

منشی جی۔ (قہقہہ لگا کر) ہا ہا ہا ـــــ ہا ہا ہا۔ آگئے نہ چکمے میں۔ بڑے کائیاں بنتے تھے۔ ہا ہا ہا۔

خو جی۔ (بگڑ کر) یہ کون ہنسی کا وقت ہے۔ قسم قرآن کی میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔

منشی جی۔ (بڑی دیر تک قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔

مرزا جی۔ نے بھئی منشی جی۔ اب زیادہ پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔ دے دو خواجہ صاحب کی ڈبیا۔

خو جی۔ (آواز میں قوت آجاتی ہے اور لہجہ بدل جاتا ہے) کیا کہا۔ کیا کہا۔ ڈبیا موجود ہے تمہارے پاس؟ (خوشامدانہ انداز میں) بھئی تمہیں قسم قرآن کی سچ سچ بتاؤ منشی جی۔

مرزا جی۔ ہاں ہاں صاحب۔ اِکے میں بیٹھ کر آپ تو باتوں میں لگ گئے اور ان حضرت نے چپکے سے گٹھڑی کھول کے آپ کو دق کرنے کے لئے ڈبیا صاف اُڑا دی۔

خو جی۔ بھئی جلا لیا مرزا جی۔ واللہ تم نے ہمیں جلا لیا۔ بخدا پھر سے زندگی پائی ـــــ اوہ یہاں تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ اب تک اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے ہی ـــــ یار بڑے شیطان ہو تم منشی ـــــ آخر اس جان جوکھم کی دل لگی سے کیا فائدہ ملا؟ لے اب سیدھے سیدھے داہنے ہاتھ سے ڈبیا این جانب کے حوالے کر دو نہیں تو قسم ہے پروردگار کی اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گا۔

منشی جی۔ بڑے جہاںیاں جہاں گشت، گرگ باراں دیدہ بنتے تھے۔ لگے ایک ہی بھرے میں

چکر گھنی کی طرح ناچنے ــــــ لیجئے سنبھالئے اپنی تھیلی۔ اور یہ دیکھئے اس میں آپ کی ڈبیا اور چینی کی پیالیاں دونوں چیزیں موجود ہیں۔

خوجی۔ (تھیلی لیتے ہوئے) جیتے رہو اللہ کرے۔ بھئی یہاں تو گویا مر کے پھر سے جی اٹھے ــــــ لے مرزا جی اب ذری اپنی صراحی سے رتی بھر پانی تو ہم کو انڈیل دو اس چینی کی پیالی میں۔

مرزا جی۔ لیجئے۔

خوجی۔ بس۔ بس۔ بس۔ کافی ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (افیم گھولتے ہیں) اہا ہا۔ بھئی کیا خوشبو نکلی ہے افیم ہے۔ دماغ تر و تازہ ہو گیا ــــــ لو بھئی وہ برفی والا بھی آ نکلا۔ نہ سہی کھیر کے پیالے۔ بلا سے برفی ہی سے منہ میٹھا کریں گے ــــــ (چلا کر) او برفی والے۔ ابے برفی والے ہوت۔ ابے او خوانچے والے کے بچے۔

منشی جی۔ اُمہ پھر وہی بوکھلاہٹ۔ دور ہی سے کسی خوانچے والے کو دیکھ لیا اور کفن پھاڑ کے چیخنے لگے ــــــ یہ تم نے کیسے اتنے دور سے پہچان لیا کہ برفی والا ہے۔ چسکی لگانے سے پہلے ہی بہکنے لگے۔

خوجی۔ اجی ہم اپنے مطلب کی چیز کو سوں سے تاڑ لیتے ہیں واللہ۔ ــہ

خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ کھول کر (ایک مسافر کو مع سامان کے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر) ابے ہائیں ہائیں! چھاتی پر چڑھا چلا آتا ہے مردود۔ ہٹا اپنی چھتری ایک طرف کو۔ ادھر جا کے بیٹھ دوسری طرف ــــــ آنکھیں ہیں کہ نمک کے ڈھیلے۔ دیکھتا نہیں ہے کہ اپن جانب ادھر بیٹھے افیم گھول رہے ہیں۔ اور جو چھلک جائے تو؟

مسافر۔ (بگڑ کر) زبان سنبھال کر بات کیجئے۔ میں بھی قوم کا شیخ ہوں۔ کوئی بھنگی چمار نہیں ہوں کہ تُو تُکار کرنے لگے۔

خوجی۔ چپ بے بڑا شیخ کا بچا بن کے آیا ہے۔ زیادہ تین پانچ کریگا تو وہ طمانچہ رسید کرونگا کہ منہ چرخا ہو جائیگا ــــــ ہُنہہ۔ منہ میں دانت' نہ پیٹ میں آنت۔ چلے

ہیں وہاں سے کیدانوں اور رسالداروں سے اُلجھنے۔

مسافر۔ (غصہ میں چیخ کر) ابے تبے کروگے تو ابھی ٹھیک بنادوں گا۔

خوجی۔ بس خبردار ملعون۔ زیادہ بولا تو گدّی سے زبان کھینچ لوں گا۔ پاجی کہیں کا۔ نہ ہوئی قرولی نہیں تو قسم ہے اُستاد کی اس مردود کی بوٹی بوٹی کاٹ کے ڈال دیتا۔

مسافر۔ (نہایت غیظ کے عالم میں) بڑا ہیکڑ خان بنتا ہے! تو یوں نہ مانے گا۔ یہ لے (طمانچہ مارتا ہے)
———— اور بولے گا؟

خوجی۔ (بنچ سے اُٹھ کر مسافر سے گتھ جاتے ہیں) تیری ایسی کی تیسی، مردود۔ قیمہ بنا کے رکھ دونگا۔ لانا تو میری قرولی۔

مرزا جی۔ ہائیں ہائیں۔ امہ جانے بھی دو خواجہ صاحب ——— آپ ہی مان جائیے حضرت

مسافر۔ (ہانپتے ہوئے) آج میرے ہاتھ سے تیری قضا آئی ہے بدمعاش!

خوجی۔ —— (ہانپتے ہوئے) چھاتی پر چڑھ کے خون چوس لوں گا مردک۔

منشی جی۔ بس بس چھوڑ دو جی۔ چھوڑ دو۔ [منشی جی بیچ بچاؤ کرنے کھڑے ہوجاتے ہیں] ارے بھئی خوجی تم ہی الگ ہو جاؤ [گاڑی کی سیٹی کی آواز سنائی دیتی ہے] لیجئے گاڑی بھی چھوٹ گئی لے بڑے میاں اب غصہ تھوک ڈالئے (گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگتی ہے) ارے ارے ہاتھ نہ مڑوڑیئے خواجہ صاحب کا جناب۔ یہ آپ کیا کرتے ہیں۔

خوجی۔ [درد سے کراہتے ہوئے] ابے ہاتھ ٹوٹا ملعون۔ اوگیدی۔ ابے او بہروپئے۔ ہائے جان نکلی ——— دہائی ہے ریل کے صاحب کی! دہائی ہے انگریز بہادر کی!

[گاڑی رفتہ رفتہ خوب تیز ہوجاتی ہے]

"چاندنی رات"

جناب صفیر مچھلی شہری

ہمنشیں، خواہش ہے تیری چاندنی پر کچھ لکھوں
کس طرح یہ ظلم اپنے قلبِ مضطر پر سہوں

جب خزاں کا رنگ ہو بادِ بہاری سے عیاں
پے بہ پے جب گر رہی ہوں آسماں سے بجلیاں

چل رہی ہوں آندھیاں جب جور و استبداد کی
جب صدائیں بے اثر ہوں نالہ و فریاد کی

شیشۂ انسانیت جب ہو رہا ہو چور چور
بڑھ گیا ہو حد سے جب مٹی کے پتلے کا غرور

چوستا ہو خون جب مزدور کا سرمایہ دار
جب وفورِ غم سے ہو دامانِ عشرت تار تار

بھوک کی شدت سے جب ہو ابنِ آدم بیقرار
ناتوانی مونس و ہمدم ہو فاقہ غمگسار

پی رہے ہوں بھیڑیے جب آدمیت کا لہو
جب قبائے انس و الفت ہو نہ سکتی ہو رفو

اشکِ خونیں کوئی برساتا ہو ہنستا ہو کوئی
گھر اجڑتا ہو کسی کا اور بستا ہو کوئی

جب نہ ہوں مزدور کو حاصل پرانی دھجیاں
اور اہلِ جور پہنے ہوں حریر و پرنیاں

جب کفن تک بھی میسر ہو نہ انساں کے لئے
جسم اُس کا وقف ہو جورِ زمستاں کے لئے

ستر پوشی تک نہ کرسکتا ہو مفلس کاشتکار
اور اکڑے اطلس و زربفت میں سرمایہ دار

جب محاسن وجہِ محرومی ہوں انساں کیلئے
بن گئے ہوں پھول جب کانٹے گلستاں کیلئے

جل رہی ہو روح جب سوزِ غم افکار میں
فرق پھر محسوس ہو کس طرح نور و نار میں

روحِ پژمردہ میں ہو جب حسِ ہستی کالعدم
چاندنی کا لطف پھر کیوں کر اٹھا سکتے ہیں ہم؟

جب غلامی کا ہو گردن میں گلو افشار طوق
چاندنی راتوں کا پھر پیدا ہو کیسے دل میں ذوق!

ہم اسیرانِ محن کے واسطے شبہائے ماہ
دعوتِ درد و الم ہیں وائے بر حالِ تباہ

ہے اجل آسا غلامی روحِ آدم کے لئے　　دھوپ جیسے موت بنجاتی ہے شبنم کے لئے
جب یہ عالم ہو وفورِ اضطراب و آہ کا　　کون کس جی سے اٹھائے لطف نورِ ماہ کا؟
عیش کی گھڑیاں نہیں اب عیش کی باتیں کہاں　　ہند کے ظلمت کدہ میں "چاندنی راتیں" کہاں؟
رات کوئی اور آئے گی مسرت کے لئے
یہ تو عبرت کے لئے ہے صرف عبرت کیلئے!!

پرائے بس میں

رومانی زندگی کا ایک ہلکا سا عکس

جناب محمود الحسن صدیقی۔ (علیگ، مدیر روزنامہ "ندیم" بھوپال سابق ایڈیٹر علیگڑھ میگزین،

میں آج تک نہ سمجھ سکا۔ ریحانہ! کہ تم میری زندگی پر اس طرح حکمراں کیسے ہو، میرا ارادہ میرا نہیں، میرا خیال میرا نہیں، میرے جذبات کا مد و جزر میرے اختیار میں نہیں، میری خوشی میری نہیں، میری فکر میری نہیں، میرا کوئی احساس میرا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب تمہاری ملک میں سب پر تم قابض، زندگی کی تمام روداد تمہاری مرتب کی ہوئی ہے، اس کا جزو کل! میرے ماضی پر تم مسلط ہو، میرے حال کی تم شہیم و شریک۔ میرا مستقبل تمہارے ہاتھ میں، آخر یہ ہے کیا؟ ریحانہ خدا کے لئے بتاؤ، میری آزادی کیوں کھو گئی؟ میری انفرادیت کیوں ختم ہو گئی؟ یہ سب کیا ہوا، کیونکر ہوا! "

ریحانہ نے ایک قہقہہ لگایا، حسب معمول، ایک لطیف پرکشش قہقہہ! جس میں اس کی مخصوص دل آویزی جھلک رہی تھی، آہ، وہی قہقہہ جس نے میری زندگی کو تمام و کمال ریحانہ کے قبضہ میں دیدیا تھا، وہی جو میری محبت کی ابتدا اور اس کی انتہا ہے، وہ ہمیشہ تازہ، ہمیشہ پرکیف، اور گرد و پیش کو خوشی سے معمور کر دینے والا قہقہہ!

"جناب، میں نے اس کی بڑی قیمت ادا کی ہے، آزادی سستے داموں نہیں خریدی جاتی، کوئی مرد اپنی آزادی کو سستے داموں نہیں بیچتا، یہ میری کامیابی ہے، مرد کی سب سے بڑی شکست عورت کی سب سے بڑی کامیابی ہے، یہ میری کائنات ہے اور یہ ہی میری حیات کی تکمیل ہے! کیا یہ عورت کی سب سے بڑی خوش نصیبی نہیں کہ وہ کم از کم ایک مرد کو دنیا میں پورے طور پر مسخر کرلے؟"

"سچ ہے"، میں نے کہا، اور شکست خوردگی کی تمام علامات کے ساتھ میں مسکرا دیا،

لیکن میں نے سوچا، عورت، کتنی خوبصورت، کتنی دل آویز! لیکن کتنی سادہ دل مخلوق ہے! ہاں،

بالکل ایک بچے کی طرح سادہ دل اور سبک سیر، مرد کی شکست خوردگی، مرد کی مغلوبیت کو وہ اپنی فتح سمجھتی ہے اور اس پر نازاں، اس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مرد کی ہزیمت اس کی خودغرضی کا نہایت ہی پُرفریب مظاہرہ ہے، وہ شکست کھاتا ہے فتح پانے کے لئے، وہ پیچھے ہٹتا ہے، آگے بڑھنے کے لئے!! شباب، حسن، نسوانیت، دلکشی، فطری جاذبیت، ان سب چیزوں کے لئے کچھ وقت ہے۔ اور مرد اپنی ہزیمت اور شکست میں اس وقت کے گذرنے کا انتظار کرتا ہے،

حسن، شباب اور نسوانیت کو دھوکا دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے سامنے اپنی شکست کا اقرار کرلیا جائے، ایک محدود وقفے تک، وہ وقفہ جو لطافتوں سے معمور لیکن تیزی کے ساتھ گذر جانے والا اور اپنے ساتھ رومان، محبت، وفاپرستی، ان سب کے افسانوں کو بڑی تیزی کے ساتھ ختم کردینے والا ہے،

مجھے ریحانہ کے قہقہے نے مسحور کیا تھا، ایک ہی قہقہے کو سنکر میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ریحانہ، میری شریک زندگی ہوگی، میری محبت کا مرکز ہوگی، میں اپنی ہستی کو اس کے سحر آفریں قہقہے میں گم کردوں گا، وہ قہقہہ جو ریحانہ کی شوخ طبعی، زندہ دلی اس کے شباب، اس کے حسن، اس کی ذہانت اور اس کی تمام رعنائیوں کا مکمل مظاہرہ ہوتا تھا،

ریحانہ کا قہقہہ ایک مستقل عنوان ہے، ایک ادیب کی تمام تخیل کی تراوشوں کو اسکی تعریف میں صرف ہوجانا چاہئے، اس کا قہقہہ کبھی بے محل نہیں ہوتا، یا اس کو وہ بے محل نہیں ہونے دیتی، ریحانہ کو اپنے قہقہے کا ٹھیک وقت معلوم ہے، یا اس کا قہقہہ ہر وقت کو اپنے مناسب حال بنا لیتا ہے،

اس نے میری زندگی کو تابناک بنادیا۔ میرے تمام افکار میرے تمام آلام، میرے ابتدار حیات کی تمام منزلوں میں ریحانہ کے قہقہے نے مجھے زندہ رکھا،

ریحانہ زندگی کو ایک سچے فلسفی کی نگاہ سے دیکھتی ہے، وہ جانتی ہے کہ دنیا کی ہر فکر،

غم اور اندوہ، کتنا سراب آسا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح مسرت اور شادمانی کے روح پرور لمحات، اس لئے وہ مسرت اور فکر دونوں کا استقبال، اپنے جاں نواز قہقہے کے ساتھ کرتی ہے، بڑی سے بڑی فکر، بڑی سے بڑی پریشانی اور بڑی سے بڑی کشمکش حیات میں اسکے قہقہے نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

"مردہ دلی اور غم انگیزی انسانی تمدن کا سب سے بڑا گناہ ہے اور انسانی سرشت کی سب سے بڑی کمزوری ہے، ہر چیز گذر رہی ہے، ہر چیز ختم ہونے والی ہے، ہر چیز اپنی متضاد نوعیت کے ساتھ دلکش ہوتی ہے، فکر اور پریشانی اگر نہ ہو تو ہم مسرت کا تخیل کیسے کریں" وہ کہا کرتی، اور میں کہتا "ریحانہ چھوٹی سی قہقہے باز فلسفی! دیکھیں گے، یہ قہقہے کب تک؟ جبتک زندگی ہے، اسی طرح" اور پھر قہقہہ!

میرے محترم'!

آپ کا افسانہ . . . .

بیاہ بخدا، پڑھ رہی ہوں، اور خدا معلوم کتنی بار پڑھ چکی ہوں، آپ فطرت نسوانی کے کتنے صحیح ترجماں ہیں، جذبات، اور پھر عورت کے جذبات کی صحیح مصوری۔ اگر یہ فطری اور وہبی نہیں تو آرٹ ہے، اور کتنا مکمل آرٹ! میں نے آپ کے افسانے پہلے بھی پڑھے ہیں، لیکن یہ افسانہ بلا دیے درماں ہے، میں ہی نہیں میرے ساتھ اور بھی متعدد افسانہ نویس اور افسانوں کو پڑھنے والی خواتین نے مجھ سے اس کی تعریف کی، میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ اس کے بعد آپ سے براہ راست متعارف ہونے کے لئے کسی مزید وسیلے کی ضرورت نہ ہوگی، جواب کی پہنچنے سے منتظر!

آپ کی "پرستار"

میرے مطالعہ کی میز پر ایک معطر اور خوبصورت لفافہ میں ایک کھلا ہوا خط اور اس میں یہ مضمون۔ کھلا ہوا خط، میرے مطالعہ کی میز پر اور اس نوعیت کا، خدایا! یہ کیا؟ اور ریحانہ! اس نے دیکھا، کھولا، اور پڑھا، اور پھر! وہی قہقہہ، کیا؟ یقیناً، وہی، احسب معمول، لیکن نہیں، ہاں، خط کے ایک بار پڑھنے کے بعد سیر نہ ہو کر، میں نے خط کو متعدد بار پڑھا، یہ ... ... ! کون؟ یہ پہلا خط، اس بے تکلفی کے ساتھ، اس جرأت سے، کن توقعات کے ساتھ؟ بالکل لاعلمی میں! ناواقفیت! یا غیر ذمہ داری، وقتی جذبات سے مغلوب ہو جانا لڑکپن، خیر،

لیکن اس کے بعد،!

اور پھر مجھے ریحانہ کا خیال آیا، اس کے سوائے میری ڈاک کا کھولنے والا کون؟ اور اگر اس نے کھولا تو پھر، خدایا،! میں نے خط میز پر ڈالدیا۔ اور خیالات کے ہجوم کو دور کرنے کے لئے آرام کرسی پر گرتے ہوئے میں نے اپنا سگار جلایا۔

"قریب کے کمرہ سے ایک جِک کو مضطربانہ حرکت ہوئی۔" اور پڑھیئے! اور پڑھیئے! اتنی جلد خط ختم کر دیا، پھر پڑھئے، اور پڑھتے رہیئے، جبتک رومانیت کے احساسات کی تکمیل نہ ہو جائے!"

چاہیئے، اب آپ آزاد ہیں، اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ، آپ کی سکشت کا دور ختم ہوا، آپ کی ہزیمت کا زمانہ گذر گیا،

اب آپ فاتح ہیں۔ اپنی فتح کے نقارہ بجائیے! خوشیاں منائیے، دادعیش دیجئے، اور مجھے، اپنی تمام بدنصیبوں کے ساتھ، اپنی قسمت پر چھوڑ دیجئے،!

خوب، بہت خوب!

میں آپ کی خلوت میں مخل ہوں! معافی!! اس خط کو اچھی طرح پڑھئے، اور لطف اندوزی کی پوری طرح تکمیل کیجئے اور اس کے جواب میں اپنی تمام ادبیت کو ختم کر دیجئے۔ اب کیا ہے؟

بہت سے پرستار پیدا ہو گئے '! پوجے ، پوجے 'اور پوجے جائیے !!

بہت غلامی کے شاکی تھے ' بہت انفرادیت کی پامالی پر شکوہ تھا ' اب خوب آزادی کے راگ گائیے '!

ریحانہ ! خدا کے لئے ' یہ سب کیا ہے ؟ میرا اس میں کیا قصور ہے ؟ 'اس خط سے مجھے کیا تعلق ' ایک کوتاہ اندیشن لڑکی ' اور اس کی ہرزہ سرائی ' محض جذباتی ' میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میرے اوپر اس کا ذرا سا بھی اثر نہیں ۔

تم کیا سمجھ رہی ہو ؟

میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں ! میں آپ کو اتنا سمجھتی ہوں کہ خود آپ بھی اپنے آپکو نہیں سمجھتے ۔

اچھا صاحب !' اگر اس خط سے آپ کو ہمدردی نہیں ' تو اس کو مسلسل پندرہ منٹ تک بڑھتے رہنے کے کیا معنی ؟ اور پھر آپ کے چہرہ کا اتار چڑھاؤ ' کیا معنی ؟ اور اس طرح آرام کرسی پر نڈھال ہو کر گرنا اور سگار سلگا کر ' اپنے خیالات کے توجہ کو دور کرنے کی کوشش ' یہ سب کیا ؟ ۔

جائیے ' مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کیجئے ! میں سب کچھ جان چکی ' میں سب کچھ سمجھ گئی ! اب میری سلطنت ختم ہوئی میری دولت لٹی ' اور میں !

قہقہہ ! نہیں ! اس کے برعکس ایک چیخ ! اور اس کے بعد ہسٹیریا کی آمیزش کے ساتھ پیہم سسکیاں !!

خدایا ! یہ کیا ؟ زندگی ہی بدلی جا رہی ہے ! ایک خط سے ! ایک بے سروپا خط سے ! بے سروپا خط ' ! میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا چاہا ۔ اس کا اثر ' میرے دل پر کچھ نہیں ' لیکن نہیں نہیں ! کچھ تو ضرور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کون ؟ اس کو میرے افکار سے اتنا گہرا تعلق ! پسندیدگی ' یا دلگرفتگی ' محبت ! نہیں کچھ نہیں ! سب بے محل !! کس طرح ؟ مصنوعی !

یا شباب ! نا تجربہ کاری، غیر مآل اندیشی کا مظاہرہ، سب فضول، بے نتیجہ، مہمل، !

اور ریحانہ، میرے تمام خیالات، ایک مرکز پر آ گئے ! وہ کوچ پر الٹی پڑی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی، اس کا حیات آفریں قہقہہ ختم ہو چکا تھا، میں بیتاب ہو گیا۔ زندگی کی تمام مسرت بخش روداد میرے سامنے تھی !

کتنی دلنواز ؟ کتنی کیف آفریں ؟

میں نے ریحانہ کو کوچ پر سے کھینچتے ہوئے، انتہائی جذباتی لہجہ میں کہا، "ریحانہ، میں تمہارا ہوں تمہارا رہوں گا۔ میری کمزوری کو معاف کرو ! غیر اختیاری اضطرار ! اور محض اضطرار، ایک عصبی تاثر، اور محض فطری، وقتی، ختم ہوا،

خط، نذر آتش کر دیا جائیگا !"

ریحانہ، اس اطمینان دہی کے بعد بھی مضمحل تھی ! افسردہ، غمگین، بے تعلق سی !،

میں نے کہا "ریحانہ ہنسو اور میری زندگی کو ہمیشہ کی طرح اپنے قہقہے سے جگمگا دو،

وہ کوشش سے مسکرائی، اور اپنے ہاتھ ملائمیت کے ساتھ میرے گلے میں حمائل کر دیئے، اس کی آنکھوں میں چند آنسو جھلک رہے تھے، لیکن قہقہہ اب بھی نہ تھا،

عورت کی شادمانی کا راز خدایا ! مرد کی کامل بے بسی ! کامل غیر اختیاری ! بالکل عبودیت ہے، اور محبت، شاید اسی بے بسی کا نام !

سائنس کے چند علماء

جناب ڈاکٹر محمد ذکی الدین (علیگ)
ایم۔ایس سی۔پی ایچ۔ڈی۔ڈی۔فل
شعبہ طبیعات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نمبر ۲۱۱۔ پاولو، ایون پیٹرووچ (Pavlov, Ivan Petrovitch)

۱۸۴۹ میں روس میں پیدا ہوا۔ یہ ماہر عضویات تھا۔ غدود اور دل کے متعلق اہم تحقیقات کیں۔ اس کی کتابیں انگریزی میں بھی ترجمہ ہوئیں۔ ۱۹۰۴ء میں طب کا نوبل انعام پایا۔

نمبر ۲۱۲۔ پیرسن، کارل (Pearson , Karl)

۱۸۵۷ میں انگلستان میں پیدا ہوا۔ یہ ماہر طبیعات تھا۔ ساتھ ساتھ طب اور معاشیات میں دلچسپی رکھتا تھا۔ لندن یونیورسٹی میں (Genetics) کا پروفیسر تھا۔ اس کی کتاب "گرامر اف سائنس" بہت مشہور ہے۔

نمبر ۲۱۳۔ پیری، رابرٹ ایڈون (Peary, Robert Edwin)

۱۸۵۶ میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ امریکہ کے بحری صیغہ میں ایڈمیرل (Admiral) تھا۔ ۱۸۹۱ء ۱۸۹۳ء ۱۸۹۸ء میں قطب شمالی گیا۔ ۱۹۰۵ء میں اور ۱۹۰۹ء میں قطب شمالی پر امریکہ کا جھنڈا گاڑ آیا۔ اس نے اپنے سفر کے متعلق بہت سی کتابیں شائع کرائیں۔

نمبر ۲۱۴۔ پینک، البرشٹ (Penck , Albrecht)

۱۸۵۸ میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ جرمنی ماہر ارضیات اور جغرافیہ داں تھا۔ الپس اور اسپین کے پہاڑوں کے متعلق کتاب لکھی۔

نمبر ۲۱۵۔ پرکن، سر ولیم ہنری۔ (Perkin , Sir William Henry)

(۱۸۳۸ - ۱۹۰۷) انگلستان کا کیمیا دان تھا۔ اس نے رنگ سازی کا طریقہ معلوم کیا اور اس کے بنانے کی کمپنی کھولی۔

نمبر ۲۱۶- پارین، جین (Perrin , Jean)

کیمیا کا پروفیسر ساربون (Sorbonne) میں مقرر ہوا۔ اس نے تحقیقات کر کے جوہر کا سائز معلوم کیا۔ اور براؤنی حرکات کے متعلق تحقیقات کیں۔ اس پر اسے نوبل انعام ملا۔

نمبر ۲۱۷- پارین، الیف (Perrin , F.)

ساربون میں طبعیات کا پروفیسر مشہور عام ہے۔

نمبر ۲۱۸- پیٹری، ولیم میتھو فلنڈرس (Petrie , William Mathew Flinders)

۱۸۵۳ میں پیدا ہوا۔ مصری قبور کے متعلق تحقیقات کیں۔

نمبر ۲۱۹- پکرنگ، ایڈورڈ چارلس (PicKring, Edward Charles)

۱۸۴۶ میں پیدا ہوا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی رصدگاہ کا ڈائرکٹر تھا۔ اس نے آسمان کا عکس لیا اور دس ہزار ستاروں کا ذکر اس کی فہرست میں ہے۔

نمبر ۲۲۰- پیٹ- ریورس اگسٹس ایچ لین فاکس (Pitt - Rivers , Augustus H. Lane - Fox)

(۱۸۲۷ - ۱۹۰۰) فوجی افسر تھا جس نے اکسفورڈ یونیورسٹی کو بہت سے اسلحہ جات دئے۔

نمبر ۲۲۱- پانیکار، جیولس ہنری (Poincaré , Jules Henri)

(۱۸۵۴ - ۱۹۱۳) ہیئت اور طبعیات اور ریاضی کا ماہر تھا۔ فرانس کا باشندہ تھا علمی تبحر رکھتا۔ اس نے ۵۰۰ تصانیف کیں۔ اس کا دماغ بہت ہی اعلیٰ تھا۔

نمبر ۲۲۲- پولٹن، ایڈورڈ بگنیل (Poulton , Edward Bagnall)

۱۸۵۶ میں پیدا ہوا۔ اکسفورڈ میں حیوانیات کا پروفیسر تھا۔

نمبر ۲۲۳- پریسلے، جوزف (Priestley , Joseph)

(۱۸۰۴-۱۷۳۳) کیمیادان تھا۔ اس کی ملاقات بنجامن فرینکلن سے ہوئی اور اس کو حدت کے متعلق تحقیقات کا شوق ہوا۔ اس نے آکسیجن گیس کا پتہ چلایا اس کے خیالات کی بنا پر اس کے مکان میں آگ لگادی گئی تھی۔ امریکہ میں مرا۔

نمبر ۲۲۴۔ پرنگسایم، نیتھانیل، Pringsheim, Nathaneal

(۱۸۹۴-۱۸۲۳) جرمن ماہر نباتیات۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ نباتات کو کاربن ڈیکسائیڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔

نمبر ۲۲۵۔ پراکٹر، رچرڈ انیتھونی، Proctor, Richard Anthony

(۱۸۸۸-۱۸۳۷) علم ہیئت کا عالم تھا۔ ہیئت کے متعلق تحقیقات کیں اور عام فہم کتابیں لکھیں مریخ کی گردش کے وقت کا تعین کیا۔ کہکشاں کے متعلق تحقیقات کیں۔

نمبر ۲۲۶۔ پایکرافٹ، ڈبلو، پی، Pycraft, W. P

۱۸۶۵ میں انگلستان میں پیدا ہوا۔ ماہر حیوانیات تھا۔

نمبر ۲۲۷۔ کوئیلیٹ، لمبرٹ ایڈولف جیکویس، Quetelet, Lambert Adolphe Jacques

(۱۸۷۴-۱۷۹۶) برسلس کی شاہی رصدگاہ کا ڈائرکٹر تھا۔ اس نے متعدد کتابیں ہیئت ریاضی وغیرہ پر لکھیں۔

نمبر ۲۲۸۔ ریمزے، سر اینڈرو کرامبی، Ramsay, Sir Andrew Crombie

(۱۸۹۱-۱۸۱۴) ۱۸۴۱ء میں ۶ روز پر محکمہ ارضیات میں نوکر ہوا تیس سال کے بعد محکمہ ارضیات کا ڈائرکٹر ہو گیا۔ سوئزرلینڈ کے پہاڑوں کے متعلق کتاب لکھی۔

نمبر ۲۲۹۔ ریمزے، سر ولیم، Ramsay, Sir William

(۱۹۱۶-۱۸۵۲) انگریز کیمیادان تھا۔ اس نے ہوا میں سے پانچ قسم کے نئے گیس نکالے۔ ان گیسوں کی مقدار بہت ہی کم ہے اس لئے اس سے قبل ان کا پتہ نہ چلا تھا، اس پر اسے

کیمیا کا نوبل انعام ملا۔

نمبر۲۳۰۔ رالن سن، سرہنری کریزوک ، Rawlinson ،
Sir Henry Criswicke ،
تاریخ کا عالم تھا۔ اس نے مختلف مکتوبات جو زمین سے نکالے گئے ان کے معنی نکالے۔ بابل اور نینوا کے شہر کا بتہ معلوم کیا۔

نمبر۲۳۱۔ رے، جان ، Ray , John ،
(۱۷۰۵ - ۱۶۲۸) حیوانیات کا عالم تھا۔

نمبر۲۳۲۔ ریلے، لارڈ جون ولیم سٹرٹ۔ ، Rayleigh , Lord , ،
John William Strutt ،
(۱۹۱۹ - ۱۸۴۲) کیمبرج یونیورسٹی کی معمل طبعیات کا ڈائرکٹر تھا۔ اس نے گیس آرگن ہوا میں دریافت کیا۔ اس کے متعدد مقالے طبعیات اور روحانیات پر موجود ہیں۔

نمبر۲۳۳۔ ریامیر، رینے انٹوین فرشاولٹ ڈی۔ ، Reaumur , René ،
Antoine Ferchault de ،
(۱۷۵۷ - ۱۶۸۳) اس نے حرارت ناپنے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کیا۔ اور علوم وفنون کی کتابیں فرانسیسی زبان میں لکھیں۔

نمبر۲۳۴۔ ریکلوس، جین جیکوس ایلیزے ، Reclus , Jean Jacques Elysiée ،
(۱۹۰۵ - ۱۸۳۰) جغرافیہ کا ماہر تھا۔ اس نے دنیا کے متعلق کتاب لکھی۔

نمبر۲۳۵۔ رینارڈ، الفانسو فرانسویس ، Renard , Alphonse Francois ،
(۱۹۰۳ - ۱۸۴۲) بلجیم کا ماہر ارضیات سمندر کے متعلق تحقیقات کیں۔

نمبر۲۳۶۔ رشٹ ہافن، فرڈینینڈ بیرن ، Richthofen , . Ferdinand ،
Baron ، (۱۹۰۵ - ۱۸۳۳) جرمنی کا ماہر ارضیات۔ اس نے دنیا کا سفر کیا۔ لون

برلن، لائپزگ کی یونیورسٹیوں میں پروفیسر تھا۔

نمبر ۲۳۷۔رڈجوے، سرولیم۔ (Ridgway, Sir William.)

۱۸۵۳ میں انگلستان میں پیدا ہوا۔یونان اور روما کے متعلق تحقیقات کرتا رہا۔اسکی تصانیف یونان سے متعلق ہیں۔

نمبر ۲۳۸۔رِٹشی، جیمس۔ (Ritchie, James)

ایبرڈین یونیورسٹی میں حیوانیات کا پروفیسر تھا۔

نمبر ۲۳۹۔رِٹر، کارل۔ (Ritter, Karl)

(۱۷۷۹-۱۸۵۹) جرمن ماہر ارضیات تھا۔جغرافیہ پر بھی کتابیں لکھیں۔

نمبر ۲۴۰۔ریورس، ڈاکٹر ڈبلو ایچ آر۔ (Rivers, Dr. W. H. R.)

(۱۸۶۴-۱۹۲۲) انگلستان کا ماہر طب، جنگ عظیم میں حصہ لیا۔

نمبر ۲۴۱۔رومنیس، جارج جان (Romanes, George John)

(۱۸۴۸-۱۸۹۴) عیسائیت کے متعلق تحقیقات کیں۔

نمبر ۲۴۲۔رانجن، ولہلم کونراڈ۔ (Röntgen, Wilhelm Konrad)

۱۸۴۵ میں پروشیا میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے لاشعاعوں کو دریافت کیا۔اس کی مدد سے انسان کی ہڈی وغیرہ کا عکس لیا جاتا ہے۔اس پر اسے نوبل انعام طبعیات کا ملا۔

نمبر ۲۴۳۔راس، جیمس کلارک۔ (Ross, James Clark)

(۱۸۰۰-۱۸۶۲) اس نے انٹارکٹک سرکل (Antarctic Circle) دریافت کیا۔ ۱۶۰ میل کے قریب مقناطیس قطب جنوبی تک پہونچا۔

نمبر ۲۴۴۔راس، سرجون۔ (Ross, Sir John)

(۱۷۷۷-۱۸۵۶) جغرافیہ داں تھا۔

نمبر ۲۴۵۔راس، سررانلڈ (Ross, Sir Ronald)

۱۸۵۷ میں پیدا ہوا۔ ہندوستان میں رہا۔ ملیریا کی وجہ معلوم کی۔ اسے یہ پتہ چلا کہ مچھر کی وجہ سے ملیریا ہوتا ہے۔ اس کو طب کا نوبل انعام اس مہلک مرض کی وجہ معلوم کرنے پر ملا۔

نمبر ۲۴۶۔ روس، ولیم پارسنس۔ (Rosse, William Parsons) (۱۸۰۰-۱۸۶۷) ہیئت داں تھا۔

نمبر ۲۴۷۔ روئس ولہلم۔ (Roux Wilhelm) ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا۔ جرمن ماہر عضویات تھا۔

نمبر ۲۴۸۔ لارڈ رتھر فورڈ۔ (Lord Rutherford)

۱۸۷۱ء میں نیوزیلینڈ میں پیدا ہوئے برایٹ واٹرا ورنلسن کے اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی نیوزیلینڈ ہی میں آپ کی استعداد کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ وہیں آپ کی اولین تحقیقاتیں شروع ہوئیں ۱۸۹۴ء میں آپ کو انگلستان جانے کا وظیفہ ملا۔ وہاں سے آپ کیمبرج پہونچے اور سر جے ٹامسن جو کیمبرج کے مشہور ماہر طبعیات ہیں ان کے ساتھ تحقیقات شروع کیں۔ چار سال تک تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا۔ وہاں سے کینڈا کی طرف رخ کیا۔ ایک یونیورسٹی نے اپ کو پروفیسر مقرر کر دیا تھا۔ کل تک ایک گمنام سی یونیورسٹی تھی۔ اپ کے اسے ہی چمکی اور ساری دنیا کے محققین اپ کی طرف کھنچنے لگے۔ ہر سال کئی اہم مقالے اور مضامین شائع ہوتے رہے۔ وہیں اپ نے ریڈیم کے متعلق تحقیقات شروع کیں ۹ سال تک آپ کا قیام وہیں رہا۔ ۱۹۰۷ء میں منچسٹر یونیورسٹی نے آپ کو پروفیسر بنا کر بلا لیا۔ یہاں بھی پوری قوت سے تحقیقات ہوتی رہیں۔ یہاں بھی اہل علم جمع ہونے لگے۔ اور ۱۹۱۰ء میں اپنے جزیہ کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریئے کے رو سے جزیہ کے اندر ایک سخت شے ہوتی ہے جس کے چاروں طرف برقئے چکر کاٹتے ہیں۔

اس نظریہ کی بنا پر اور ریڈیم کے خاندان کے دیگر عناصر کے متعلق تحقیقات پر آپ کو کمسٹری کا نوبل پرائز ۱۹۱۱ء میں عطا ہوا۔ آپ اس اعزاز کے بعد اور کام کرتے رہے۔ اور جنگ کے دوران میں اپ نے نہایت ہی اہم خدمات بہم پہونچائیں۔

۱۹۲۰ء میں آپ کیمبرج میں سر جے جے ٹامسن کے جگہ پر مقرر ہوئے بس ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک کیمبرج ہی رہے اور وہاں سے راہی ملک عدم ہوئے۔ آپ کے زمانہ میں سب سے اہم کاموں کی فہرست حسب ذیل ہے :۔

۱۔ ریڈیم کے متعلق اہم تحقیقات ۔
۲۔ جزبہ کا نظریہ ۔
۳۔ عناصر کی کیمیا گری ۔
۴۔ رانجنی شعاعوں کے خصوصیات جو جزئیات پر منحصر ہیں ۔
۵۔ + برقیہ کی ایجاد ۔
۶۔ نیوٹرن کی ایجاد ۔
۷۔ مختلف گیس کو رقیق کرنے کے طرائق ۔
۸۔ بہت زیادہ مقناطیسی قوت کا پیدا کرنا ۔
۹۔ یوٹر کا نظریہ
۱۰۔ مختلف طریقوں سے معمل کے اندر کیمیا گری ۔

انشاءاللہ دوسری قسط میں آپ کی تحقیقات کی تفصیل پیش کی جائے گی ۔

آپ کی تجہیز و تکفین کے وقت میں بھی حاضر تھا۔ یہ سماں ایسا تھا کہ بیان نہیں کیا جاتا۔ اتنا بڑا شخص اور اس کی تجہیز و تکفین بغیر شور و شغب کے وقوع پذیر ہو ۔ دنیا کے سب سے بڑے اہل علم جمع تھے۔ انگلستان کے وزرا اور دوسرے ممالک کے اہل رائے وہاں موجود تھے۔ آپ کی تجہیز و تکفین پرانے رومن کیتھولک طریقہ پر کی گئی ۔

آپ کی زندگی کے کئی واقعات آپکی سادگی اور اعلیٰ دماغی کا ثبوت دیتے ہیں آپ جنگ کے دوران میں ایک کمیٹی کے پریذیڈنٹ تھے۔ یہ کمیٹی زمین دوز جہازوں کے متعلق تحقیقات کرتی تھی۔ اس زمانہ میں جرمنوں نے بہت سے جہاز بم سے ہلاک کردئے تھے۔ آپ سے کہا گیا کہ

آپ اس کے تجربوں کو دیکھنے تشریف لے چلیں۔آپ اس وقت اپنے تحقیقات میں معروف تھے۔ آپنے کہا کہ میرے تحقیقات جنگ سے زیادہ ضروری ہیں۔اور نہیں گئے۔یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ذرا ذراسی بات پر فوراً قید ہوتی تھی۔آپ کی تحقیقات واقعی جنگ سے زیادہ اہم ثابت ہوئیں آج ہم کو کیمیا گری معلوم ہوگئی۔اس کیمیا گری کی تلاش قدما کرتے رہے اور عربوں اور مسلمانوں نے کئی سو سال تک اس مسئلہ پر سر مارا خدا نے آج اس مسئلہ کے حل کرنے کا سہرا رتھر فورڈ ہی کے سر رکھا۔

ایسے لوگ ہزار ہا سال میں پیدا ہوتے ہیں۔اب نہ معلوم دنیا کو ایسا کامل انسان کب میسر آئے گا۔

نمبر ۲۴۹ ساچس، جولیس ، Sacks, Julius ، (۱۸۳۲-۱۸۹۷) جرمن ماہر نباتیات۔

نمبر ۲۵۰ سالمن، جورج ، Salmon George ، (۱۸۱۹-۱۹۰۴) ایرلینڈ کا ریاضی داں۔

نمبر ۲۵۱ سینڈرسن، سر جون سکاٹ برڈن Sanderson, Sir John Scott Burdon ، (۱۸۲۹-۱۹۰۵) ماہر عضویات اور انگلستان کا مشہور طبیب۔

نمبر ۲۵۲ سایوسور، ہوریس بینڈکٹ ڈی ، Saussure, Horace Benedict de ، (۱۷۴۰-۱۷۹۹) سوئیزرلینڈ کا ماہر طبیعیات اور ارضیات تھا۔اسنے الپس کے متعلق تحقیقات کی۔

نمبر ۲۵۳ پیٹر زیمن ، Zeeman, Pieter ، ہالینڈ کا ماہر طبیعیات ۱۸۶۵ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۶ میں زیمن اثر معلوم کیا۔اس کی مدد سے جوہر کے اندر کے برقیوں کے متعلق معلومات بہم ہوتی ہیں۔نوبل انعام طبیعیات کا حاصل کیا۔

نمبر ۲۵۴ ینگ، ٹامس ، Young, Thomas ، (۱۷۷۳-۱۸۲۹) انگلستان کا ماہر طب اور معماری۔روشنی کے متعلق اہم تحقیقات کیں۔یہ ثابت کیا کہ روشنی رو کی سی ہوتی ہے۔آنکھ کے متعلق علم میں اضافہ کیا۔

نمبر ۲۵۵۔ رائٹ، سر المورتھ ایڈورڈ ، Wright, Sir Almroth Edward ،
۱۸۶۱ میں پیدا ہوا۔ خون کے سفید سالموں کے متعلق تحقیقات کیں اور خون کے اجزا کے کمی اور
بیشی کا علم، طب میں اچھا اضافہ ہے۔

نمبر ۲۵۶۔ رائٹ برادرس ، Wright Brothers ، امریکن تھے۔ جو
ہوائی جہاز پہلے دفعہ ہوا میں اُڑانے میں کامیاب ہوئے۔

نمبر ۲۵۷۔ اوڈوارڈ، ارتھر سمتھ ، Woodward, Arthur Smith ،
۱۸۶۴ میں پیدا ہوا۔
برٹش میوزیم کے ارضیات کے شعبہ کا نگران۔ ڈارون کے ساتھ ایک پُرانی کھوپڑی کے
متعلق نظریہ پیش کیا۔

نمبر ۲۵۸۔ ولف، کیسپر فرائڈرچ ، Wolff, Kaspar Friedrich ،
۱۷۳۳-۱۷۹۴ جرمن ماہر عضویات و ، Embryology ، جس نے اس علم کی بنیاد رکھی۔

نمبر ۲۵۹۔ ولسن، ایڈمنڈ بیچر ، Wilson Edmund Beecher ،
۱۸۵۶ میں پیدا ہوا۔ حیاتیات اور حیوانیات کا پروفیسر امریکہ کے کئی دارالعلوم میں رہا۔
یہ حیوانیات اور حیاتیات کا ماہر ہے۔

نمبر ۲۶۰ ۔ ولی، ارتھر ، Willey, Arthur ، ۱۸۶۷ میں پیدا ہوا حیوانیات کا
پروفیسر تھا۔

نمبر ۲۶۱۔ وہایٹ ہیڈ، رابرٹ ، Whitehead, Robert ، (۱۸۲۳-۱۹۰۵)
انگلستان کا رہنے والا۔ تارپیڈو کا موجد۔

نمبر ۲۶۲۔ وہائٹ ہیڈ، اے۔ ، Whitehead, A. ، فلسفی جس نے نظریہ
اضافیت اور کائنات کے متعلق تحقیقات کیں۔

نمبر ۲۶۳۔ وھیلر، ولیم مورٹن۔ Wheeler, William Morton ، ۱۸۶۵ میں پیدا

ہوا۔ حیوانیات کا امریکن پروفیسر۔ نیویارک کے میوزیم میں نگراں چیونٹیوں پر تحقیقات کیں۔

نمبر ۲۶۴ وارنر، ابراہام گوٹ لوب ، Werner, Abraham Gottlob ،
(۱۷۴۹-۱۸۱۷) ارضیات کا پروفیسر تھا مختلف قسم کے چٹانوں کو منسلک کیا۔ اور زمانہ ارضی کا اندازہ لگایا۔

نمبر ۲۶۵ وایزمین، اگسٹ ، Weisman, August ، (۱۸۳۴-۱۹۱۴)
فرانکفورٹ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۶۶ء میں فرایبرگ میں پروفیسر ہوا۔ ۱۸۸۲ میں حیات پر ایک کتاب لکھی جس کا دیباچہ ڈاروِن نے خود لکھا تھا۔

نمبر ۲۶۶ واٹ، جیمس ، Watt, James ، (۱۷۳۶-۱۸۱۹) اپنے انجن بنانے کے لئے مشہور ہے۔ اس نے پانی کے مفردات کا پتہ چلایا۔ اور کئی چیزیں اور بھی ایجاد کیں۔

نمبر ۲۶۷ واٹسن، جان بروڈس ، Watson, John Broadus ،
۱۸۷۸ میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ علم النفس کا ماہر اور جان ہاپکن یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔

نمبر ۲۶۸ وارڈ، جیمس ، Ward, James ، ۱۸۴۳ میں پیدا ہوا کیمبرج میں علم النفس کا ماہر تھا۔ اس نے اس علم کی ترقی میں بہت مدد کی۔

نمبر ۲۶۹ وارڈ، ہیری مارشل ، Ward, Harry Marshall ، (۱۸۵۴-۱۹۰۶)
پودوں کی بیماریوں کا ماہر تھا۔ نباتات اور درختوں کی بیماریوں کے متعلق تحقیقات کرتا رہا بعد میں کیمبرج میں نباتیات کا پروفیسر مقرر ہوا۔

نمبر ۲۷۰ والس، الفرڈ رسیل ، Wallace, Alfred Russel ، (۱۸۲۳-۱۹۱۳)
امریکہ کی ندیوں پر تحقیقات کرتا رہا۔ ڈاروِن کے نظریہ پر بحث کی۔ آخر عمر میں روحانیات کا قایل ہو گیا۔

نمبر ۲۷۱ ویلدیر، ولہلم ، Waldeyer, Wilhelm ، (۱۸۳۶-۱۹۰۶)

، Anatomy ، کا پروفیسر تھا۔ پہلے اسٹراسبرگ میں رہا اس کے بعد بون چلا آیا۔ یہ بھی حیاتیات
، Histology ، Embryology ، کا ماہر تھا۔

نمبر ۲۷۲ والس، جوہانس ڈیڈیرک فان ڈیر ، Waals , Johannes Diderik ، van der
۱۸۳۷ میں پیدا ہوا۔ ماہر طبیعیات تھا۔ سالموں کے متعلق تحقیقات کیں۔
اس کے نام پر ایک اصول بھی ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں نوبل انعام پایا۔

نمبر ۲۷۳ ولٹا، الے ساندرو ، Volta , Alessandro ،
(۱۷۴۵-۱۸۲۷) اٹلی کا رہنے والا تھا۔ اس نے معلوم کیا کہ جب چند دھات ملا دیئے جاتے ہیں
تو اس میں سے بجلی کی رو پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر یہ رو کسی مردہ مینڈک کے اندر سے گذاری
جائے تو اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ بجلی پیدا کرنے کی ایک بیٹری اسکے نام سے موسوم ہے۔

نمبر ۲۷۴ ورشو، روڈلف ، Virschow , Rudolph ، (۱۸۲۱-۱۹۰۲)
نے ، Cellular Pathology ، کی بنیاد ڈالی۔

نمبر ۲۷۵ وائنیس، سڈنی ہربرٹ ، Vines , Sydney Herbert ، (۱۸۴۹)
اکسفورڈ میں نباتیات کا پروفیسر تھا۔ اس نے اہم تحقیقات شائع کیں۔

نمبر ۲۷۶ فانٹ ہاف، جیکوبس ہینرک ، Vant Hoff , Jacobus Henrik ،
(۱۸۵۲-۱۹۱۱) ہالینڈ کا کیمیادان تھا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں طبیعیات کا نوبل انعام اس کو ملا۔ سالموں کے
متعلق تحقیقات کیں۔ گیس اور ، Solution ، کا تعلق دکھایا۔ اور نمکوں کی تحقیقات بھی
کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں ائن سٹائن کو اسی کی جگہ برلن میں دی گئی تھی۔

نمبر ۲۷۷ ٹنڈل، جان ، Tyndall , John ، (۱۸۲۰-۱۸۹۳) انگلستان
کا عالم طبیعیات تھا۔ بن سن کا شاگرد تھا، برف کے پہاڑ کی رفتار کا مسئلہ حل کیا۔ روشنی
کے متعلق دریافت کیا۔ ایک اثر جو کہ ٹنڈل اثر کہلاتا ہے معلوم کیا۔

نمبر ۲۷۸ ٹیلر، ایڈورڈ برنٹ ، Tylor , Edward Burnett ، (۱۸۳۲-۱۹۱۷)

Anthropology، پر کتابیں لکھیں اس علم کا بڑا جید عالم گذرا ہے۔

نمبر ۲۷۹ ٹروٹر، ڈبلو ، Trotter, W. ، عمرانیات کا ماہر تھا اور اس نے نفسیات سے عجیب و غریب نتائج اخذ کئے۔ جنگ کے زمانہ میں جماعتیں کیا کیا اثرات قبول کرتی ہیں اسکی تحقیقات کی۔

نمبر ۲۸۰ ٹچنر، ایڈورڈ بریڈفورڈ ، Titchner, Edward Bradford ، ۱۸۶۷ء میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ کئی دارالعلوم میں لکچر دیتا رہا۔ اب اکسفورڈ میں ہے۔ نفسیات کا مشہور پرچہ "مائنڈ" ، Mind ، کا مدیر رہا۔ تجربی نفسیات کا ماہر ہے۔ اس قدر عمدہ بیان کرتا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل صاف ہو جاتے ہیں۔

نمبر ۲۸۱ ٹلڈن، سر ڈبلو۔ اے ، Tilden, Sir W. A. ، ۱۸۴۲ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۹ء تک کیمیا کا پروفیسر لندن یونیورسٹی میں رہا۔ اس نے سر ولیم ریمزے کی سوانح حیات لکھی۔

نمبر ۲۸۲ ٹامسن، سر جوزف جان ، Thomson, Sir Joseph John ، ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا۔ کیمبرج کا کیونڈش پروفیسر (طبیعیات) رہا۔ آج کل ٹرنٹی کالج کیمبرج کا ماسٹر ہے۔ اس نے بہت سی تحقیقات طبیعیات پر کیں۔ برقیہ ۱۸۹۷ء میں معلوم کیا۔ مادہ اس برقیہ سے بنا ہوا ہے۔ مختلف عناصر برقیہ کے تعداد پر بن جاتے ہیں۔ نوبل انعام طبیعیات میں حاصل کیا۔

نمبر ۲۸۳ ٹامسن، جی۔ پی ، Thomson, G. P. ، سر جے۔ جے ٹامسن کا لڑکا۔ لندن یونیورسٹی میں طبیعیات کا پروفیسر۔ اس نے معلوم کیا کہ برقئے موج کی خاصیت رکھتے ہیں اور جب کبھی کسی پتلی تختی سے گذرتے ہیں تو دوسرے سمت اگر عکس کشی کی تختی رکھی جائے تو اسپر نشان چھوڑتے ہیں۔ اس انکشاف پر اس کو نوبل انعام پچھلے سالوں میں ملا ہے۔

نمبر ۲۸۴ ٹامسن، سلوانس فلپس ، Thompson, Silvanus Phillips ، (۱۸۵۱-۱۹۱۶) ٹکنیکل کالج لندن کا پرنسپل رہا۔ اس نے برقی روشنی پر تحقیقات کیں اسکی

لاحیت طبیعیات کے تجربہ کرنے کی بہت عمدہ تھی۔

بر ۲۸۵ ٹلفورڈ، ٹامس ، Telford, Thomas، (۱۸۳۴-۱۷۵۷) پل، سڑکوں اور نہروں کا ماہر تھا۔ برطانیہ میں اس نے بہت سی نہریں اور کئی عمدہ سڑکیں اور پل بنوائے۔ اس نے بندرگاہ بھی بنائے۔

بر ۲۸۶ ٹیل، سر جیتھرو جسٹینین ہیرس، Teall, Sir Jethro Justanian Harris، ۱۸۴۹ میں پیدا ہوا۔ ارضیات کا ماہر۔ متعدد کتابیں اس فن پر لکھیں۔

بر ۲۸۷ ٹانسلے، آرتھر جورج ، Tansley, Arthur George، ۱۸۷۱ میں پیدا ہوا۔ نفسیات کا ماہر۔ نباتیات پر بھی لکھتا رہا۔ ڈاکٹر میکڈوگل کے ہمراہ نفسیات پر لکھتا رہا۔ اس کی کتابوں کا اثر موجودہ تمدن پر کافی پڑا۔

بر ۲۸۸ سلوسٹر، جیمس جوزف ، Sylvester, James Joseph، (۱۸۱۴-۱۸۹۷) ریاضی داں۔ یہودی ہونے کی وجہ سے کیمبرج میں ڈگری نہ لے سکا۔ لنڈن میں ریاضی پڑھاتا رہا۔ جبر مقابلہ پر تحقیقات کیں۔ اقلیدس پر بھی طبع آزمائی کی۔

بر ۲۸۹ سوامرڈیم، جان ، Swammerdam, Jan، (۱۶۳۷-۱۶۸۰) چھوٹے جانوروں اور کیڑوں کا ماہر۔ ہالینڈ کا رہنے والا تھا۔ بہت عمدہ Dissection کرتا۔

بر ۲۹۰ سیوس، ایڈورڈ ، Suess, Eduard، (۱۸۳۱-۱۹۱۴) ارضیات کا پروفیسر وائینا یونیورسٹی میں درس تدریس کرتا رہا۔ ۱۹۰۵ء میں زمین کے متعلق بڑے پایہ کی کتاب شائع کی۔

بر ۲۹۱ اسٹروفرڈیرچ جارج ولہلم ، Struve, Friedrich George Wilhelm، (۱۷۹۳-۱۸۶۴) اٹو کا ماہر علم ہیئت۔ ۲۰ سال کی عمر میں ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ سر ولیم ہرشل کی تحقیقات کو جاری رکھا۔ اس نے معلوم کیا کہ چونکہ روشنی کائنات میں سفر کرتے کرتے جذب ہو جاتی

ہے کائنات کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لڑکے اٹو (Otto) نے (۱۹۰۵-۱۸۱۹) الدبران کا (Parallax ناپا اور بتلایا کہ زحل کے دائرے چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ پانسو توام ستارے معلوم کئے۔ اس کا پوتا بھی مشہور ہیئت داں ہے۔

نمبر ۲۹۲ اسٹوکن، سر جورج گبرایل ، Stoken, Sir George Gabriel ، (۱۹۰۳-۱۸۱۹) کیمرج کا پروفیسر تھا۔ طیف کے متعلق اہم انکشافات کئے۔ ۱۸۵۳ء میں رایل سوسائٹی نے رمفورڈ میڈل عطا کیا۔ یہ انعام (Fluorescence) پر تحقیقات کرنے سے ملا۔ اس نے ایک قانون اجزائے گرنے کی رفتار کا معلوم کیا جو اس کے نام سے موسوم ہے۔ طبیعیات پر متعدد کتابیں لکھیں۔

نمبر ۲۹۳ اسٹفنسن، رابرٹ ، Stephenson, Robert ، (۱۸۵۹-۱۸۰۳) اڈنبرا کا طالب علم تھا۔ انجن بنانیوالے کا لڑکا تھا۔ کئی پل کینڈا میں بنوا کر مرا۔

نمبر ۲۹۴ اسٹفنسن، جارج ، Stephenson, George) (۱۸۴۸-۱۷۸۱) اسنے پہلا ریل کا انجن بنایا۔ اس انجن کی مدد سے ۳۰ ٹن کوئلہ چار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک مقام سے دوسرے مقام پر بھیجا جاتا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں جب ریل کھلی تو پہلا انجن اسی نے چلایا۔

نمبر ۲۹۵ اسٹارلنگ، ارنسٹ ہنری (Starling, Ernest Henry) ۱۸۶۶ میں پیدا ہوا۔ عضویات کا پروفیسر لندن یونیورسٹی میں تھا جسم کے متعلق تحقیقات کیں۔

نمبر ۲۹۶ اسٹینلے، سر ہنری مورٹن (جان رولنڈس) (Stanley, Sir Henry Morton (John Rowlands) جرنلسٹ تھا۔ بہت سے مقامات کی سیر کی۔ جغرافیہ کا خاص شغف رکھتا تھا۔

نمبر ۲۹۷ اسپنسر، ہربرٹ ، Spencer, Herbert) (۱۹۰۳-۱۸۲۰) کئی سال تک ریل کا انجنیر رہا۔ تعلیم پر فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے مقالے لکھتا رہا۔ اس کی کتاب انگلستان میں بہت مقبول ہوئی۔

نمبر ۲۹۸ اسپلانزانی، لزارد , Spallanzani, Lazaro (۱۷۲۹-۱۷۹۹) کو آتش فشاں کا ماہر۔ اٹلی کا باشندہ تھا۔ علم البادکا بھی شوقین تھا۔ جانوروں کے بچے اور انڈے بنتے پر بھی تحقیقات کرتا رہا۔

نمبر ۲۹۹ سولاس، ولیم جانسن , Sollas, William Johnson ۱۸۴۹ میں پیدا ہوا۔ ارضیات اور حیوانیات کا ماہر تھا۔ چٹانوں کے متعلق تحقیقات کرتا رہا۔ زمین کی عمر کا اندازہ لگایا اکسفورڈ میں ۱۸۹۷ء میں ارضیات کا پروفیسر مقرر ہوا۔

نمبر ۳۰۰ سوڈی، فریڈرک , Soddy, Fredrick ۱۸۷۷ میں پیدا ہوا۔ رتھرفورڈ کے ساتھ کینیڈا جاکر ریڈیم پر تحقیقات کرتا رہا۔ کئی دارالعلوم میں پروفیسر رہا۔ اکسفورڈ میں طبیعی کیمیا کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اور ریڈیم کے خاندان کے اجزا پر ایک مشہور کتاب لکھی۔ بہت سے اعزاز پاتا رہا۔

نمبر ۳۰۱ سمتھ، ولیم , Smith, William (۱۷۶۹-۱۸۳۹) انگلستان کا ارضی نقشہ بنانیوالا تھا۔ اس نے یہ کام اکیلے انجام دیا۔ ارضیات پر ایک مستند کتاب لکھی۔

نمبر ۳۰۲ سمپسن، سر جیمس ینگ Simpson, Sir James Young (۱۸۱۱-۱۸۷۰) اڈنبرا میں تعلیم پائی۔ طب کا پروفیسر تھا۔ اس کا سب سے اہم کام (کلوروفارم) دار وئے بیہوشی کا استعمال ہے۔

نمبر ۳۰۳ شپلے، سر آرتھر ایورٹ , Shipley, Sir Arthur Everett ۱۸۶۱ میں پیدا ہوا۔ کیمبرج میں ماسٹر تھا۔ حیوانیات پر بہت سی مستند کتابیں لکھیں۔

نمبر ۳۰۴ شیرنگٹن، چارلس اسکاٹ , Sherrington, Charles Scott عضویات اور اعصاب کا ماہر۔ اکسفورڈ میں پروفیسر تھا۔

نمبر ۳۰۵ زیخی، انجیلو , Secchi Angelo (۱۸۱۸-۱۸۷۸) اٹلی کا ہئیت داں۔ آفتاب اور ستاروں کا طیف جانچتا رہا۔ ۱۸۶۷ء میں ستاروں کی فہرست اور ۱۸۶۹ء میں سورج کی طبیعیات شائع کی۔

نمبر ۳۰۶ اسکاٹ، رابرٹ فالکن ، Scott, Robert Falcon ،
(۱۸۶۸-۱۹۱۲) سے ۱۹۰۱-۱۳ء تک قطب جنوبی کا راستہ معلوم کیا۔ وہیں اس کا انتقال ہو گیا اور
بہت دنوں کے بعد اُس کی اور اس کے ہمراہیوں کی لاشیں ملیں۔

نمبر ۳۰۷ شوان، تھیوڈر ، Schwann, Theodor ، (۱۸۱۰-۱۸۸۲) برلن میں
۱۸۳۲ء میں عضویات کے صیغہ میں مقرر ہوا۔ اس نے معلوم کیا کہ ہاضمہ میں پیپن (Pepsin)
سے مدد ملتی ہے۔ اس نے حیاتیات پر عمدہ تحقیقات کیں۔

نمبر ۳۰۸ شلیمین، ہنرچ ، Schliemann, Henrich ،
(۱۸۲۲-۱۸۹۰) جرمنی کا رہنے والا تھا۔ دس سال کے عمر میں ٹرائے پر مقالہ لکھا۔ اور بڑے ہو کر
۱۸۷۰ء میں ٹرائے کی جگہ دریافت کی۔ کریٹ کے تمدن کا بھی پتہ چلایا۔

نمبر ۳۰۹ شلیڈن، ماتھیاس جاکوب ، Schleiden, Matthias Jakob ،
(۱۸۰۴-۱۸۸۱) جرمنی میں پیدا ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں جینا کی یونیورسٹی میں نباتیات کا پروفیسر مقرر ہوا۔
اور اہم معلومات جمع کرتا رہا۔

نمبر ۳۱۰ شپریلی، گیوانی ورجینیا ، Schiaperelli, Giovanni Verginia ،
(۱۸۳۵-۱۹۱۰) اٹلی کا ہیئت داں تھا مریخ کے نشانات پر تحقیقات کرتا رہا۔ اس نے یہ نتیجہ اخذ
کیا کہ مریخ پر نہریں اور برف موجود ہیں۔

نمبر ۳۱۱ شیل، کارل وِلھلم ، Scheel, Kark Wilhelm ، (۱۷۴۲-۱۷۸۶)
کیمیا داں تھا۔ جو غربت سے تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ اس نے کلورین، آکسیجن، مینگنیز ، Manganese ؛
اور بیریٹا معلوم کیا۔ بہت اعلیٰ دماغ کیمیا داں گذرا ہے۔

نمبر ۳۱۲ سیفر، سر ایڈورڈ البرٹ ، Schaefer, Sir Edward Albert ،
۱۸۵۰ میں انگلستان میں پیدا ہوا۔ عضویات کا پروفیسر اڈنبرا میں مقرر ہوا۔ عذود کے متعلق تحقیقات کی

جنگ یورپ

آنسہ ریاض فاطمہ بلگرامی

آہ یورپ کی مکدّر ہو گئی کیسی فضا
ہر طرف چھائی ہوئی ہے جنگ کی کالی گھٹا

ہر کوئی سہما ہوا ہر شخص گھبرایا ہوا
خوف سے ارض و سما کا قلب تھرایا ہوا

دیکھنا یہ چرخِ نیلی فام ٹکڑے ہو نہ جائے
زندگانی موت کی کروٹ بدلکر سو نہ جائے

یہ گماں ہے ہر طرف اک زلزلہ آنیکو ہے
اپنے محور سے زمیں جیسے پلٹ جانے کو ہے

بینڈ کی آواز مجروحوں کی چیخیں دل گداز
درد افزا ہے سراپا اختلاطِ سوز و ساز

لُٹ گیا کیا جانے کتنی نازنینوں کا سہاگ
کتنی مائیں مستقل رکھتی ہیں دلمیں غم کی آگ

کتنے دل ہیں پارہ پارہ کتنے گھر ہیں بے چراغ
کتنے آنسو زیب مژگاں کتنے سینے داغ داغ

مدعی تہذیب حاضر کے یہی افرنگ ہیں
بربریت دیکھکر جنکی درندے دنگ ہیں

غزل

جناب راج بلدیو راجؔ

بہت پچھتائے گا او روٹھنے والے خفا ہو کر
کہ گُل گُل ہی نہیں رہتا ہے کانٹوں سے جُدا ہو کر

کہاں جانا تھا مجھ کو اور کہاں لا کر کیا رُسوا
نگاہِ شوق نے دھوکا دیا ہے رہنما ہو کر

مجھے طوفان لے جاتا جہاں میرا مقدر تھا
ڈبویا ہے مری کشتی کو تم نے ناخدا ہو کر

بیاں کیا حالِ دل ہو جب محبت کا یہ عالم ہے
شکایت بھی مرے ہونٹوں پہ آتی ہے دُعا ہو کر

عجب دستور ہے اے راجؔ دنیائے محبت میں
جفائیں سامنے آتی ہیں پاداشِ وفا ہو کر

قدیم دکنی مثنویاں

جناب شفقت اللہ کرمانی؛ علیگ

جس طرح سے اُردو زبان کی پیدائش، نشو و نما اور اس کے قایم و برقرار رکھنے کا سہرا دکن کی سرزمین کے سر ہے اسی طرح سے شاعری کی ایک اہم صنف یعنی مثنوی کی داغ بیل بھی اسی چمن زار میں پڑی اس صنف کو جو فارسی زبان کے اثر سے ہماری زبان میں آئی اور ہماری ہو رہی اپنا لینا اسی خطے کے شعراء کا طرۂ امتیاز رہا۔ اور اس کا شرف انہیں ہی حاصل ہے۔ گو کہ شروع شروع میں اکثر تراجم ہوئے اور طبعزاد مثنویوں کی کمی تھی۔ اور اگر طبعزاد تھیں بھی تو انھیں کوئی خاص ندرت اور جدت نہیں پیدا کی گئی اور فارسیت کا اثر کارفرما رہا۔ یہ کسی حد تک حق بجانب بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مثنوی اس وقت تک فارسی ادب تک محدود تھی اور جب اُردو میں فارسی اثرات آنا شروع ہوئے تو مثنوی تو آگئی لیکن اپنے ساتھ فارسی خصوصیات لانے سے باز نہ رہ سکی۔

ان مثنویوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہندی اور بھاشا کے الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ فارسی الفاظ اور اکثر محاورات بجنسہ اور اکثر ترجمہ ہو کر ملتے ہیں۔ یہ چیزیں آگے چلکر زبان کے نشو و نما اور ارتقا میں بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوئیں اور انہوں نے اُردو کو سدھارنے اور سنوارنے میں نمایاں حصّہ لیا۔

شروع میں ہم کو مثنوی نگاروں کے سلسلہ میں شاہ میران جی متوطن بیجاپور کا نام ملتا ہے ہم یقین کیساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلی مثنوی آپ ہی کے قلم سے نکلی لیکن یہ خیال ہے کہ "خوش نامہ" اُن کی اوّلین مثنوی ہے اور اُردو زبان کی مثنویوں میں اوّلیت کا سہرا اس کے سر باندھا جا سکتا ہے۔

آپ اپنے لقب شمس العشّاق سے مشہور تھے اور فارسی اور عربی میں کافی دخل رکھتے تھے آپ کو اُردو سے بھی خاص لگاؤ تھا اور درس و تدریس اسی زبان میں کیا کرتے تھے۔ تصنیف و تالیف سے بھی آپکو خاص شوق تھا اور نظم نثر میں کئی کتابیں آپ کے قلم سے نکلیں جن میں دو مثنویاں بھی ہیں۔

پہلی مثنوی خوش نامہ ہے جس میں ایک سو سترہ اشعار ہیں اس میں ایک نوخیز لڑکی کا حال نظم کیا گیا ہے۔ یہ اپنے مُرشد کی پرستار تھی اور مُرشد کو بھی اس کے ساتھ خاص اُنس تھا۔ دیگر حالات کے ساتھ ہی ساتھ مرشد کے کمالات اوصفات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسکا انتقال شاہ پور میں سترہ سال کی عمر میں ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک سو ستر شعر ہیں۔

خوش نغز شمس العشاق کی دوسری مثنوی ہے۔ اس میں اُسی لڑکی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اور مذہب کے رموز سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں لڑکی کے سوالات اور مُرشد کے جوابات منظوم ہیں اور یہ ۲۷ شعر پر مشتمل ہے۔

ان کی تیسری مثنوی شہادت الحقیقت خاصی بڑی نظم ہے اور ان کی دیگر مثنویوں سے نسبتاً سلیس ہے۔ پہلے حمد و نعت ہے۔ اور اس کے بعد اپنے پیر کا ذکر ہے پھر تصوف کے مسائل میں موشگافیاں کی ہیں۔

حمد میں لکھتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم توسبحان
یہ سب عالم تیرا رزاق سبھون گیرا
تجہ بن اور نکوئے نا خلق دوجا ہوئے
جے تیرا ہوئے کرم تو ٹوٹے سبھی بھرم
اس کارن تجھکو دہاون اور تیرا نام لیوں
تجھ بن تاکون جانے اور پوری صفت لکھانے

شاہ میراں جی کے صاحبزادہ شاہ برہان الدین جانمؔ اُنکے خلیفہ تھے ماحول کا انسانی فطرت پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اردگرد علمی اور ادبی فضا دیکھ کر آپ کو اس سے لگاؤ پیدا ہوا اور آخر تک اردو ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔

انہوں نے کئی نظمیں اور مثنویاں لکھی ہیں جن میں سے وصیت الہادی اور منفعت الایمان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

وصیت الہادی میں تصوف اور اس کے متعلقات سے بحث کی گئی ہے۔ دوسری منفعت الایمان ہے جو ۱۲۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں دہریوں کے عقائد کو رد کیا ہے اور مریدوں کو نصیحت کی ہے کہ اپنا دامن ان مضرت رساں اثرات سے آلودہ نہ ہونے دیں۔ جہاں تک طرز تحریر اور انداز سخن کا تعلق ہے یہ شاہ جانم کا شاہ کار ہے۔

کوئی کہین سب عشق تمام　　　عشق کے آنکھیں کیا ہے خہام
عشق لیا ہے سب پھر باس　　　عشق تھے سگلا بھوگ بلاس
بعض آکھین اپنی بوجھ　　　معلوم نہیں کچھ اس کی سوجھ
ایک جمع سب پکڑیا بار　　　جونکے بیج تھے۔ نکلیا جھاڑ
کانٹا چھانٹا پھل اور پھول　　　شاخ برگ سب دیکھ اصول
ایک جمع کر راکھیں باز　　　بیج بینے کا ناہیں بھار
سکتا قادر قدرت سون سمجھے تجھ کون کوئی بکا　　　جس کون بوڑے دیوے راہ کہیا [منفعت الایمان میں شاہ]
یہ روپ بوگٹ آپ چھپایا کوئی بنایا انت　　　مایا موہ میں سب جگ باندھیا کیونکر سوجھے نیت
(وصیت الہادی)

احمد آباد گجرات کے رہنے والے ایک بزرگ خوب محمد چشتی نے بھی تصوف پر نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی سب سے مشہور اور مقبول کتاب خوب ترنگ ہے جو ۹۸۶ھ میں تصنیف ہوئی یہ خالص تصوف کی نظم ہے اور صوفیانہ اصطلاحات میں تصوف کے مقامات کا بیان ہے۔

نمونۂ کلام دیکھئے -

چون کھلیا سمند چھپائے ۔۔۔ جانے سب دریائے جائے
نوک ننھیں دریا بن پار ۔۔۔ بھرے تو توج کی معقدار
جیوں ظاہر بھیتاں کھلائیں ۔۔۔ بن انٹیاں اس بھانت دکھائیں
ذرے مسل اک ٹولا ٹھانا ۔۔۔ ناوں دھریا ہے اینٹ سوتانا
جوہر عرض سو ذرہ جان ۔۔۔ تلتل بھرے عرض من آن

اس کے بعد ہم کو وجہ الدین وجہدی کی مثنوی تحفۂ عاشقاں ملتی ہے۔ اس کے بارہ میں خیال یہ ہے کہ یہ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی خسرونامہ کا ترجمہ ہے۔ اس کا نام تاریخی ہے اور اعداد شمار کرنے سے ۱۰۱۵ آتے ہیں اس لئے یہ یقین ہے کہ یہ ۱۰۱۵ھ میں تصنیف ہوئی۔ کتاب میں کہیں سنۂ تصنیف کا تذکرہ نہیں لیکن آخر میں ایک شعر میں اعتراف کر لیا گیا ہے کہ تاریخی نام ہے۔

دیسے اسکی تاریخ مجکو عیاں ۔۔۔ پچا نو ایسے تحفۂ عاشقاں
پہچا نو آئے

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

کروں پاک دل ہور پاک زبان سون ۔۔۔ تنا پاک اس عاشق پاک کون
اور ۔۔۔ سے
کہ جس سے ہوا ہے وہ گم عشق کا ۔۔۔ اچون لک اُبلتا ہے خم عشق کا
اُتنی
پڑیا عکس اس نور کا جس رخن ۔۔۔ جھلکنے لگا آرسی کے ہنن
رخ پر ۔۔۔ طرح
سو اس آرسی میں کیا جیون نظر ۔۔۔ ہوا عاشق اپنا اپس دیکھ کر
اپنے
اپس کچھ پرتو کون معشوق جان ۔۔۔ لیا مبتلا ہو کے عاشق کی شان

اس کے بعد ہم محمدقلی قطب شاہ کی طرف آتے ہیں۔ گول کنڈے کے اس سلطان نے اپنی طاقتیں صرف حکمرانی اور عدل گستری ہی کی طرف نہیں رکھیں بلکہ اقلیم سخن پر بھی چھاپا مارا اور کافی عرصہ تک اردو نظم میں شاعری کرتا رہا۔ اسی کی تصانیف کے مجموعہ کلیات محمدقلی قطب شاہ میں مختلف اصناف سخن مثلاً مثنوی قصیدہ مرثیۂ غزل ملتی ہیں۔ سادگی اور لطافت میں اس کا کلام حافظ سے جا ملتا ہے۔ فارسی اثر سے عاشقانہ اور صوفیانہ مضامین دونوں اس کے کلام میں اپنی بہار دکھاتے

ہیں۔ مناظر قدرت کی صناعی میں وہ نظیراور سودا سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ اس کو جذبات انسانی کی عکاسی میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ اس کی تصانیف میں خاص کر مثنویوں سے ہم کو اس عہد کے رسم و رواج، روایات اور شادی بیاہ، میلہ ٹھیلے سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔

اس نے کئی مثنویاں پھلوں اور میوؤں پر لکھی ہیں۔ اس میں صرف ایران کے پھلوں کا حال نہیں لکھا بلکہ ہندوستان کے ہرقسم کے پھلوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان میں بڑکی، بڑولی، بنولی وغیرہ کو بھی بیان کرنے سے ہاتھ نہیں روکا۔ سبزترکاریوں کے احوال میں ایک مثنوی لکھی ہے'' وراس میں دھنیا اورک لہسن تک کا ذکر ہے۔ ایک دوسری مثنوی میں شکاری پرندوں کا حال بیان کیا ہے اور ان کی خصوصیات لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد مثنویاں شاعر نے اپنے محلات' اس وقت کے رسم ورواج شادی بیاہ کی رسوم سالگرہ، شب برات، میلا دالنبیؐ برسات، ہولی بسنت پر کہی ہیں۔ دو مثنویاں پان اور ہاتھی پر ان کے قلم سے نکلی ہیں۔ دو مکالمے صراحی و پیالہ اور کالی گوری پر لکھے۔

گو کہ ان مثنویوں کی حیثیت معمولی ہے اور شاعری کے اعتبار سے ہم انکو بلند نہیں کہہ سکتے لیکن اس لحاظ سے اُس نے عشق و محبت کی راہ میں اپنے کو گُم نہیں ہوجانے دیا اور قدرت اور فطرت کی صنعتوں اور گلکاریوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کیں، نیز رسم ورواج اور تیوہاروں کا بھی حال بیان کیا ہے ہم ان کو اُردو ادب میں اہم جگہ دے سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہم کو گولکنڈہ ہی کا ایک اور فاضل شاعر ملا وجہی ملتا ہے۔ اس نے نظم ونثر میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ نثر میں اس کی کتاب سب رس اس زمانہ کے لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے نظم میں اس کی مثنوی قطب مشتری بلند درجہ رکھتی ہے۔

اس کے بعد ملا وجہی کی معرکتہ لآرا تصنیف" قطب مشتری" آتی ہے۔ یہ حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب نے شائع کی ہے۔ اس میں سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کے عشق کا حال ہے۔ قصہ کی نوعیت قدیم ہے۔ قلی قطب شاہ بہت ہی ارمانوں اور منتوں کے بعد پیدا ہوئے۔ اس پر بہت ہی خوشیاں منائی گئیں، جشن ہوئے اور خیر وخیرات کی گئی۔ بڑے ہوئے تو زمانہ کے رواج کے مطابق

تعلیم و تربیت ہوئی۔ ایک روز سوتے میں ایک پری پیکر کو دل دے بیٹھے پھر کیا تھا۔ سوتے جاگتے اسی کا تصور دماغ میں رہنے لگا۔ بالآخر اپنے مشیر عطارد مصور کو لیکر اس کی تلاش میں نکلے۔ راستہ کی تکالیف اور سفر کی دشواریاں حائل ہوتی ہیں مگر عشق صادق ہے اور طلب راست تمام مصائب پر حاوی ہو جاتے ہیں اور بنگالہ پہونچتے ہیں۔ وہاں اس رشک حور سے ملاقات ہوتی ہے۔ ملاقات محبت تک بڑھ جاتی ہے اور شاہزادہ صاحب اسے گولکنڈہ لے آتے ہیں جہاں دونوں کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہو جاتی ہے۔

یہ مثنوی جیسا کہ ملا نے خود لکھا ہے ۱۰۱۸ھ میں بارہ روز میں لکھی گئی۔

تمام اس کیا دیس بارا میں سنہ ایک ہزار ہور اٹھارہ منے

وجہی کا کلام بہت سلیس صاف اور ستھرا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مثنوی قدیم دکنی زبان میں اس عہد کی اور مثنویوں کی طرح لکھی گئی ہے اس کی وجہ سے ہم کو بہت سے متروک اور غیر مانوس الفاظ اور محاورات ملتے ہیں۔ لیکن پھر بھی خیالات بہت بلند ہیں اور بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں۔ شعر کی ماہیت، لوازمات اور تعریف میں اس نے جو اشعار "در شرح شعر" کے عنوان سے لکھے وہ بہت اعلیٰ اور بلند ہیں۔

عطارد مشتری (ہیروئن) کے خلوتکدۂ ناز میں نقاشی کرتا ہے اور چالاکی سے شہزادہ کی تصویر بھی بنا دیتا ہے۔ مشتری جب اس تصویر کو دیکھتی ہے تو عشق اپنا کام کرتا ہے اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑتی ہے اس کی دائی یہ ماجرا دیکھ بہت پریشان ہوتی ہے اور ہوش آنے پر اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا۔ پہلے تو شرم مشتری کا دامن تھامتی ہے مگر بعد میں دل کا راز زبان سے فاش ہو جاتا ہے دائی خود بھی تصویر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتی ہے مگر جبراً اور رسماً نصیحت کرتی ہے۔ یہ وعظ و پند کا دفتر اور وہ بھی ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار عورت کی زبان سے بہت قابل قدر اور حقائق اور راستی پر مبنی ہے وہ دنیا کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف اور دوسروں کے تلخ تجربوں سے سبق حاصل کر چکی ہے اور اسے خوب معلوم ہے کہ جو وہ کہتی ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ اس کو مدنظر رکھ کر اسی کے چند اشعار پڑھیئے۔

توچنچل چنیز نار اتنی سی ہے　　بڑی چھند بھری بھوت فتنی سی ہے
یو کیا اپنے عشق جو توں کری　　بھلی ہے توں شاباش جو نیں ڈری
برت پنت میں تو نوی آئی ہے　　ابھوں نینہ کے چرکے نہیں پائی ہے
عشق بازی دھن کچھ نہنا کام میں　　نہنی ہے تو اجوں بجے فام میں
بکی توں بجے بدر بکی آئی ہے　　کہ کاندان کے نقشان سوں جیونائی ہے
توں اس نقش سوں عشق سازی اہے　　ہو نینہ میں طفلاں کی بازی اہے
عشق کیا ہے کرکے پچھانی ہے توں　　گذیاں کا مگر کہیں جانی ہے توں
انگے عشق کیا ہے سو جانے گی توں　　بڑی ہوگی سو پچھانے گی توں
توں صورت ستی جیو پکا لائی ہے　　توں صورت منے معنی کیا پائی ہے
اگر معنی سوں جیو توں لائے گی　　تو صورت تے بھل بھی توں کچ پائے گی

نت نئی تشبیہات اور استعارات میں ملا وجہی کو یدطولیٰ حاصل ہے۔ "سب رس" میں وہ ایک شئے کو بلا مبالغہ دس دس بیس بیس چیزوں سے تشبیہہ دیتا چلا گیا ہے اور اس انداز سے وہ انکو لایا ہے کہ وہ طبیعت پر مطلق گرانی نہیں کرتیں بلکہ دلچسپی اور حسن کلام کو اور چار چاند لگا دیتی ہیں۔ قطب مشتری میں بھی وہ جگہ جگہ پر نادر اور صاف تشبیہیں اور استعارے لایا ہے۔

معشوق کے گھوڑے پر سوار ہونے کو ذیل میں نئی چیزوں سے تشبیہہ دی ہے۔ جیسے دھنوئیں میں روشن انگارہ، یا ناگ کے سر پر من یا کوتے پر مور بیٹھا ہو یا جیسے اندھیری رات میں مشعل جل رہی ہو۔

ہوئی سوار شبرنگ ترنگ ہر دو نار　　دھوئیں میں اچھیں جیوں جھلکتا انگار
پدم جگمگے جوت سون ناگ پر　　کہ طاؤس بیٹھا مگر کاگ پر
سو شبرنگ ترنگ پر اچھے نازیوں　　کہ مشعل دسے رات اندھاری میں جیون

(باقی)

قطعہ تاریخ

ضیاء احمد صاحب بدایونی

بر وفات فاضل مبرور ادیب مشہور حضرت احسن مارہروی مرحوم و مغفور رحمۃ اللہ الیہ و افاض شآبیب الرحمۃ علیہ

وہ جنابِ احسن مارہروی — خدمتِ شعر و ادب تھا جن کا کام
حاج و زائر۔ حافظِ قرآنِ پاک — یادگارِ عترتِ خیر الانام
زینتِ سجادۂ برکاتیہ — وارثِ اخلاقِ آبائے کرام
جانشینِ مسندِ استاد داغ — شاعرِ خوشگو۔ ادیبِ نیکنام
نکتہ دانی میں فریدِ ملک و قوم — بذلہ سنجی میں شہیرِ خاص و عام
کرگئے دنیائے فانی سے سفر — جا بسایا گلشنِ دار السلام
کھو کے ایسے جامعِ اوصاف کو — کیوں نہوں وقفِ غم و حسرت تمام
یاد آئیں گی جب اُن کی صحبتیں — تڑپے گا سینے میں قلبِ مستہام
ہے دعا حق سے کہ اُن کی قبر پر — بارشِ بارانِ رحمت ہو مدام

ہے ضیاؔ گر فکرِ تاریخِ وفات
لکھ۔ وصالِ شاعرِ شیریں کلام
۱۳۵۹ھ

جناب محمد حاذق صاحب (علیگ)

نذرِ حاذق

بیادِ عزیز حضرت مولانا ابوبکر محمد شیث غفراللہ لہ وجعل الجنۃ مثواہ سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ابوبکر آن عالم باعمل — کہ بودہ چو ہمنامِ خود بے عدیل
بفطرت سلیم و بفکرت عظیم — برائے و تدبر مصیب و اصیل
نہ در حسنِ اخلاق اورا نظیر — نہ در بذل اموال اورا مثیل
برآداب انفاسِ پاکش گواہ — براخلاص نورِ جبینش دلیل
نظامت وقارِ دگر یافت زو — کہ بودہ بگوہر فرید و جلیل
صفاتش کجا و بیانم کجا — قلم سرنگون و صریرش کلیل
بجز صبر در این غم جان گزا — چہ بایست کردن فصبرٌ جمیل
الٰہی بحق رسولِ کریم — بہ بخشائے اورا بلطف جزیل
الٰہی باصحاب و آل نبیؐ — کنی رحمتِ خویش اورا وکیل
چو فکرے نمودم بسال وصال — کہ باشد بیادِ عزیزش کفیل

سروشے نداز د۔ ابوبکر شیث
بمینو بیامد بحکمِ جمیل
۱۳۵۹ھ

البیرونی کی کتاب التفہیم اور قانون مسعودی

جناب سید حسن برنی
بی۔اے۔ایل ایل۔بی (علیگ)

نوٹ: جناب سید حسن برنی۔ بی۔اے۔ایل ایل۔بی (علیگ) کے اس اہم مضمون کے موصول ہونے پر ہم نے مولانا یعقوب بخش صاحب راغب سے جو علی گڑھ میں قانون مسعودی کا ترجمہ کر رہے ہیں، درخواست کی وہ اس ترجمہ کی اہمیت اور اس کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالدیں تاکہ ایک طرف فاضل مقالہ نگار کو علم ہو جائے کہ علی گڑھ میں یہ علمی کام کس طرح ہو رہا ہے، دوسرے اُردو داں طبقہ کو بھی اس کی تاریخ معلوم ہو جائے۔ ہمیں مسرت ہے کہ انہوں نے ایک مختصر نوٹ میں یہ سب باتیں لکھ دی ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کے ساتھ ہم یہ نوٹ بھی شائع کر رہے ہیں۔

اڈیٹر

ایران کے موجودہ دور میں اس بات کی خاص طور پر کوشش کی جا رہی ہے کہ علاوہ قابل قدر نئی تصانیف و تالیفات کے قدیم ایرانی ادیبوں اور دوسرے نامور مصنفوں کی نادر و قابل قدر کتابیں کامل اہتمام اور حسن و خوبی کے ساتھ شائع کی جائیں۔ چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر علامۂ اجل البیرونی کی کتاب التفہیم کا وہ مطبوعہ فارسی نسخہ ہے، جو ایک ایرانی فاضل جلال ہمائی کی تصحیح و مقدمہ و حواشی کے ساتھ حال ہی میں چاپخانۂ مجلس سے شائع ہوا ہے۔

اسی کتاب کا عربی متن مع انگریزی ترجمہ کے ایک محدود ایڈیشن کی شکل میں اس سے پیشتر انگلستان سے شائع ہو چکا ہے، جس سے اس طباعت میں کسی قسم کا استفادہ نہیں کیا گیا ہے، نہ بظاہر اس کا علم ہی فاضل مصحح کو معلوم ہوتا ہے، اگرچہ صاحب موصوف نے اس فارسی طباعت میں اپنے ملک کے ایک عربی قلمی نسخے سے مدد لی ہے۔ بہرحال موجودہ طباعت بجائے خود نہایت اہتمام بالشان ہے اور اپنے معیار

کے لحاظ سے اہل ایران کے لئے قابل فخر۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ البیرونی کی تصانیف جو دستبرد زمانہ سے باقی رہ گئی ہیں، وہ سب رفتہ رفتہ شائع ہو رہی ہیں۔ اور اس مضمون کے لکھنے سے اس وقت ہماری یہ بھی غرض ہے کہ اُس کی سب سے بڑی تصنیف یعنی قانون مسعودی، جس کی طباعت و اشاعت کا ذمہ علی گڑھ نے عرصہ دراز سے لے رکھا ہے، جلد از جلد زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل نظر کے سامنے آجائے۔

مسلم یونیورسٹی کے بزرگوں کے لئے یہ امر قابل غور ہے کہ حیدرآباد کے دائرۃ المعارف نے بھی حال ہی میں البیرونی کی کتاب الجماہر، جو جواہرات سے بحث کرتی ہے، شائع کی ہے۔ اور اب ایران سے کتاب التفہیم شائع ہوئی ہے، جو ایک طرح پر قانون مسعودی کے پیش رو کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا، کہ قانون مسعودی البیرونی کی سب سے اہم اور سب سے مشکل تصنیف ہے، اور اگر خیر و خوبی کے ساتھ علی گڑھ کے اہل علم اُس کے متن کو ہی شائع کر دیں تو وہ ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہوگا، جس پر وہ ہر طرح مبارکباد کے مستحق ہوں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کتاب التفہیم فارسی کے مصحح فاضل جلال ہمائی کی نظر سے قانون مسعودی گذری ضرور ہے، اگرچہ انڈکس و حواشی پر نظر ڈالنے پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ موجودہ طباعت میں اُس سے کوئی قابل اعتنا استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔

جہاں تک کہ تفہیم کا تعلق ہے وہ قانون مسعودی کی نہ ہمپایہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، نہ اُسکا بدل قرار پا سکتی ہے۔ اوّل تو یہ کتاب بطور "مدخل"[۵] کے لکھی گئی ہے، اور اُس سے نو آموزوں کی تعلیم مقصود ہے اسی لئے سوال و جواب کی شکل میں اس کے اندر ابتدائی و بنیادی معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔ علاوہ اسکے یہ تصنیف البیرونی کی ایک ہم وطن خاتون ریحانہ بنت الحسن الخوارزمیہ کے لئے لکھی گئی تھی، جو علم النجوم میں پوری مہارت حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ اس فن میں دستگاہ پیدا کرنے کے لئے ہندسہ (Geometry)، حساب (Arithmetic)، جبر و مقابلہ (Algebra)

---

[۵] اس لفظ کا ترجمہ انگریزی میں (Introduction) ہو سکتا ہے

ہئیت (Astronomy) یعنی آسمان وزمین کے متعلق بنیادی مسائل کا جاننا بھی ضروری تھا اس لئے محض تمہیدی طور پر البیرونی نے کتاب التفہیم کے ابتدائی حصوں میں ان مضامین سے بھی بحث کی ہے لیکن اس کتاب کا اصل مقصد "علم التنجیم" یعنی فن نجوم ہی ہے، جس پر کتاب کا نصف سے کچھ ہی کم حصہ کام میں آیا ہے[1]

غالباً علم نجوم پر یہ کتاب البیرونی کی بہترین تصنیف ہے، اور جو لوگ اس قدیم شعبے میں علمی و تاریخی مطالعہ اور تحقیقات کرنا چاہیں، ان کے لئے ایک بہترین ماخذ - لیکن علم ہئیت پر قانون مسعودی مسلمانوں کی علمی تاریخ میں سب سے بڑی اور سب سے شاندار تصنیف کا پایہ رکھتی ہے، جس نے اس علم کی سب پچھلی تصانیف کو ماند کر دیا تھا، اور جس کے بعد بھی کوئی اس فن کی کتاب اسلامی دور میں اس کی سطح تک نہیں پہونچ سکی -

کیا البیرونی نجوم پر اعتقاد رکھتا تھا ؟

یہ بحث خالی از دقت نہیں۔ خود اس نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ اکثر لوگ علم نجوم ہی کو اصلی ثمرہ علوم ریاضیات کا سمجھتے ہیں۔ اگرچہ میری ذاتی رائے اس بارہ میں ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہے، جو کمترین تعداد میں ہیں۔ اس کے معنی بظاہر یہی ہو سکتے ہیں کہ میرا ذاتی اعتقاد اس پر نہیں ہے، یا بہت کم ہے -

" و نزدیک بیشترین مردمان احکام نجوم
ثمرۂ علمہائے ریاضی است ہرچند کہ
اعتقادِ من اندریں ثمرہ واندریں صناعت
مانند اعتقاد کمترین مردمان است" (ص ۳۱۶)

کہیں کہیں اس نے مکار اور فریبی نجومیوں کی مذمت بھی کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہیں اصل فن کے جاننے والوں کے حق میں "بدنام کنندۂ نکونامے چند" کی نظر سے دیکھتا ہے :-

---

[1] البیرونی خود لکھتا ہے " تصدر پرسندہ این بود" (ص ۳۰۶)-

"واما حشویان منجمان کہ تمویہ و رزق
دوست تر دارند از راہ راست" (ص ۵۳۸)

البیرونی کی دیگر تصانیف، مثلاً کتاب الھند و آثار الباقیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسکی نظر میں اس علم کی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور تھی، جس کی وجہ سے اُس نے اس خاص شعبہ کو اپنی علمی تحقیقات کا ایک خاص مرکز قرار دے رکھا تھا۔

بہرحال یہ پورے طور پر ثابت ہے کہ اہل زمانہ اور بالخصوص اپنے سرپرست سلاطین کی نظر میں البیرونی بحیثیت ایک نجومی کے خاص امتیاز رکھتا تھا۔ جس کے ثبوت میں مختلف تاریخی شواہد موجود ہیں جو اگر صحیح ہوں تو ضرور حیرت انگیز کہے جا سکتے ہیں۔

اوّل تو البیرونی نے اپنے ایک رسالے میں جو اپنی اور رازی کی تصانیف کی فہرست میں ہے، اپنی عمر کے متعلق ایک ایسی پیش گوئی بیان کی ہے، جو بعد میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ وہیں بطور معذرت اُس نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرض و مصیبت کی حالت میں انسان ایک حد تک سریع الاعتقاد اور وہم پرست ہو جاتا ہے اور ایسی چیزوں کو ماننے لگتا ہے۔

ایک اور عجیب و غریب پیش گوئی کا قصہ میں اپنی کتاب البیرونی میں لکھ چکا ہوں[۵] جو ادبی کتابوں میں افسانہ کے طور پر یادگار ہے۔ ایک اور قصہ اس وقت فاضل بیہقی کی تتمہ رضوان الحکمۃ سے نقل کرتا ہوں، جس میں البیرونی کی حیرت انگیز مہارت علم نجوم کو ظاہر کیا گیا ہے۔

حکیم ابوالخیر کے حالات میں لکھا ہے کہ "حکیم ابوریحان منجم نے پیش گوئی کی تھی کہ فلاں دن اُسے ایک ایسا حادثہ پیش آئیگا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ اُسی دن سلطان محمود نے اُسے لانے کے لئے نوکر اور سواری بھیجی لیکن جس وقت حکیم مذکور بازار موزہ گراں سے گذر رہا تھا گر کر ہلاک ہو گیا۔ (ص۵۹ مطبوعہ ایران)

الغرض یہ ممکن ہے کہ البیرونی کا نجوم پر کچھ اعتقاد ہو، اگرچہ اُس جیسے روشن خیال اور صحیح دماغ رکھنے والے حکیم سے اس کی بہت کم امید ہے۔ لیکن اُس دور کے بہت سے حکما نجوم کے معتقد تھے، اور

---

۵ دیکھو البیرونی طبع دوم ص ۶۸۔

ہمارے زمانے میں بھی ایسے علما موجود ہیں جو ستاروں کے اثرات کے قائل ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ عام طور پر اس زمانہ کے اہل علم کی نظر میں کتاب التفہیم کی دلچسپی زیادہ تر ان ابتدائی حصص تک ہی محدود رہے گی۔ جو نجوم کو چھوڑ کر دوسرے علوم ریاضی سے بحث کرتے ہیں۔ خوش بختی سے کتاب کے یہ حصے بجائے خود بے مایہ نہیں ہیں، گو ان کا قانون مسعودی سے مقابلہ کرنا عبث ہے۔ کتاب التفہیم جابجا ایسی قیمتی معلومات سے مالا مال ہے۔ جو اہل بصیرت کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں بلکہ اس میں جابجا اشارتاً اکثر چھوٹی سے چھوٹی کے مسائل کا ذکر آجاتا ہے، جن کی تفصیل کے لئے قانون مسعودی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

مثال کے طور پر مساحت کرۂ ارض کی بحث میں کتاب التفہیم میں البیرونی اس سوال کے جواب میں "پس اندازۂ زمین چند است؟" صرف اس قدر بتلایا ہے کہ "مستعمل و معروف مساحت" کے رو سے قطر "دو ہزار و صد و شصت و سہ فرسنگ است و چہار دانگ فرسنگ" اور دور "شش ہزار و ہشتصد فرسنگ" آگے چلکر "ہیچ خلاف ہست اندر مقدار زمین"؟ اس سوال کے جواب میں لکھتا ہے:۔

"یہ ناگزیر ہے، اس لئے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ جس کا تعلق آزمائش سے ہے۔ ہر گروہ نے اسے اپنے نواح کے اصطلاحی مسافتوں میں معلوم کرنا چاہا ہے۔ مثلاً یونانیوں نے "استادیوس" کی ناپ سے، ہندوؤں نے جوژن ریوجن اسے ۔ اسی باعث سے جب کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں، اور ان اندازوں کا صحیح حال معلوم نہ ہو سکا تو ہارون الرشید کے بیٹے خلیفہ مامون نے حکم دیا کہ زمین کا اندازہ از سر نو جانچا جائے، اور دانایان زمانہ میں سے خالد مرورودی ابو البختری مساح۔ اور علی بن عیسیٰ اسطرلابی اور ان جیسے بہت سے لوگوں کو دست سنجار کی طرف بھیجا کہ اپنے طریقہ پر ان لوگوں نے زمین کے سب سے بڑے دائرے کی ایک درجہ پیمائش ۵۶ میل چہار دانگ میل نکالی اور اسے ۳۶۰ میں ضرب دیکر کل دور زمین کی پیمائش بقدر ۲۰۴۰۰ میل نکالی۔ ہر میل ۳ فرسنگ کا تھا۔ اور ہر میل کی لمبائی چار ہزار رس سو دائی ہے۔ جو سوداعراق کا مشہور پیمانہ ہے جس سے بغداد میں زمینیں ناپی جاتی ہیں"

۵۔ دیکھو البیرونی طبع دوم ب ص ۱۸۸-۲۰۲، جہاں اس بحث پر تفصیل سے نظر ڈالی گئی ہے اور البیرونی کی مساحت کرۂ ارض کی اہمیت د بر تری واضح کی گئی ہے۔

یہ ۴۴۲ انگشت کا ہوتا ہے ۔

میں نے بھی ہندوستان کی سرزمین میں دوسرے طریقوں پر جانچا تو اس مقدار سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں پایا۔ (ص ۱۵۶ تا ۱۶۴)

اب اگر ہمیں اس سب کی تفصیلات دیکھنی ہوں تو قانون مسعودی میں ملے گی، جہاں البیرونی نے اپنی پیمائش کا پورا حال اور طریقہ درج کر دیا ہے۔ بتدی کے لئے اس کی نظر میں اتنی ہی معلومات کافی ہیں، اور ایک ماہر استاد کی طرح وہ اُسے ایسے مشکل مسائل سے جو اُس کی طاقت اور سمجھ سے باہر ہوں گراں بار کرنا نہیں چاہتا۔

موجودہ فارسی طباعت کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ علمی و ادبی دونوں نقطۂ نظر سے خاص پایہ رکھتا ہے۔ مصنف کا تبحر خواہ وہ کیسی ہی ابتدائی تصنیف پر قلم اٹھائے، ہر جگہ نمایاں ہے۔ البیرونی ایک اعلیٰ درجہ کا ادیب بھی تھا اور فاضل مصحح کا عقیدہ ہے کہ یہ فارسی متن بھی خود اُسی کے قلم کا رہین منّت ہے۔

عربی اور فارسی متنوں کے مقابلے کے بعد کوئی کلام نہیں رہتا کہ دونوں ایک دوسرے سے بڑی خوبی و عمدگی کے ساتھ باہم مطابق ہیں۔ جو زبان فارسی متن میں استعمال ہوئی ہے، وہ بلاشبہ فردوسی اور بیہقی کے زمانہ یعنی ابتدائی غزنوی دور کی ہے۔ ابن سینا اور البیرونی دونوں وسط ایشیا کے رہنے والے تھے، اور فارسی دونوں کی مادری زبان تھی۔ ابن سینا نے فلسفے میں دانشنامۂ علائی فارسی میں لکھا ہے، جو ایک ابتدائی تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانہ میں اس کتاب کی زبان کہنگی کی وجہ سے لوگوں میں آسانی سے سمجھی جانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی کی لٹن لائبریری میں کتاب التفہیم فارسی کے جو دو قلمی نسخے موجود ہیں اُن میں سے نیتر رخشاں مرحوم کا نسخہ تو اس قدیم متن کے مطابق ہے، لیکن دوسرا نسخہ جو زیادہ پُرانا ہے وہ زیادہ جدید زبان میں لکھا ہوا ہے اور غالباً براہ راست عربی سے ترجمہ ہوا ہے اور عربی الفاظ جو اصطلاحی حیثیت سے بعد کے لوگوں کے لئے زیادہ قریب فہم ہیں زیادہ کام میں لاتا ہے

ے دیکھو البیرونی طبع دوم ص ۱۳۲ - ۱۳۵

جو لوگ عربی نہ جانتے ہوں، اُن کے لئے مطالب کتاب کے سمجھنے میں اس دوسرے نسخے سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اور اگر کوئی علم دوست بزرگ اس نسخے سے مقابلہ کرکے کارآمد اختلافات معلوم کرسکیں تو خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ یہ نسخہ جانچنے کے بعد اگر اچھا ثابت ہو تو وہ بذریعہ فوٹو شائع ہو سکتا ہے۔

فاضل ہمائی نے اپنے مقدمہ میں تمام تر کتاب کی مُعرّفی اور اُس کے ادبی خواص اور پانچوں نسخوں کی خصوصیات سے بحث کی ہے، اور خارج از مقصد مباحث سے بالکل اجتناب کیا ہے، جو نہایت قابل تعریف ہے۔ اسی ضمن میں انہوں نے فنون ریاضی، بالخصوص ہیئت و نجوم کے میدان میں ایرانیوں کے تقدّم و فضل پر ایک مختصر مگر کارآمد بحث کی ہے اور اپنے اہل ملک کو اپنی از دست رفتہ فضیلت کو پھر حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اسلام کی علمی و ادبی تاریخ میں غیر عرب قوموں، بالخصوص ایرانیوں کی بڑی خدمات ہیں، اور اس میں کلام نہیں کہ علم و ادب کے مختلف میدانوں میں انہوں نے بڑی بڑی ہستیاں پیدا کی ہیں جن پر اہل ایران کو بالخصوص، اور مسلمانوں کو بالعموم فخر کرنے کا حق ہے۔ مثلاً فلسفہ میں ابن سینا اور ریاضیات میں البیرونی۔

لغات و اصطلاحات کتاب کی فہرست، ناموں مقاموں اور کتابوں کے انڈکس بھی اہتمام کیساتھ تیار کئے گئے ہیں جو تلاش و حوالہ کے لئے بہت کارآمد ہوں گے۔ التفہیم میں البیرونی نے بہت سی سنسکرت اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ التفہیم اور کتاب الهند کے تصنیف کا زمانہ قریب ہے، اور یہ وہی زمانہ ہے جب البیرونی ہندوستان کی علمی سیاحت و طالب علمی کے بعد غزنہ واپس آچکا تھا۔ فاضل مصحح نے ان تمام اصطلاحات کو بھی ایک انڈکس میں جمع کر دیا ہے، جن کی پڑتال کسی ماہر عالم سنسکرت کے لئے غالبًا دلچسپ و مفید ثابت ہوگی۔

فاضل ہمائی کا سب سے زیادہ اہم کام متعدد حواشی ہیں، جو متن کتاب کے پائیں میں جابجا درج ہیں۔ اُن حواشی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے، کہ لکھنے والا اپنے مصنف کے مضمون کو سمجھنے اور پرکھنے کی اہلیت رکھتا ہے، جس کے بغیر کسی علمی کتاب کی قابل اطمینان و لائق اعتماد تصحیح بہت زیادہ مشکل بلکہ تقریبًا ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس زمانہ میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنے پرانے علوم میں مہارت تامہ رکھنے کے ساتھ جدید تنقیدی و تاریخی طریقہ کار سے بھی بخوبی واقف و آشنا ہوں۔

اس لئے کتاب التفہیم کا موجودہ فارسی ایڈیشن مختلف خوبیوں کا جامع بن گیا ہے۔

کتاب التفہیم کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں البیرونی نے اکثر کوزہ میں دریا بھرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض مباحث ایسے ہیں جن میں اسے خاص مہارت وفضیلت حاصل ہیں۔ مثلاً "اسطرلاب" جو نجومیوں کے لئے بڑا کارآمد آلہ تھا۔ اس مبحث پر اس کی جداگانہ تصانیف موجود ہیں۔ کتاب التفہیم میں اسطرلابوں کی مختلف قسموں اور ان سے کام لینے کے طریقوں پر بڑی خوبی وجامعیت کے ساتھ بحث کی ہے اور فی الجملہ ایک تیس ۳۰ صفحہ کا قیمتی مقالہ (ص ۲۸۵ - ۳۱۵) شامل ہے، جس میں مختلف اسطرلابوں کی شکلیں بھی درج ہیں۔

اسی طرح ہیئت کے مسائل میں ماہ وسال اور تواریخ وایام کی فصل (۲۲۰ - ۲۷۲) نہایت قیمتی علمی و تاریخی معلومات سے مملو ہے، جس پر وہ اس سے پیشتر بھی مستقل تصانیف مثلاً آثار الباقیہ لکھ چکا تھا۔ ہم اس فصل کے کچھ انتخابات پیش کرنا چاہتے تھے لیکن طوالت کے ڈر سے اس وقت صرف اس کی طرف ایک اشارہ کرکے چھوڑے دیتے ہیں۔ کتاب التفہیم سے البیرونی کی کتاب قانون مسعودی کی طباعت میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کے بعض مباحث کا خلاصہ اس میں موجود ہے۔ ایک چوتھائی صدی گذر چکی ہے، جب البیرونی کے پہلے ایڈیشن میں ہم نے اس کتاب کی اشاعت کے پرانے منصوبے کو پورا کرنے کے لئے پرزور استدعا کی تھی، اور اس کے بعد بھی بارہ برس ہوئے دوسرے ایڈیشن میں بھی افسوس اور مایوسی کے لہجہ میں اس تذکرہ کو پھر تازہ کیا تھا۔ یہ علمی کارنامہ جس کا سہرا ہماری ہمیشہ سے آرزو ہے علی گڑھ کے سر رہنا چاہئے ایسا نہیں ہے کہ مزید انتظار برداشت کرسکے۔ اس کتاب پر باہر کے ماہرین کی نظر ہے، اور اگر اسی طرح تاخیر ہوتی رہی جیسا کہ بدقسمتی سے ہمارے کاموں میں ہوتی رہتی ہے، تو عجب نہیں ہے کہ کسی دن کتاب التفہیم کی طرح قانون مسعودی بھی دوسرے ہاتھوں سے

تیار ہو کر دنیا کے سامنے آجائے گی، اور وہ دن علی گڑھ کے لئے ضرور افسوس کا ہوگا۔ اس لئے کہ اس چیز پر ہمارا کافی سرمایہ اور محنت صرف ہو چکی ہیں۔ جو اُس حالت میں رائیگاں ثابت ہوں گے۔

ابھی پچھلے دنوں کچھ خبر ملی تھی کہ اس کام کو سرگرمی کے ساتھ جاری کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے یہ خبر صحیح ثابت ہو۔

معلوم نہیں کہ اب اُس کو کس طرح چلایا جا رہا ہے؟ بدبختی سے اُس کا بہترین وبے بدل نسخہ لنڈن لائبریری سے سرقہ و خیانت کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے باہر جا چکا ہے۔ جو نقل اُس سے کرائی گئی تھی وہ غالباً محفوظ ہے۔ مقابلے کے متعلق معلوم نہیں کہ وہ اُس نسخے سے پورا اور قابل اطمینان ہو چکا تھا یا نہیں۔ کاش ہم اُس نسخہ کی قدر سمجھ کر اُس کا عکس ہی فوٹو لیتھو سے چھاپ لیتے جیسا کہ گب میموریل فنڈ کے ٹرسٹیوں نے سمونی کی کتاب الانساب و بابرنامہ وغیرہ کے اشاعت میں اختیار کیا ہے۔ اور اختلافات و تصحیح کا کام ملحقات کی شکل میں انجام دے لیتے تو متن تو کبھی کا لوگوں کے ہاتھ میں پہونچ چکا ہوتا۔ ترجمہ، تنقید، اور تحقیقات کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہ سکتا تھا۔

اب یونیورسٹی کے ہاتھ میں غالباً مسٹر سید محمود مرحوم کا نسخہ ہے اور کچھ باہر کے عکس ہیں۔ ایک نسخہ بمبئی میں ملّا فیروز کی لائبریری کا موجود ہے۔ معلوم نہیں کہ اُس سے کس حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔ عجب نہیں کہ ہندوستان میں رام پور یا حیدرآباد میں بھی کوئی دوسرے نسخے موجود ہوں۔ ایران میں معلوم ہوتا ہے، اُس کے نسخے ملتے ہیں۔ بہرحال متن کی طباعت فی الحال و فی الفور مقدم وضروری ہے، اور اُسے ترجمہ کے ساتھ وابستہ رکھنا یا اُس کے انتظار میں ملتوی رکھے رہنا سخت نامناسب۔

اصل دشواری ابتدا سے یہ ہے کہ اس کام کو انجام دینے کے لئے غیر معمولی جامعیت درکار ہے، جو نایاب نہیں۔ تو بہرحال کم یاب ضرور ہے۔ البیرونی کے انداز بیان پر بھی یہ پُرانا اعتراض چلا آتا ہی کہ وہ بہت دشوار اور مغلق ہوتا ہے، جس میں اچھے اچھے ماہر گُم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ البیرونی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ کتابیں صرف اُن لوگوں کے لئے لکھی گئی ہیں جو بصیرت کے ساتھ محنت و تجسس سے کام لینے کے لئے تیار ہوں۔ سب سے پہلے عربی کی اعلیٰ ادبی مہارت ہونی چاہیئے ساتھ ہی تمام

علوم ریاضی میں مہارت درکار ہے تاکہ مطالب کے سمجھنے میں غلطی نہ ہو سکے۔ رہا معلومات کتاب پر تنقیدی وتاریخی وتحقیقی نظر و بحث تو اس کے لئے جو تبحر و امعان نظر درکار ہیں ان کا دستیاب ہونا سہل نہیں۔ قدیم (یعنی قبل اسلام) کی یونانی، ایرانی، ہندی، مصری، کلدانی ہیئتوں کے مختلف نظاموں کی تواریخ سے باخبر ہونے کی ضرورت ہے، اور پھر اسلامی دور میں جو البیرونی سے پہلے اور بعد میں مختلف سرچشموں سے علم ہیئت کی آبیاری ہوئی، اور بتدریج مزید تحقیقات کا اضافہ ہوتا رہا، جن میں مسلمہ طور پر البیرونی کا بھی اپنا ایک حصہ ہے، ان سب چیزوں کو معلوم کر کے نمایاں کرنا ایک بڑی دلچسپ وگراں قدر علمی خدمت ہو گی۔ اس نوعیت کا ایک کام زیچ البتانی کی تصحیح وتنقید کے ذریعہ سے اس سے پہلے فاضل اجل مالینو کے ہاتھ سے بحسن وخوبی انجام پا چکا ہے۔

ہم سب کے لئے بلا شبہ بڑا فخر ومباہات کا موقع ہو گا اگر اس معیار پر ہمارا یہ کام انجام پا جائے۔ لیکن اگر خدا نخواستہ کوئی دشواریاں ہمارے راستے میں حائل ہوں، تو بہر حال جس حد تک ہو سکے اُسے جلد انجام دے لیا جائے اس علمی منصوبے کی موجودہ حالت کا کچھ حال اگر قریب وقت میں اور کسی قدر تفصیل سے معلوم ہو جائے تو خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

ہمارے خیال میں سب سے پہلے محض متن کی اشاعت پر توجہ مرکوز کی جائے۔ جسے صحت کے ساتھ جلد از جلد بغیر تمہید وتنقید وحواشی، اور انڈکسوں کا انتظار کئے شائع کر دیا جائے۔ دوسرے سب کام (جو خود بڑے کام ہیں) اگر بعد میں انجام پاتے رہیں اور اسی طرح اُردو ترجمہ بھی تیار ہونے پر شائع ہو جائے۔ تو چنداں ہرج نہیں ہے۔

ایک ایسی علمی کتاب کے اُردو ترجمہ کا بڑا فائدہ یہی ہو گا کہ ہمارے ملک کے وہ اہل علم جو عربی زبان سے نابلد ہیں اس کی معلومات سے فائدہ اٹھا کر اگر اس ترجمہ کی بنا پر تحقیقات کرنا چاہیں گے تو آسانی ہو گی۔ ترجمہ بہر حال وہی کارآمد ہو گا۔ جو اس کتاب کے شایاں ہو، نہ کہ ایسی چیستاں جو باعث سرگردانی ہو، اور سارا مقصد ہی فوت ہو جائے۔

کتاب التفہیم کی عربی و فارسی طباعتیں ہمیں بہت کچھ اس کام کے انجام دینے میں رہبر ہو سکتی ہیں۔ بیشک ہم اپنے فاضل ایرانی دوست ہمائی کے مرہونِ منت ہیں جس کی قابلِ تحسین سعی سے التفہیم کی ایسی عمدہ طباعت ہم تک پہونچی ہے۔ اب ہم منتظر اور دست بدعا ہیں کہ خدائےتعالیٰ قانون مسعودی کی اشاعت کے لئے بھی اپنے غیبی کارخانہ سے جلد از جلد سروسامان مہیا فرما دے۔ آمین!

سید حسن برنی بی اے ال ال۔ بی (علیگ)
ایڈوکیٹ بلند شہر

(نوٹ) از مولانا یعقوب بخش صاحب راغب بدایونی

ابو الریحان احمد۔ البیرونی۔ کی شخصیت اس کے علمی کارنامے اُن اصحاب کی نظر سے پوشیدہ نہیں جنھوں نے جناب محترم سید حسن برنی صاحب کی کتاب البیرونی پڑھی ہوگی موصوف کا یہ شاہ کار اُردو زبان اور مسلمانوں کی طرف سے صد ستائش و آفریں کا مستحق ہے کہ آپ نے البیرونی کو سب سے پہلے اُردو جاننے والوں کے سامنے پیش کیا ہے (فجزاہم اللہ احسن الجزاء) یہ ایک حقیقتِ تاریخی ہے۔ کہ البیرونی۔ اُن مسائل کی موشگافیوں اور باریک بینیوں میں مصروف رہا ہے جس کی قدر کرنے والے البیرونی کے دور میں بھی بہت کم تعداد رکھتے تھے اس لئے البیرونی کی علمی تصانیف کا حلقۂ اشاعت بھی محدود رہا لیکن با ایں ہمہ۔ اس کی قلمی کارناموں اور علمی جواہر پاروں کے قدردان ہمیشہ اس کی تصانیف کو نسلاً بعد نسل محفوظ رکھتے چلے آئے۔

یوروپ میں علمی مذاق عربوں سے پہونچا مستشرقین نے قدیم باکمال عرب و عجم مصنفین و مترجمین کی تصانیف کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالا اور انہیں چھاپ کر اپنے استاد عربوں کی تقلید کا بہترین نمونہ پیش کر دیا۔ انہیں مستشرقین میں ڈاکٹر زیخو بھی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے (جہاں تک مجھے معلوم ہے) البیرونی کی تصانیف پر کام کیا ہے۔

البیرونی کی کتاب الہند جب یورپ سے چھپ کر ہندوستان آئی تو حضرت مولانا شبلی مرحوم نے اس کا مطالعہ فرمایا اور زخو کے مقدمہ کو اُردو میں ترجمہ کرنے کا حکم جناب محترم مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری کو دیا۔ جو مرحوم مولانا کے اس وقت شاگرد تھے۔ سید صاحب نے اس کا ترجمہ کیا یہ واقعہ ۱۸۸۶ء لغایت ۱۸۹۰ء کے درمیانی زمانہ کا ہے۔ اس وقت ایک رسالہ حسن نامی حیدرآباد سے نکلتا تھا۔ سید صاحب کا وہ مضمون نہایت آب و تاب سے اس رسالہ میں چھاپا گیا۔ رسالہ حسن کا ادارہ رسالہ کی ہر اشاعت میں بہترین مضمون نگار کو ایک اشرفی انعام دیتا تھا۔ اس مقدمہ کے ترجمہ کے صلہ میں ایک اشرفی اس اشاعت کا انعام ہمارے سید صاحب کے حصّہ میں آیا۔ اس کے بعد ایک طویل زمانہ تک البیرونی سے ہمارے علمی حلقے ناآشنا رہے۔ اس سے مولانا شبلی کی بعض پرائیویٹ تقریریں اور بعض تحریریں مستثنیٰ کی جاسکتی ہیں جنمیں کتاب الہند اور البیرونی کا نام آجاتا تھا۔

زخو نے البیرونی کی الآثار الباقیہ بھی چھاپی۔ اور وہ بھی ہندوستان آگئی۔ اُس کا ذکر بھی محدود حلقوں میں رہا۔ کہ جناب محترم سید حسن برنی نے ایک مستقل تالیف البیرونی پر اُردو میں پیش کی یہ کتاب البیرونی کی سوانح حیات اور اسکے علمی کارناموں کے بیان کا اچھا اور قابل قدر ذخیرہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں موصوف نے جن کتابوں کی اشاعت پر کارکنان مسلم یونیورسٹی کو توجہ دلائی ہے اسے موصوف کے علمی شغف کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ الجماہر فی الجواہر حیدرآباد میں اور تفہیمات ایران میں چھپ گئی رہ گیا تو قانون مسعودی۔ جو حقیقت میں البیرونی کا شاہکار ہے۔

قانون مسعودی اور مسلم یونیورسٹی

مسلم یونیورسٹی میں اب قانون مسعودی کا ایک قلمی نسخہ قدیم اور ایک جدید منقول نسخہ ہے۔ یہ جدید منقول نسخہ ۱۹۱۳ء میں اوصاف علی ساکن علی گڑھ نے لکھا اور اسکی تصحیح غالباً آکسفورڈ کے نسخہ سے کیگئی ہے۔ میں نے اس نسخہ کو پڑھا ہے۔ اب بھی اس میں سینکڑوں غلطیاں موجود تھیں۔ جن میں سے اکثر کی (جہاں تک عربی ادب یا مضمون زیر بحث سے متعلق تھی) تصحیح میں نے کردی۔

راقم۔ جناب محترم برنی صاحب کی اس رائے کا پُرزور موید ہے کہ قانون مسعودی کو پہلے عربی متن ہی میں پیش کیا جائے۔ اُردو یا انگریزی ترجمہ بعد کی بات ہے۔ اس رائے کو تصدیق محترم جناب سید علامہ مولنا محمد سلیمان ندوی نے بھی پسند فرمایا بلکہ سید موصوف کی رائے اصل کتاب کے چھاپنے

متعلق ہمیشہ قائم رہی ہے اور ابھی تک انہوں نے اس سے رجوع نہیں فرمایا۔ اب قانون مسعودی کے اردو ترجمہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنیکا موقعہ ہے اسمیں شک نہیں کہ البیرونی بہت ہی مغلق نگار ہے اور جن مسائل پر اُس نے قانون مسعودی میں قلم اٹھایا ہے وہ کوئی تاریخی یا افسانے کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ مجسطی کی ایک معنی سے شرح اور تمام رسائل متوسطات کے بیان کردہ مسائل کی تفصیلات ہے ایسا مترجم نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ پھر ایسے مترجم کو جس قسم کا فراغ خاطر اور اطمینان چاہیئے وہ مسلمانوں کی اس علمی قدر افزا عہد مبارک میں اگر نصیب ہو سکتا ہے تو شاید کسی قبرستان میں۔

بہر حال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے اسی خیال کے ماتحت۔ ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر حضرت علامہ ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب نے ایک ایسے گمنام اور نااہل وجود کو بھی قانون مسعودی کے حلقہ مترجمین میں جگہ دیکر عزت افزائی فرمائی جس کا وہ ہرگز مستحق نہ تھا۔

یہ خبر غالباً جناب محترم سید برنی صاحب کی خوشی کا باعث ہوگی۔ کہ گذشتہ مئی سے یونیورسٹی میں قانون مسعودی کے اردو ترجمہ کی حسب ارشاد جناب وائس چانسلر صاحب کوشش جاری ہے اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ دو مقالوں کا اردو ترجمہ پہلے ہو چکا تھا جب فاروق صاحب اس کتاب پر کام کرنا چاہتے تھے تیسرے نویں دسویں گیارہویں مقالہ کا اردو ترجمہ راقم کر چکا ہے۔ چوتھے اور پانچویں مقالے کا بالترتیب انگریزی اور جرمنی میں غالباً موجود ہے۔ چھٹا زیر ترجمہ راقم ہے اور ساتواں آٹھواں بھی۔ کل کتاب کے گیارہ مقالے ہیں اور ان مقالوں کے ترجموں کا یہ حساب ہے۔

اس حد تک کام ہو جانے کے بعد بھی ابھی کتاب کی اصل متن اور اسکو اردو ترجمے اور ہر مقالہ کے ساتھ اُسکے مقدمے انڈکس مشکل الفاظ کی تشریح اور فٹ نوٹس کی طباعت کا اتنا اہم کام باقی ہے جسکے متعلق نظر ڈالتے ہوئے مستقبل میں حوصلہ افزا شعاع نظر آرہی ہے۔ تو صرف یونیورسٹی کے کارکنان کی قدر افزائی کے تصور کے ساتھ۔ ورنہ۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

ان مقالوں کے اردو ترجموں سے ہم کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں یہ بحث آئندہ کے لئے اٹھائی جاتی ہے۔ ابھی تو۔ تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے۔

راغب

بحیثیت تاریخ ادب "آبحیات" کی خامیاں

جناب ماجد علی صدیقی

آبِ حیات مولانا محمد حسین آزاد کی شہرہ آفاق تصنیف ہے، اس کتاب کی اہمیت اردو کی پہلی تاریخِ ادب ہونے کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے۔ اس سے پیشتر کے مرتبہ تذکرے تو دستیاب ہوتے ہیں لیکن کوئی ایسی تالیف یا تصنیف نہیں ملتی جسے تاریخ ادب کی حیثیت سے پیش کیا جا سکے۔

بیسویں صدی کے اوائل سے اردو ادب میں تحقیق و تدقیق کا کام بڑے انہماک سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ اس دوران میں قدیم قلمی نسخے قدیم مکتوبات اور ملفوظات کی سندیں اور ان کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں روشنی میں آگئیں جن سے اس کام میں بڑی مدد ملی۔ جدید تحقیقات نے آبِ حیات کی اہمیت بحیثیت تاریخ کے بہت کم کردی۔ ان انکشافات نے مصنفؔ آبِ حیات" کے بیشتر بیانات کی صحت کو مشکوک کر دیا اور بعض کی تو سرے سے تردید کردی۔

آبِ حیات کی غلطیوں میں سے چند کو تو اس حقیقت پر مبنی کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا سرمایہ اور مواد موجود نہ تھا جس کی چھان بین سے نتیجہ خیز اور مستند واقعات تک رسائی ہو سکے اس لئے ان غلطیوں کا ہونا ایک حد تک ناگزیر تھا۔ لیکن بیشتر مواقع پر فاضل مصنف نے دیدہ و دانستہ ٹھوکر کھائی ہے۔ اور ایسی غلطیوں کی موجودگی کسی طرح بھی محدود ذرائع اور ناواقفیت کی بنا پر درگزر نہیں کی جا سکتی

آبِ حیات کی غلطیاں پانچ عنوانات کے ذیل میں تقسیم کی جا سکتی ہیں:-

۱۔ سن و سال کی غلطیاں انھیں تاریخی غلطیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ واقعات کی غلطیاں۔ آزاد نے بعض شعرا کے وطن اور سیرت اور افتادِ طبع اور بعض کے خاندانی حالات کے بارے میں غلط بیانی کی ہے۔

۳۔ غلط الزامات۔

۴ - زیادتیاں۔

۵ - وہ غلط بیانیاں جو عقیدت کے جوش کی وجہ سے اختیار کی گئی ہیں۔

سن و سال کی غلطیاں۔

آزاد نے اُردو زبان کی ابتدا شاہجہاں کے زمانے سے بتائی ہے لیکن بعد کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو کی ابتدا اس سے کہیں پہلے ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کافی دقیع اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ علامہ موصوف کا خیال ہے کہ اردو کی داغ بیل اس زمانے میں پڑ چکی تھی جس زمانے میں عرب و فارس کے تاجر مغربی سواحل ہند پر تجارت کی غرض سے آیا کرتے تھے چنانچہ آپ کی رائے میں اُردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی۔ گو اس مسئلہ پر محققین میں اختلاف رائے ہے کوئی گجرات کوئی دکن اور کوئی شمالی ہند اُردو کا مولد بتاتا ہے لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ اردو کی ابتدا کا زمانہ شاہجہاں سے بہت پہلے کا ہے۔

اُردو نثر کی ابتدا اور اس کی پہلی تصنیف کے متعلق بھی آزاد کا بیان غلط ثابت ہو چکا ہے۔ آزاد نے اُردو نثر کی ابتدا شمالی ہند سے بتائی ہے اور فضل کی وہ مجلس کو اردو نثر کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے۔ جدید تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر کی پہلی تصنیف حضرات اشرف جہانگیر سمنائی کا رسالہ تصوف ہے۔ جو ۷۵۸ھ میں تصنیف ہوا۔

اُردو نظم کی ابتدا کے سلسلہ میں آزاد نے ولی دکھنی کی اولیت پر جو زور دیا ہے اس میں وہ حق بجانب نہیں ہیں۔ ولی سے پہلے بہت سے شعرا جو جدید تحقیقات کی روشنی میں کافی معروف ہو چکے ہیں۔ ایسی زبان میں شعر کہتے تھے جو بہ نسبت کسی اور زبان کے اُردو سے کہیں زیادہ قریب تھی۔ ولی سے تقریباً ایک صدی بیشتر شمالی ہند میں افضل جھنجھانوی ایک شاعر گزرا ہے جس کے کلام میں اردو متشکل اور نمایاں نظر آتی ہے اگرچہ اس کا زمانہ زبان کا بالکل ابتدائی دور تھا جس کے اثرات افضل کی زبان میں بھی صاف جھلکتے ہیں۔ افضل کے بعد اور ولی سے پہلے متعدد شعرا ایسے گزرے ہیں جن کی زبان پر ابتدائی اُردو کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے بعض شعرا کا کلام اس بیان کی تائید میں

پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کے شعرا میں سلطان قلی قطب شاہ کافی اہم مرتبہ رکھتا ہے۔

مرثیہ کی ابتدا بھی آزاد نے دلی کے زمانہ سے بتائی ہے۔ حالانکہ مرثیہ کی ابتدا دلی سے کئی سو سال قبل ہو چکی تھی۔ سلطان قلی قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے یہاں مرثیہ ابتدائی حالت میں موجود ہے۔ اس کے بعد شجاع الدین نوری بیجاپوری، ہاشم برہانپوری، نصرتی، راما راؤ اور سیوا نے اس صنف کو بہت ترقی دی۔ گویا مرثیہ کی ابتدا بھی آزاد کے بتائے ہوئے زمانے سے کہیں پہلے ہو چکی تھی۔

اس ہی قسم کی غلطی ریختی کی ابتدا کے بارے میں بھی کی گئی ہے۔ آب حیات میں ریختی کو رنگین اور انشا کی ایجاد بتایا گیا ہے۔ حالانکہ ان شعرا سے کہیں پہلے ریختی دکن میں بھی ملتی ہے آصفی ملکاپوری نے اپنے تذکرے میں مولانا ہاشمی بیجاپوری کے دو شعر نقل کئے ہیں جنہیں ریختی کہا جا سکتا ہے اس کے بعد خاکی کے ہاں ریختی ملتی ہے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ رنگین نے اس کو از سرِ نو لکھنؤ میں زندہ کیا۔ اور انشا اور جان صاحب نے ترقی دی۔

۲۔ واقعات کی غلطیاں۔

آزاد نے ولی کو گجرات کا باشندہ اور علامہ وجیہ الدین علوی کی نسل سے بتایا ہے اور اپنے اس بیان کی تصدیق کے لئے حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کے تذکرہ کا حوالہ دیا ہے لیکن مولنا عبدالحی صاحب اپنے مشہور تذکرہ میں میر تقی اور میر حسن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ولی اورنگ آباد کے باشندے تھے اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گجرات چلے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ ولی کے آباؤ اجداد گجرات ہی سے آئے ہوں لیکن اس کی کوئی سند نہیں اور بفرض محال اگر یہ حقیقت بھی ہو تب بھی محض اس بنا پر ولی کو گجرات کا باشندہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

سودا کے ذکر میں بھی آب حیات میں متعدد مواقع پر غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہونچے نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی یا طنز سے فرمایا مرزا تمہاری وہ رباعی اب تک میرے دل پر نقش ہے۔ یہ پاس وضعداری پھر دربار میں نہ گئے۔" آزاد کے اس بیان کی اصلیت میں سخت شبہ کی گنجائش ہے۔ اس زمانہ میں نواب شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے اور لکھنؤ کی حیثیت ایک معمولی قصبہ سے زیادہ نہ تھی یہ بھی غلط ہے کہ سودا اس کے بعد پھر دربار میں نہ گئے نواب شجاع الدولہ جبتک

زندہ رہے مرزا ان کی ملازمت میں رہے۔ کلیات سودا کے بہت سے قصائد جو نواب شجاع الدولہ کی مدح میں ہیں آزاد کے بیان کی تردید کرتے ہیں۔

آزاد نے میر صاحب کے ساتھ معلوم نہیں کن وجوہات کی بنا پر بڑی زیادتیاں روا رکھی ہیں اکثر مواقع پر بالکل بے بنیاد الزامات لگائے ہیں۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

"میر صاحب خان آرزو کے سوتیلے بھانجے تھے۔ . . . . . خان صاحب حنفی المذہب تھے اور میر صاحب شیعہ۔ اس پر نازک مزاجی غضب۔ کسی مسئلہ پر خان صاحب سے بگڑ کر الگ ہو گئے"۔ صاحب "گل رعنا" نے لکھا ہے کہ تاریخی حیثیت سے اس واقعہ کی تردید دشوار ہے۔ قدیم تذکروں میں اس واقعہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا لیکن میر صاحب نے نکات الشعرا میں خان آرزو کا تذکرہ بہت ادب کے ساتھ کیا ہے اور ان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے آزاد کے بیان کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے۔ میر صاحب نہایت صاف گو انسان تھے اور اگر ان واقعات کی اتنی اہمیت ہوتی تو وہ "نکات الشعرا" میں اس کا ذکر ضرور کرتے آزاد نے اس واقعہ کو "نکات الشعرا" کے حوالے سے لکھا ہے۔ حالانکہ "نکات الشعرا" میں اس قسم کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ "ذکر میر" میں میر صاحب نے ان مظالم کا تذکرہ کیا ہے جو سراج الدین علی خان آرزو میر کے سوتیلے ماموں نے اپنے حقیقی بھانجے یعنی میر صاحب کے سوتیلے بھائی کی تحریک پر ان پر روا رکھے تھے۔ نکات الشعرا ذکر میر کے بہت بعد لکھی گئی اور اس میں میر صاحب نے سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر بہت عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات بہت زیادہ اہم نہ تھے اور چونکہ نکات الشعرا کی تصنیف کے وقت ان واقعات کو گذرے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اس لئے میر صاحب غالباً ان چیزوں کو فراموش کر چکے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نکات الشعرا میں انہوں نے اپنی رنجش کا بالکل تذکرہ نہیں کیا

میر کو انتہائی "بددماغ" اور "تنک مزاج" ثابت کرنے میں آزاد نے امکانی کوشش کی ہے۔ اپنے ثبوت کے لئے جگہ جگہ "طبعزاد" قصوں اور حکایتوں کو واقعات کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے۔ آزاد کا بیان ہے "میر صاحب اپنی بددماغی اور نازک مزاجی سے کسی بات پر نواب سے بگڑ کر گھر بیٹھ رہے اور فقر و فاقہ میں زندگی گذاری"۔ مرزا علی لطف میر صاحب کے ہمعصر تھے۔ وہ "گلشن ہند میں" لکھتے ہیں "اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت

نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی تصور نہیں ہوا۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج تک کہ ۱۲۱۵ھ ہے وہی حال ہے"۔ مرزا علی لطف کے اس بیان سے آزاد کے ایک اور بیان کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں "جب سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار چھوڑ چکے تھے۔ وہاں سے کسی نے طلب نہ کیا ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی یہ تحسین کی مسجد پر سر راہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے سے آئی سب اٹھ کھڑے ہوئے یہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشار خواصی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب نے پوچھا یہ کون شخص ہے۔ عرض کی کہ یہ وہی گدائے متکبر ہے جسکا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ گزارہ کا یہ حال ہے اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقہ ہی ہوگا۔ سعادت علی خاں نے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھیجا۔ میر صاحب نے واپس کر دیا۔ پھر سید انشار خود لیکر گئے اور سمجھا بجھا کر راضی کیا۔ کبھی کبھی دربار جانے لگے"۔

اس میں شک نہیں کہ میر صاحب نازک مزاج بہت تھے لیکن اس قسم کے واقعات نازک مزاجی پر نہیں خلل دماغی پر محمول کئے جائیں گے۔ میر کے حال میں آزاد کی انھیں بے عنوانیوں اور بے سروپا حکایتوں کو دیکھ کر صاحب "گل رعنا" نے لکھا ہے "آزاد نے "آب حیات" میں میر کی جو تصویر کھینچی ہے وہ انکے منہ پر کھلتی نہیں"

میر ہی کے حال میں ہم آزاد کی ایک اور "تصنیف" سے دو چار ہوتے ہیں۔ آزاد فرماتے ہیں "سوز مرحوم پہلے میر تخلص کیا کرتے تھے جب میر تقی مرحوم میر کے تخلص سے عالمگیر ہوئے تو انہوں نے سوز اختیار کیا" اپنے اس بیان کے ثبوت میں فاضل محقق ایک اور داستان بیان کرتے ہیں "سوز نے ایک مشاعرے میں کہا تھا کہ فقیر نے تو تخلص میر کیا تھا مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام روشن نہ ہو سکے گا۔ ناچار سوز اختیار کیا۔ مگر وہ (میر) چپکے بیٹھے سنا کئے"۔ ایک اور جگہ آزاد میر کی زبان سے کہلواتے ہیں "ہم نے ایسے تخلص شرفا میں کبھی نہیں سنے" میر نے جس محبت اور خلوص سے سوز کا ذکر نکات الشعراء میں کیا ہے وہ خود آزاد کے اس بیان کی تردید کرتا ہے۔ "میر محمد میر جوانے است بسیار اہل خوش طبع ہر چند طرز علیحدہ دارد ولیکن از خوش کردن تخلص من نصف ولم از و خوش است"۔

میر غلام حسن حسن صاحب "سحر البیان" کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ جب تک دلی میں رہے اپنے والد اور خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے۔ وہ میر جا کر میر ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سودا

کو بھی غزل دکھائی۔ اسی بنا پر آزاد نے جا بجا میر حسن کو سودا اور درد کا شاگرد قرار دیا ہے۔ لیکن میر حسن نے اپنے تذکرہ میں خود کو میر ضیاء کا شاگرد لکھا ہے اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔ صاحبِ "گل رعنا" اس بارے میں لکھتے ہیں "بارہ برس کے سن میں انہوں نے دلی چھوڑی، خواجہ میر درد مرحوم سے اصلاح لینے کا کونسا موقعہ تھا۔ اگر سودا سے اصلاح لی ہوتی تو اس کا ذکر ضرور کرتے" اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد نے میر حسن کا تذکرہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی اور محض قیاس سے کام لیا ہے۔

انشاء اللہ خاں انشاء کے متعلق بھی آزاد نے بعض باتیں بالکل بے بنیاد لکھی ہیں۔ انشاء کے حال میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ نواب سعادت علی خاں نے انہیں بلوایا۔ یہ گھر پر موجود نہ تھے۔ نواب نے خفا ہو کر کہا کہ ہمارے سوا کسی کے گھر نہ جایا کرو۔ اسی عرصے میں انکا جوان لڑکا مر گیا اس صدمہ سے پاگل سے ہو گئے۔ ایک دن نواب سعادت علی خاں کو سر بازار گالیاں دیں۔ نواب نے پنشن بند کر دی۔ اس کے بعد سعادت یار خاں رنگین کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ بالکل پاگل ہو گئے تھے۔ قریب قریب ننگے ایک مشاعرہ میں آئے اور اپنی غزل سنا کر چل دیئے۔ غزل کا ایک شعر ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

آزاد نے انشاء کے مجنون ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بڑی دردانگیز تصویر کھینچی ہے۔ صاحبِ "گل رعنا" نے اس واقعے کے متعلق بڑی چھان بین کی ہے اور وہ لکھتے ہیں "حیاتِ دبیر" کے مصنف نے مرزا روح کی زبانی لکھا ہے جو میر انشاء اللہ خاں کے نواسے تھے کہ سید انشا نہ مجنوں ہوئے تھے اور نہ ان کی پنشن بند ہوئی" صرف اتنا واقعہ ہے کہ نواب نے حکم دے دیا تھا کہ دربار کے سوا کہیں آیا جایا نہ کریں۔ اس غزل کے بارے میں وہ لکھتے ہیں "اس کے چند شعر تذکرہ مصحفی میں درج ہیں" یہ تذکرہ اس وقت کا لکھا ہوا ہے جب سید انشا لکھنؤ پہنچے بھی نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ غزل لکھنؤ کے اس مشاعرے سے جس کا ذکر آزاد نے رنگین کے حوالے سے کیا ہے، بیشتر کی لکھی ہوئی ہے۔ لیکن یہاں اس کا بھی امکان ہے کہ انشا نے پرانی غزل پڑھ دی ہو۔ بہرحال ان کے مجنون ہونے کا واقعہ سرے سے غلط ہے۔

ناسخ کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے "یہاں کا جنجال رکھا ہی نہ تھا" مگر مولوی عبدالحیٔ "گل رعنا" میں لکھتے ہیں "قیصر التواریخ میں سید محمد زا ئی نے لکھا ہے کہ بنیوں کو اچھی تعلیم دلوائی حکیم زین العابدین ان کا بیٹا مرزا محمد علی کاشی گز طبابت کرتا اور خوش چلنی سے زندگی بسر کرتا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناسخ صاحب اولاد تھے۔ اور اس طرح آزاد کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔

۳۔ غلط الزامات۔

ا۔ میر تقی میر کے متعلق آزاد لکھتے ہیں "افسوس یہ ہے کہ ان کو اوروں کے کمال بھی دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ میر سے شخص کے دامن پر بدنما دھبہ ہے .... خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جاتی تو وہ سر ہلا نا گناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے" میر کے تذکرے نکات الشعرا پر ایک سرسری نظر آزاد کے اس بیان کی پوری تردید کر دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر کا شعر جانچنے کا معیار بہت بلند تھا اور وہ کبھی ایسے شعر کی تعریف نہ کرتے تھے جو ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ داد کے معاملے میں ان کی یہ خست ان کی باکمال شخصیت پر زیب بھی دیتی تھی۔ لیکن یہ امر کہ وہ دوسروں کے کمالات کے معترف ہی نہ ہوتے تھے حقیقت سے بعید ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ قدما کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ بلکہ مناسب اور موزوں الفاظ میں اپنے ہمعصروں کی بھی تعریف کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکا احساس تنقید" (Sense of Criticism) معاصرانہ اختلافات اور بغض سے بلند تھا۔

آزاد کا بیان ہے کہ میر نے "نکات الشعرا" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے" اس میں ایلا۔ ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو" آزاد کا بیان ہے کہ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہ بچا۔ ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اس کے حق میں فرماتے ہیں "ولی شاعریست از شیطان مشہور تر" "نکات الشعرا کے دیباچہ کا مطالعہ آزاد کے بیان کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیتا ہے۔ میر نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے اور اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھونگا۔ ولی کی نسبت میر نے لکھا ہے "از شہرت احتیاج تعریف ندارد" "شیطان والا فقرہ تذکرے میں کہیں نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف نے میر کا تذکرہ دیکھا تک نہیں۔

میر نے اپنے زمانے کے ایک نوجوان شاعر میر سجاد کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے "سخن او بپایہ استادی رسیدہ" مولوی عبدالحق کی رائے کے مطابق میر نے آصف الدولہ کے کلام کے متعلق کہا تھا "کلام الملوک ملوک الکلام" خود نکات الشعرا میں بہت سی مثالیں ایسی مل سکتی ہیں جہاں صاحب تذکرہ نے اچھے اشعار اور ان کے خلاق کی تعریف کی ہے۔

آزاد کا بیان ہے کہ میر نے میر درد کو آدھا اور میر سوز کو پاؤ شاعر مانا ہے۔ بقول مولانا عبدالحق یہ میر صاحب پر نرا بہتان ہے اور آزاد کی "صرف بذلہ سنجی ہے" ورنہ نکات الشعرا میں کہیں میر نے اس قسم کا خیال ظاہر نہیں کیا ہے۔
چوتھی اور پانچویں قسم کی غلطیوں کا ذکر ہم ایک ساتھ کریں گے۔ اس لئے کہ جہاں انہوں نے عقیدت کے رنگ میں ڈوب کر ایک شخص کو عرش معلیٰ پر چڑھا دیا ہے۔ وہیں محض اس کے کمال کو چمکانے کی خاطر اس کے کسی ہمعصر کو انتہائی پستی میں پہونچانے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ موخرالذکر کے ساتھ سراسر بے انصافی اور زیادتی ہے۔

۱۔ آزاد نے سراج الدین علی خاں آرزو کو دوسرے دور کے شعرا میں جگہ دی ہے۔ مگر بقول صاحب "گل رعنا" یہ آزاد کی زبردستی ہے۔ مجھے آزاد کے فضل و کمال میں کلام نہیں مگر اردو کے دو چار شعر کہہ لینے یا شعرائے ریختہ کو عروض قافیہ پڑھا لینے سے ان کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ اردو شعرا کے صف میں ان کو جگہ دی جائے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا فقیر الدین فطرت قزلباش خان امید میر شمس الدین فقیر اور علی قلی ندیم نے کیا قصور کیا ہے۔ انہوں نے بھی دو دو چار چار شعر اردو میں کہے ہیں اور اردو شعرا کے کلام میں اصلاح دی ہے اور ان کو شاعری کے گر بتائے ہیں ...... آزاد کی زبردستی اس پر ختم نہیں ہو بلکہ سب سے بڑا ظلم انہوں نے یہ کیا کہ منیر، اثر، قائم، یقین، ہدایت، مزیں، بیدار، بیان اور نظیر ایسے اردو کے مشاق شاعروں اور استادوں کو کہیں جگہ نہیں دی باوجودیکہ ایک جگہ قائم کے ذکر میں خود فرماتے ہیں "ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان کے نیچے نہیں رکھ سکتے"۔ اور لطف یہ ہے کہ میر غلام حسین ضاحک کو میر و مرزا کی صف میں اور میر حسن خلیق کو ذوق و غالب کے دور میں جگہ دی ہے جن کے دو دو چار چار شعر بھی نہیں ملے کہ آبحیات میں درج کرتے۔

مرزا مظہر جان جاناں کے متعلق مختلف بے بنیاد روایات مشہور کر دی ہیں جو کسی با وثوق سند پر مبنی نہیں ہیں۔
حکیم مومن خاں مومن کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دنیائے ادب ان کے کمال کا اعتراف کر چکی ہے۔ لیکن آزاد نے "آبِ حیات" کے پہلے ایڈیشن میں مومن کا تذکرہ تک نہیں کیا ہے۔ لیکن جب دلی والوں نے شور مچایا تو دوسرے ایڈیشن میں معذرت کے ساتھ مومن کے حالات بھی شامل کر دئے ہیں۔
بہادر شاہ ظفر دہلی کا آخری تاجدار تھا۔ سلطنت مغلیہ کے اس بد قسمت چشم و چراغ کے ساتھ تقدیر نے تو ناسازگاری کی ہی تھی آزاد نے بھی اس غریب پر کچھ کم ظلم نہیں ڈھائے ہیں۔ آخری شاہنشاہ دہلی کو لوٹنے میں آزاد نے انگریزوں کی معاونت کی۔ انگریزوں نے سلطنت غصب کی اور آزاد نے اسکا (ظفر کا) سرمایہ کمال۔ محض اپنے استاد کو چمکانے کی خاطر آزاد نے ظفر کے تمام دواوین اٹھا کر ذوق کے بستے میں باندھ دئے۔ اس موقع پر ان میں (آزاد میں) اس قدر خود داری پیدا ہو گئی تھی کہ انھوں نے اپنے ضمیر کی آواز کو سننا بھی گوارہ نہیں کیا۔ آزاد کی یہ حرکت ان کی ذہنیت کی انتہائی پستی کا مظاہرہ ہے۔ ذوق بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے اس لئے ضرور ہے کہ ظفر نے ایک حد تک ذوق کی شاعری کا رنگ قبول کیا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کی شاعری کا رنگ بڑی حد تک مختلف ہے۔
مولانا عبد الحیٔ صاحب "گل رعنا" نے اس سلسلے میں کافی تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں "اس بحث کے بعد میں اس نتیجہ تک پہونچا ہوں کہ ظفر کی کمزوری صحیح اور ان کے اساتذہ کی کاوش مسلم مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر کر استاد ذوق کو ان کے دیوانوں کا مالک بنا دیا جائے۔"
آزاد کے اس فعل کی بڑی حد تک ذمہ دار ان کی وہ عقیدت ہے جو انھیں اپنے استاد یعنی ذوق سے تھی ذوق کو چمکانے میں آزاد نے اپنی انشا پردازی کا پورا زور صرف کر دیا ہے، لکھتے ہیں "رنگینی بیان دور سے حسن عبارت کی بلائیں لیتی ہے۔ ...... ان پر اردو شاعری کا خاتمہ ہے۔"

یہی عقیدت بڑی حد تک ظفر کے سرمایہ کمال کی خیانت کا باعث ہوئی۔ ظفر کے دواوین کے متعلق لکھتے ہیں "پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں" آزاد کا قاعدہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے آخر تک نباہتے ہیں چنانچہ اس بات کو بھی انہوں نے آخر تک نباہنے کی کوشش کی ہے اور ذوق کے احوال میں مشکل ہی سے کوئی موقع ہوگا کہ اشارتاً یا کنایتاً اسے ثابت کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ لیکن باریک بین نگاہیں دیکھ سکتی ہیں کہ آزاد کے بیانات خود ایک دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں

آزاد کو تسلیم ہے کہ ذوق ۱۲۲۴ھ سے ولی عہد ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔ ظفر کا پہلا دیوان ۱۲۲۳ھ میں مکمل ہی نہیں مرتب بھی ہو چکا تھا اور قطعہ تاریخ کی صورت میں "ہاتفِ غیبی" کی شہادت آج بھی اس کی ردیف یا میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ آزاد کا یہ دعویٰ کہ "پہلا دیوان نصف سے زیادہ" ذوق کا ہے کس حد تک قابل اعتماد ہے۔

ایک جگہ آبحیات میں لکھتے ہیں "ولی عہد کی بھی غزل بناتے تھے اور جب جدا جدا دیکھو تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بادشاہ کا کلام ہے یہ ولی عہد کا۔ اسی طرح ہر شاگرد کا کلام بعد اصلاح کے اپنے اپنے رنگ میں تھا۔ اور اپنی غزل دیکھو تو سب سے الگ" دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"اگر نئی غزل کہکر دیں اور اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا ستر برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اُس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو مٹانا بھی آسان کام نہیں، ناچار اپنی غزل میں انکا تخلص ڈالکر دے دیتے تھے"

قابل غور یہ ہے کہ ایک طرف تو مولانا دونوں شاعروں کے انداز سخن کے فرق کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ ذوق کو ہر رنگ پر قدرت حاصل تھی گویا ظفر کے کلام کی خصوصیات اور دونوں شاعروں کے کلام کے فرق کا فائدہ بھی ذوق ہی کو ہو نچا اور دوسری طرف یہ ارشاد ہے کہ ذوق اپنا ہی کلام بجنسہ بادشاہ کی نذر کر دیتے تھے۔ ظاہر ہے اس صورت میں دونوں کلاموں کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔

اگر یہ واقعہ تھا کہ ظفر کے دواوین ذوق نے ہی مرتب کئے ہوتے اور ذوق ہی غزلیں کہکر ظفر کو دیا کرتے تھے تو یقینی آزاد کے علاوہ اور تذکرہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے۔ لیکن اب تک تمام اسناد آزاد کے بیان کی تردید میں اعانت کرتی ہیں۔

۱۔ منشی کریم الدین مرحوم نے ۱۸۴۷ء میں جبکہ ذوق اور ظفر دونوں بقید حیات تھے ذوق کے حال میں لکھا ہے "آج تک یہ عادت طبیعت میں متمکن ہے کہ جو شعر کہتے ہیں کسی اور کو نہیں دیتے ہیں۔ بادشاہ کے استاد ہیں اصلاح شعر کی بادشاہ کو دیتے ہیں"۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ "گلشن بیخار" میں ظفر کی شاعری پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"باین فن بسیار مالوف است شیخ ابراہیم ذوق از مائدۂ نعمتش ذلہ ربا و وظیفہ خوار است و افکار ایشاں بمحک و اصلاح او درست و ہموار"۔

ظفر کے متعلق "طبقات شعرائے ہند"۔ مولفہ منشی کریم الدین ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے:۔

"شعر ایسے کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کوئی نہیں کہتا"۔

"ظفر کے متعلق "تذکرۂ بہار بیخزاں" مولفہ منشی احمد حسین ۱۲۶۱ھ میں لکھا ہے:۔

"بفن شعر میلے و فی الجملہ ترنم دارد"۔

"تذکرہ سخن شعرا" مولفہ عبدالغفور ناسخ ۱۲۸۱ھ میں ظفر کے متعلق لکھا ہے:۔

"شعر نہایت شیریں و نمکین کہتے تھے"۔

ظفر کے گیت اور ٹھمریوں کے متعلق بھی آزاد نے یہ لکھا ہے کہ ذوق کے تصنیف شدہ ہیں "ہزاروں گیت ٹپے ٹھمریاں، ہولیاں کہیں وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہیں"۔

تعجب ہے کہ ایک ٹھمری بھی ذوق نے بادشاہ کی نظر سے بچا کر اپنے نام کی نہ چھوڑی۔

"آب حیات" میں مولانا کی اس ناانصافی کی اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مولانا نے نواب الٰہی بخش خاں معروف کو بھی ذوق سے مشرف بہ تلمذ کرایا ہے "جو دیوان معروف کا اس وقت مروج ہے وہ تمام و کمال انہی کا اصلاح کیا ہوا ہے"۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں "ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہیں اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں اسی رعایت سے اس کا نام تسبیح زمرد رکھا گیا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پرو دی تھی"۔

لیکن آزاد کو جیسا کہ مولف "گلِ رعنا" نے لکھا ہے اپنے جوشِ عقیدت میں اس کا خیال نہ رہا کہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ برس کی تھی اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہوں گے۔
مصحفی نے تذکرۂ شعرا ۱۲۰۵ھ میں تالیف کیا اس میں ذوق کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ ذوق کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ سال بھر کی ہوگی، مگر نواب الٰہی بخش خاں معروف کا ذکر موجود ہے۔ یہ باتیں ثبوت ہیں کہ ظفر کے تعلق میں بھی آزاد کی رائے وقیع نہیں ہو سکتی۔

آزاد پر اس عقیدت کا رنگ اس قدر گہرا تھا کہ اس نے ایک حد تک ان کی تنقیدی صلاحیتوں کو سلب کر دیا تھا۔ ایسی گمراہ کن عقیدت کے زیرِ اثر آزاد نے ذوق کے معاصرین خصوصاً غالب کے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ غالب کو انھوں نے اسی نسبت اور اسی تناسب سے گھٹایا ہے جس سے کہ ذوق کو بڑھایا ہے۔ غالب کے کلام کو مناسب اور موزوں الفاظ میں "مہمل" تک بتانے سے دریغ نہیں کیا ہے۔
آزاد کی یہ لغزشیں تاریخ ادب کی حیثیت سے "آبِ حیات" کی اہمیت کو بہت گھٹا دیتی ہیں۔ لیکن تاریخِ ادب کی پہلی کتاب ہونے کی وجہ سے اسے اب بھی کافی اہمیت ہے۔ اولیت کا یہ فخر "آبِ حیات" کو ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

فطرت ایک مفلس کی نظر میں

جناب معین احسن جذبی

فطرت کے پجاری کچھ تو بتا کیا حسن ہے ان گلزاروں میں
وہ خواہ سلگتے ہوں شب بھر وہ خواہ چمکتے ہوں شب بھر

اس چاند کی ٹھنڈی کرنوں سے مجھکو تو سکوں ہوتا ہی نہیں
یہ جیب جیب نرگس کی کلیاں کیا جانے کیسی کلیاں ہیں

یہ لال شفق یہ لالۂ و گل اک چنگاری بھی جن میں نہیں
کیا تجھکو نظر آتی ہی نہیں یہ لرزش سی یہ سوزش سی

اُس وقت کہاں تو ہوتا ہے جب موسم گرما کا سورج
جاڑے کی بھیانک راتوں میں وہ سرد ہواؤں کی تیزی

دریا کے تلاطم کا منظر ہاں تجھکو مبارک ہو لیکن
کوئل کے رسیلے گیت سنے لیکن یہ کبھی سوچا تو نے

بادل کی گرج بجلی کی چمک بارش میں وہ تیزی تیروں کی
سب ہوش و خرد کے دشمن ہیں سب قلب و جگر کے رہزن ہیں

وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسیں کیسی زہرہ کیسی پروین
ہے کونسی رعنائی آخر ان پھولوں میں ان خاروں میں

میں نے بھی تو دیکھا اکثر کیا بات نئی ہے تاروں میں
مجھکو تو سکوں ہوتا ہی نہیں جب پھرتا ہوں گلزاروں میں

جو گھاتی ہیں جو ہنستی ہیں اور پھر بھی ہیں بیماروں میں
شعلے بھی نہیں گرمی بھی نہیں ہیں تیرے آتش زاروں میں

یہ موت کی ہلکی زردی سی ان صبح کے مدہم تاروں میں
دوزخ کی تپش بھر دیتا ہے دریاؤں میں کہساروں میں

ہاں وہ تیزی وہ بے مہری جو ہوتی ہے تلواروں میں
اک ٹوٹی پھوٹی کشتی بھی چکراتی ہے منجدھاروں میں

ہیں الجھے ہوئے نغمے کتنے اس ساز کے ٹوٹے تاروں میں
میں ٹھٹھرا سمٹا سڑکوں پہ تو جام بلب میخواروں میں

رکھا ہے بھلا کیا اس کے سوا ان راحت جاں مہ پاروں میں
اک روٹی کا ٹکڑا جو کہیں ملجائے مجھے بازاروں میں

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اُس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے اُس وقت یہ شبنم موتی ہے

حالی بحیثیت تنقید نگار

جناب محمد عبدالوحید (علیگ)

"مقدمہ شعر و شاعری" کی روشنی میں

ایک مشہور انگریز مصنف کا قول ہے کہ تنقید نگار کے تین فرائض ہیں۔ (۱) شاعر کی یا نقاش کی عظمت کو معلوم کرنا۔ (۲) اس پر سے پردہ اخفا اٹھانا۔ (۳) اور اس کی ترجمانی کرنا۔

آسکر وائلڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ صحیح نقاد کبھی صناع یا ادیب سے مخاطب نہیں ہوتا بلکہ پبلک سے۔ عوام سے اسے کام ہے نہ کہ مصنف سے۔

حالی نے غالب کی شاعری پر جو تنقید لکھی وہ اسی کا مصداق ہے۔ غالب کی شاعری کا شہرہ اگرچہ اس وقت بھی سارے ہندوستان میں تھا لیکن ان کی شہرت و قدردانی خواص تک محدود تھی۔

یوں تو اس وقت سے ہی جب غالب اکبرآباد میں تھے ان کا ذکر شعرا کے تذکروں میں شامل ہونے لگا تھا لیکن حالی نے یادگار غالب لکھ کر صحیح معنوں میں غالب کو عوام سے روشناس کرایا اور ان کے کلام کی خوبیاں عوام کے دل و دماغ میں اجاگر کیں۔ حالی "یادگار غالب" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"جو تو بر تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر ان کی زندگی میں پڑے رہے اور جواب تک مرتفع نہیں ہوئے۔ کیا عجب ہے کہ ہماری یا ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔"

حالی نے غالب کی نظم و نثر کے لئے جو طریقہ تنقید اختیار کیا ہے اس کو خود وہ گراں قدر نہیں خیال کرتے بلکہ یہ طریقہ انہوں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ پبلک کے مذاق کی رعایت ملحوظ تھی۔ لکھتے ہیں۔

"مرزا کو بحیثیت شاعر پبلک سے روشناس کرنے اور ان کی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ ان کے احسان کلام میں سے ایک معتدبہ حصہ نقل کیا جاتا۔ ہر صنف میں جو باتیں مرزا کی خصوصیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں۔ جو کلام نقل کیا جاتا اس کی لفظی و معنوی

خوبیاں، نزاکتیں اور باریکیاں ظاہر کی جاتیں، شعرا کے جس طبقہ میں مرزا کو جگہ دینی چاہیئے اس طبقے کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا ...... اور اس طرح مرزا کے پایہ شاعری اور ان کے کلام کی حقیقت سے اہل فن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گذار تھا اسی قدر پبلک کے لئے خاصکر اُس زمانے میں غیر مفید بھی تھا۔ اگر ہم اس دشوار گذار منزل کے طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثال ہوتی کہ "مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزا نہ آیا"۔

" ناچار ہم نے بجائے طریقہ مذکور کے جو حالت موجودہ میں باوجود دشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو ہمارے لئے سہل تر اور پبلک کے لئے مفید تر معلوم ہوتا ہے"

حالی نے غالب کے تمام کلام کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، نظم اردو، نثر اردو، نظم فارسی، نثر فارسی۔ اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا تھوڑا انتخاب چار جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے۔ ہر قسم پر اوّل کچھ مختصر ریمارک کئے ہیں پھر اس قسم کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور جو اشعار یا فقرے شرح طلب سمجھے ہیں ان کی جا بجا شرح بھی لکھی گئی ہے۔ کہیں کہیں محاسن کلام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں خاصکر ان لوگوں کے لئے جو فارسی لٹریچر کا مذاق رکھتے ہیں نمونہ کے طور پر غالب کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت استادوں صائب، ظہوری، نظیری، عرفی وغیرہ سے کیا ہے۔

حالی کی ناقدانہ نظریں اشعار کی تعداد کو نہیں دیکھتی تھیں بلکہ شعر کی عظمت و حقیقت پر جاتی تھیں۔ چنانچہ غالب کے مختصر مجموعۂ اردو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں اور جس قدر بلند اور اعلیٰ خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں"۔

"یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اس کے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجہ کے ہیں"۔

حالی نے غالب کے اردو کلام میں چار خصوصیات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور ان کی مثالیں پیش کی ہیں۔ (۱) ندرت اسلوب (۲) تشبیہات، استعارات اور کنایات کی جدت، (۳) پہلو دار اشعار اور (۴) چوتھی خصوصیت جو حالی کے خیال میں، کیا ریختہ میں اور کیا فارسی میں، کیا نظم میں، کیا نثر میں باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی و ظرافت ہے۔ ان کے علاوہ حالی نے مرزا کی جدت تخیل اور معنی آفرینی کی انتہائی داد دی ہے۔

حالی نے جو خصوصیات کلام غالب میں بتائی ہیں ان کو عام طور پر آج تک تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعد میں جتنی تنقیدیں غالب پر لکھی گئیں سب میں ان خوبیوں کو تسلیم کیا گیا ہے یہ اور بات ہے کہ بعض اور خوبیوں کا اضافہ کیا گیا ہو اور علاوہ ان کے اور مزید نکات بیان کئے گئے ہوں۔

مثلاً ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے فلسفیانہ عنصر کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ یا علامہ طباطبائی نے غالب کے کلام میں متحرک تشبیہات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔

موجودہ دور میں جب تنقید اپنا قدم آگے بڑھا رہی ہے، غالب کے نقاد ان کے ماحول اور شخصیت کے آئینے میں ان کی شاعری کا پرتو دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ غالب نامہ پر اس کی طرف توجہ کی گئی ہے۔

ایک جرمن نقاد کا خیال ہے کہ تنقید نگاری کے لئے اصول کو نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ مصنف کی شخصیت کو۔ رشید صدیقی نے "باقیات فانی" کے مقدمہ میں اسی طرز تنقید کی وضاحت کی ہے۔

حالی نے اگرچہ پورے طور پر غالب کی شخصیت کے آئینے میں ان کی شاعری کو نہیں دکھایا پھر بھی بعض بعض جگہ انھوں نے تنقید کے ذیل میں ان کی طبعی اُپج ان کی انفرادیت، اور ان کی تقلید سے نفرت کو جابجا ظاہر کیا ہے۔

مرزا غالب کی نثر کے متعلق حالی لکھتے ہیں:۔

"نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہو سکی۔"

شبلی نے بھی غالبؔ کو اپنے مضمون "سرسید اور اردو لٹریچر" میں جدید اردو نثر کا "سنگِ بنیاد" رکھنے والا تسلیم کیا ہے۔

جو خوبیاں حالیؔ نے بطور نقاد غالب کی اردو نثر خصوصاً خطوط نگاری میں بیان کی ہیں ان سے کسی کو انحراف کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ حالیؔ کے بعد تمام تذکرہ نویسوں نے جہاں غالبؔ کی خطوط نگاری کا تذکرہ کیا ہے حالیؔ کا بیان نقل کر دیا ہے۔ اس سے حالیؔ کی رائے کی صحت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

غالبؔ نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اڑا دیا۔ ادائے مطلب کا طریقہ ایسا رکھا جیسے دو آدمی بیٹھے بالمشافہ بات چیت کر رہے ہوں۔ بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں، جہاں خط میں سوال و جواب کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے اور نہ ان کے کلام کی علامت لکھتے ہیں مگر سوال و جواب کے ضمن میں ایک لفظ ایسا لے آتے ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے اور جواب کیا۔ خط لکھتے ہوئے ان کا یہ نصب العین رہتا ہے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اسے پڑھکر خوش اور محظوظ ہو، ظرافت کی چاشنی خطوط میں ضرور دیتے ہیں ———— یہ سب خصوصیات حالیؔ نے مفصل طور پر عام نگاہوں کے سامنے پیش کی ہیں۔

ان خطوط کے علاوہ غالب نے تقریظیں اور دیباچے بھی لکھے ہیں جن میں مسجع عبارت سے کام لیا ہے۔ اگرچہ ان میں بھی بعض بعض نثریں خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے مفتی میر لال صاحب کی کتاب سراج المعرفت پر لکھا ہے اس لحاظ سے کہ اردو نثر میں تصوف کے اعلیٰ خیالات اس سے پہلے ایسی عمدگی سے نہیں لکھے گئے قابل قدر ہے لیکن حقیقتاً ان تقاریظ اور دیباچوں کو خطوط کی اہمیت حاصل نہیں۔ حالیؔ نے اس بات کو تسلیم کیا ہے:-

"بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اردو خطوط میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً سجع کی عبارت نے ان میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے"

حالیؔ نے غالبؔ کی فارسی نظم و نثر کو اردو کلام پر فوقیت دی ہے۔ لکھتے ہیں "مرزا غالبؔ کے

کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے وہ ان کی فارسی نظم و نثر"۔

غالب خود بھی اپنی فارسی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ؎

فارسی بین تا بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگِ منست

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی فارسی دانی مسلّم تھی اور اس کی نظم و نثر پر بھی ان کو پورا کمال حاصل تھا۔ لیکن غالب کے فارسی کلام کو اردو کلام کے مقابل اس لئے کوئی اہمیت حاصل نہیں کہ فارسی ادب میں ان کی نظم و نثر وہ اجتہادی شان نہیں رکھتی جو اردو نظم و نثر اردو ادب میں رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں اگرچہ حالی نے فارسی قصیدہ اور غزل میں ان کا مرتبہ عرفی اور نظیری سے بالا اور نثر میں عرفی نظیری اور ظہوری سے بالاتر بتایا ہے لیکن حالی کی اس رائے میں کسی قدر عقیدت کا شائبہ جھلکتا ہے۔

حالی کے الفاظ ہیں:۔

" مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری سے بالا اور نثر میں تینوں (عرفی، نظیری، ظہوری) سے بالاتر ہے"۔

اس جگہ ہم "یادگارِ غالب" کے متعلق محمد اکرام مؤلف "غالب نامہ" کی رائے لکھتے ہیں جو بہت صحیح ہے۔

" یہ صحیح ہے کہ "یادگارِ غالب" پرانے اصولوں پر لکھی گئی ہے اور جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے بتایا اس میں کئی خامیاں ہیں۔ لیکن ابھی تک اور تبصرہ ایسا نہیں شائع ہوا جس میں اس سے کم خامیاں ہوں اور پھر یادگار کے مطالعہ سے اس یک طرفہ رائے قائم ہونے کا کوئی احتمال نہیں جو اور کتابوں کے مطالعہ سے قائم کی جا سکتی ہے"۔

تنقید کی قیمت اور اہلیت کے اندازہ کے لئے نقاد کی شخصیت کا مطالعہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت نے اس کے تنقیدی کارنامے پر کیا اثر ڈالا۔

حالی کی شخصیت جیسا کہ خود انھیں اعتراف ہے بڑی حد تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے فیضان صحبت سے بنی۔ شیفتہ کی حیثیت نقاد کے بطور مسلم ہے۔ ان کا تذکرہ "گلشنِ بیخار" تمام قدیم تذکروں میں

انصاف پسندی اور سلاست رائے کی وجہ سے مستند ہے۔ غالب نے اپنے ایک قطعہ میں اعتراف کیا ہے کہ جبتک شیفتہ شعر کو پسند نہیں کر لیتے ہیں اپنے دیوان میں شامل نہیں کرتا ؎

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بایں زورش کہ او
نہ نوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

حالی نے ان کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ خود اپنی فطری صلاحیت اور شیفتہ کی ہم نشینی کا اثر ل کر ان کو ایک عظیم الشان نقاد کی حیثیت نہ دیدیتا۔

غالب کی شاعری اپنے زمانے میں خواص ہی میں مقبول رہی۔ عوام تک اسے پہونچانے اور غالب کی عظمت کا نقش ہر دل میں بٹھانے میں "یادگار" کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کی تنقید کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال ہے۔ وہ نہ بجنوری کی طرح غالب کو الہامی درجہ دیتے ہیں، ورنہ لطیف کی طرح انھیں غیر ہم آہنگی کا الزام لگاتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی جو خصوصیات گنائی ہیں وہ سب اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اور تمام نقادوں حتیٰ کہ اکرام کا بھی فیصلہ ہے کہ غالب کی سب سے زیادہ منصفانہ تنقید "یادگار" میں ملتی ہے۔ انھوں نے غالب کے مشکل اشعار کی شرح کر کے غالب کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا ہے۔ اور فارسی کے بعض شعرا سے انکا موازنہ ایک طرفہ نہیں بلکہ انصاف پر مبنی ہے۔ ان کی یہ رائے کہ خسرو اور فیضی کے بعد مرزا کی لٹریری قابلیت اور جامع صفات کا آدمی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا بڑی حد تک صحیح ہے۔ غالب کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھیں حالی جیسا سوانح نگار ملا ورنہ آزاد نے تو غالب کے کمالات پر ابدی تاریکی کا پردہ ڈالنے میں اپنی جیسی کوشش کر لی تھی۔

خلجی سلاطین دہلی کی اصلِ نسل

جناب شیخ عبدالرشید ایم۔ اے (علیگ)
لکچرار شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ضیاء الدین برنی کی مشہور تصنیف "تاریخ فیروز شاہی" میں فاضل مصنف کا حسب ذیل بیان بڑی حد تک ان شکوک اور غلط فہمیوں کا ذمہ دار ہے جو اُن خلجی ترکوں کی اصل و نسل کے بارے میں پیدا ہو گئی ہیں جنہوں نے تیرھویں[1] صدی ہجری میں ہندوستان میں ایک زبردست مرکزی حکومت قائم کی تھی۔

ڈو[2] اور برگس[3] نے تاریخ فرشتہ کے جو ترجمے کیے ہیں یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ جو غلط ترجمے کیے ہیں، ان سے یہ مسئلہ اور زیادہ الجھ گیا ہے۔ عرصے تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ خلجی نسل کا ترکی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلجی نسل ترکی ہی سے شروع ہوئی لیکن مورخین کی لاپروائی اور خود خلجیوں کے عرصے تک غیر ترکی ممالک کے قیام نے انہیں ان کی نسل کی اصلیت سے محروم کر دیا۔ خلجی ترک نژاد ہیں اور اس مضمون میں میں نے یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ "۶۸۸ھ میں سلطان جلال الدین خلجی کیلوگھڑی کے محل میں تخت نشین ہوا لیکن چونکہ گذشتہ اسّی برس سے اہلِ دہلی ترکوں کے زیر سایہ پھولتے پھلتے رہے تھے انہیں خلجیوں کی حکومت ناقابلِ برداشت سی محسوس ہوئی اور یہی وجہ تھی کہ سلطان جلال الدین کچھ دن تک شہر میں داخل ہونے سے باز رہا...... اہل دہلی کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی کہ ترکوں کے بجائے خلجی کیسے حکمرانی کرنے لگے اور یہ کہ سلطنت ترکوں سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں کیسے پہونچ گئی"[4]

ضیاء الدین برنی نے اس کے علاوہ بھی ایک آدھ جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ سلطان جلال الدین کی اصل نسل

---

۱ ۱۲۹۰-۱۳۲۰-

۲ Dow, Alexander – The History of Hindustan, London, 1770-72.

۳ Briggs, Rise of Mohammedan Power, 4 volumes.

۴ Berni, Calcutta Text, Page 175.

نہ تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ سلطان کیقباد کی موت کے بعد سلطنت ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئی[1]۔ برنی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ خلجیوں نے جن کا تعلق ترکی نسل سے نہ تھا ترکوں کو تخت سے محروم کر دیا جو برنی کے خیال میں تصرفِ قدیم کی بنا پر اس کے جائز مستحق تھے۔ اہلِ دہلی کو ممکن ہے الباری ترکوں کے بعد خلجیوں کی حکومت کچھ اجنبی سی محسوس ہوئی ہو لیکن وہ اس بنا پر قابلِ معافی تصور کئے جا سکتے ہیں کہ انھیں ترکی قبیلوں کی نسل کے متعلق صحیح معلومات نہ تھیں۔ ترک سلاطین اور ان کی حکومت سے قدیم وابستگی کی بنا پر اہلِ دہلی کو اُن کے ساتھ ایک قسم کی انسیت اور وفاداری کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ بلبن نے عرصے تک حکومت کی اور ایک طرح سے اس کے دورِ حکومت میں رعایا خوش و خرم بھی رہی۔ اس نے اپنے مال و زر کی نمائش سے رعایا کو مرعوب کر دیا تھا اور اس کی زبردست شخصی حکومت سے رعایا اُس سے خوف زدہ بھی ہوگئی تھی۔ وہ اس امر کی تدبیر و تفکر میں رہتا تھا کہ اپنے کو شاہی نسل سے ثابت کرے اور اس طرح ایرانی شاہانِ سلف سے اپنا رشتہ نکالے تاکہ خود اس کی نسل ایک قدیم شاہی خاندان تصور کی جائے۔ اس کے بیٹوں اور پوتوں کے متعلق عوام میں خیال تھا کہ وہ شاہی گھرانے سے ہیں اور نہایت ہنرمند اور باکمال ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خلجی غاصب اور نو دولتئے ہونے کے علاوہ نہایت اکھڑ اور جنگجو لوگ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اہلِ دہلی ان سے بے رحمی اور سخت گیری کے متوقع تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ نہ تو خلجیوں کو پسند کرتے تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ وہ حکومت کریں۔ خلجیوں کو تختِ حکومت ملجانے پر اہلِ دہلی کے حقارت آمیز استعجاب کی یہی وجوہ تھیں۔

لیکن ضیاءالدین برنی کی بریت میں ناواقفیت کا عذر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس خلط مبحث کے باوجود نہایت محتاط مصنف ہے۔ اس نے اپنی کتاب کے دیباچے میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے اپنی کتاب کی تالیف کے سلسلے میں تمام ممکن الحصول تحریری اور زبانی مواد سے مدد لی ہے[2]۔ مزید برآں اسکو

---

[1] Barni, Calcutta Text, Pages 171-172 and 173.

[2] ضیاءالدین برنی پر سید حسین برنی کا مضمون "اسلامک کلچر" جلد ۱۲ شمارہ ۱۔

صحیح واقعات معلوم کرنے کے بہترین ذرائع حاصل تھے۔ اولاً خاندانی تعلقات کی بنا پر دوسرے یہ کہ دارالخلافہ کے علماء و فضلاء اور دربار کے با اثر اور ذی اقتدار لوگوں سے اس کے ذاتی مراسم تھے۔ ایک شخص جو سترہ سال تک محمد تغلق کے دربار میں رہا اور جسے حضرت نظام الدین اولیا، امیر حسن سنجری، اور حضرت امیر خسرو جیسے اصحاب کی دوستی کا فخر حاصل تھا، خلجیوں کی اصل و نسل سے کبھی ناواقف نہیں رہ سکتا تھا۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ضیاء الدین برنی کا بیان یا تو خلجیوں کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے واقعات کے اخفار بالعمد پر مبنی کیا جا سکتا ہے یا پھر کسی ایسی وجہ پر جو ہنوز سمجھ میں نہیں آسکی ہے۔ خلجی سلطنت کے بانی شہنشاہ جلال الدین کے عہدِ حکومت میں ضیاء الدین برنی بالکل نوعمر تھا۔ اس نے اس شہنشاہ کے دربار اور اسکے عیش و نشاط کے جلسوں کا تذکرہ جس حسرت و یاس سے کیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان چیزوں نے اس کے نوخیز دماغ پر کتنا گہرا نقش چھوڑا تھا۔ وہ بڑی حسرت سے اُس دورِ نشاط کی واپسی کی تمنا کرتا ہے۔ جلال الدین کے متعلق اس کی رائے ضرور اچھی ہے لیکن اس کی نظر میں علاء الدین کا نظامِ حکومت قابلِ وقعت و ستائش نہیں ہے اور نہ وہ اس کی جیسی حکومت کی واپسی کی حسرت کرتا ہے۔ اس کی توصیف بھی جن مواقع پر وہ واقعی اس کا مستحق ہے' ضیاء الدین برنی نے با دلِ ناخواستہ کی ہے۔ علاء الدین کے بیٹے اور اس کے وارث سلطان قطب الدین کا تذکرہ اس نے نہایت حقارت سے کیا ہے۔ یہ تھے تین خلجی سلاطین جن کے عہدِ حکومت میں اس کے دماغ کی نشو و نما ہوئی لیکن خلجی خاندان کے آخری چشم و چراغ کی موت کے ۳۰/۲۷ برس بعد جب وہ ان کے حالات لکھتا ہے تو انہیں ترک نژاد تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی وجہ صرف یہی بتائی جا سکتی ہے کہ اہلِ دہلی کو التمش کے ورثا سے نہایت شدید جذباتی تعلق تھا۔ اور برنی بھی اس معاملے میں اہلِ دہلی کا ہم خیال تھا۔ نیز یہ عقیدہ کہ مقدس اشخاص اور قدیم شرفا و امرا کے خاندان کے لوگ حکومت کی مراعات کے خاص طور پر مستحق تھے اور حکومت کے تمام عہدے بلا ذاتی قابلیت اور اونچ کے لحاظ کے ان ہی دونوں طبقوں کا حق تھے۔ التمش اور بلبن نے لوگوں کے دماغ میں یہ خیال جما دیا تھا۔ خلجی سامراج نے اول الذکر (مقدس لوگوں کا طبقہ) کی بیخ کنی کرکے انہیں ملک میں منتشر کر دیا اور مؤخر الذکر (امرا اور شرفا کے خاندان کے لوگ) کو ذلیل کرکے ان کی خودداری اور پندار کو مجروح کیا۔

خلجیوں کے دلوں میں نہ تو زہدا کی عزت و وقعت تھی ورنہ وہ امرا کے طبقے سے خائف تھے۔ ان کے نزدیک لیاقت اور اہلیت کا معیار تھا اور اس معاملے میں وہ اس قدر سخت تھے کہ صدر الصدور کے عہدے تک پر ایک ملتانی کو فائز کر دیا جس پر مولانا شمس الدین ترک نے ان الفاظ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ "تمہارے متعلق میں نے متعدد باتیں سنی ہیں۔ ان میں سے ایک جو نہ خدا کو اور نہ اس کے رسول کو پسند آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم نے تمام عہدوں میں سب سے زیادہ نازک خدمت پر جس کے لئے کوئی شخص جو تارک الدنیا نہ ہو قطعی موزوں نہیں ہے، اس حامد نامی ملتانی شخص کو فائز کر دیا ہے جو اپنے دادا کے وقت سے سود خوری کرتا رہا ہے۔ تمہیں کسی قاضی کے مسلک سے کوئی مطلب ہی نہیں، تم مفتی کا کام ایسے آدمیوں کے سپرد کرتے ہو جو خود غرض، لالچی اور دنیا پرست ہیں"[1] اس لحاظ سے گویا خلجی ترک نژاد نہیں تھے چونکہ ان کا برتاؤ سلف کے ترک حکمرانوں کا سا نہ تھا۔

ضیاء الدین برنی اہم عہدے داروں کے شجرے کے بارے میں بہت سخت تھا۔ یہ خصوصیت التمش کی میراث تھی جس نے پہلے پہل ترکوں کو اپنی مشہور شمسی غلاموں کی فوج میں داخل کر کے طبقاتی امتیاز پیدا کیا، اور بلبن کے شاہی خاندان کی برتریت کے تحفظ کی کوشش کا اثر تھی جس نے سرکاری ملازمت کے لئے نسب کی شرط لگا دی تھی۔

ضیاء الدین برنی رعایا کو "شریف" اور "رذیل" دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کی تصنیف کے غائر مطالعہ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شریف سے اس کا مطلب وہ لوگ ہیں جو ان باعزت خاندانوں کی اولاد ہیں جو ہندوستان کی مسلمان آبادی میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، یا وہ شریف النسب مہاجرین جو منگولوں کے عروج کے تباہ کن اثرات سے اپنا آبائی گھر چھوڑ کر ہندوستان میں آبسے تھے۔ اس کی نظر میں خلجی قابل عزت نہیں تھے ان کا نہ کوئی قدیم شجرہ تھا اور نہ ان میں کوئی ذاتی خصوصیت ایسی تھی جو ان کی سفارش ہو۔ وہ نہ تو الباری ترک تھے اور نہ التمش کے زمانے کے جہلگانیوں سے ان کا کوئی تعلق تھا۔ اسی بنا پر ان کی نسل کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا اور ان کو ان عام اور بے نسب مسلمانوں کے طبقے میں رکھا تھا جن کی اس وقت

---

[1] "ضیاء الدین برنی" کلکتہ کا نسخہ ص ۲۹۸۔

ہندوستانی مسلمانوں میں اکثریت تھی۔ برنی کے سرگشتہ بیانات کی صرف یہی توضیح ہوسکتی ہے۔ اس کے بیان کو خلجیوں کے اصل و نسل کے بارے میں حکم قطعی سمجھ لینا اصول اور تاریخ کے خلاف ہوگا۔ برنی خلجیوں کا ہمعصر تھا۔ وہ بہت پڑھا لکھا خاندانی و دربار رسوخ آدمی تھا۔ واقعات کی صداقت معلوم کرنے کے اسکے پاس یقیناً کافی ذرائع تھے لیکن اس موقع پر پہلی مرتبہ خلجیوں سے اس کی ذاتی نفرت اُس کی مورخانہ نکتہ رسی اور صداقت گوئی پر غالب آگئی۔

برنی کے بعد جو دو مورخ اس نکتے کو صاف کرسکتے تھے وہ شمس سراج عفیف[1] اور یحییٰ[2] ابن احمد سرہندی تھے۔ لیکن یہ دونوں اس بارے میں خاموش ہیں اور ان کی تصانیف سے اس تعلق میں کسی قسم کی معلومات اخذ کرنا مشکل ہے۔ فرشتہ اور نظام الدین نے سولہویں صدی میں اس بارے میں معین بیانات لکھے ہیں نظام الدین اپنی تصنیف طبقاتِ اکبری میں لکھتا ہے:

"میں نے معتبر تواریخ میں سے ایک میں دیکھا ہے کہ قبیلہ خلج چنگیز خاں کے داماد خلج خاں کی نسل سے ہے اور اس کی سرگذشت یہ ہے۔ خلج خان کے اپنی بیوی سے تعلقات ناخوشگوار ہوگئے تھے۔ لیکن چنگیز کے خوف سے اسے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ بناوٹی نرمی اور شائستگی برتتا رہے۔ خلج خاں برابر چھٹکارہ حاصل کرنے کی فکر میں رہا لیکن کوئی موقعہ نہ پا سکا۔ آخر کار چنگیز خاں نے سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کو سندھ کے ساحل پر شکست دی اور ایران و توران کی فکروں سے آزاد ہوکر اپنے وطن کی طرف واپس ہوا اور اسی درمیان میں رحلت کی۔ موقع غنیمت جانکر خلج خاں جو غور اور غارستان کے پہاڑی علاقوں سے بخوبی واقف تھا اور سمجھتا تھا کہ وہاں تک کوئی نہ پہونچ سکے گا اپنے خاندان اور اپنے قبیلے کے ساتھ جو تین ہزار خاندانوں پر مشتمل تھا وہاں آکر بس گیا۔

چنگیز خاں مرچکا تھا اور اس کے بیٹوں میں سے کسی نے اُس کی اس نقل و حرکت پر دھیان نہیں دیا چنانچہ وہ یہیں بسا رہا اور اس کی نسل بڑھتی گئی۔ جب غور کے سلاطین اور اُن کی باجگزار ریاستوں

---

[1] "تاریخ فیروز شاہی"

[2] "تاریخ مبارک شاہی" منا "طبقاتِ اکبری" نظام الدین کلکتہ کا نسخہ صفحہ ۱۱۶

نے ہندوستان کو فتح کیا، خلج کے لوگ قرب وجوار میں ہونے کے سبب مختلف اوقات میں ہندوستان آکر ملازمتوں میں داخل ہوتے رہے اور اعلیٰ مراتب حاصل کرتے رہے۔ سلطان جلال الدین کا باپ اور سلطان محمود خلجی منڈوی کا باپ جو زبردست ملوک اور مشہور سلاطین تھے، خلج خاں کے پوتے تھے۔ "قلج" ایک حرف کے ردّ و بدل سے "خلج" بن گیا اور کثرتِ استعمال سے "خلج" ہو گیا۔ سلجوق نامے کے مصنف کے مطابق یافث کے بیٹے کے گیارہ لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام خلج تھا اور اس کی اولاد خلجی کہلائی۔[1]"

نظام الدین کے مندرجہ بالا بیان میں خود تضاد موجود ہے۔ اس کا ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب کرتا ہے۔ خلجی خوارزم شاہیوں، محمود غزنی اور شہاب الدین غوری کی افواج میں بحیثیت اجرت یافتہ سپاہیوں کے داخل ہوئے اور لڑائیوں میں حصہ لیا۔ مشہور خلجی فاتح محمد بختیار نے، وسط ایشیا میں منگولوں کے ابھرنے سے بہت پہلے، شہاب الدین غوری کی طرف سے بنگال پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا تھا۔

عتبی کے بیان کے مطابق محمود کی فوج میں، جس نے ۳۰۰۱ھ میں بلخ کے قریب فتح حاصل کی، خلجیوں کا ایک دستہ تھا۔ نسادی کے بیان کے مطابق جلال الدین خوارزم شاہ کی فوج میں بھی جس نے سمرقند کی محافظت اور مدافعت کی تھی، خلجیوں کا ایک دستہ شامل تھا۔ آگے چلکر نظام الدین اپنے سابقہ بیان کو فراموش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خلج خاں کے اخلاف غوریوں کے ساتھ، جن کا ملک منگولوں نے تاراج کر دیا تھا اور جن کی شہنشاہیت ختم کر دی تھی، ہندوستان آئے۔ فرشتہ نے اس غلطی کو محسوس کیا اور واضح طور پر اس کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "ان اوراق کے مصنف محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ کو دوسرا بیان زیادہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔ غزنویوں کی تواریخ میں اس امر کا تکرار او عا کیا گیا ہے کہ امیر سبکتگین اور سلطان محمود کے بہت سے افسر خلجی نژاد تھے۔ ان سلاطین (سبکتگین اور محمود) کا زمانہ یقینی چنگیز خاں سے قبل کا ہے۔ تاہم یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ سلطان جلال الدین

---

[1] طبقات اکبری" نظام الدین کلکتہ کا نسخہ صفحہ ۱۱۶

شہنشاہ دہلی اور سلطان محمود والئی مندو ایک خلجی سردار قلیج کی نسل سے ہوں"[1] ملا عبدالقادر بدایونی بھی اس خیال سے متفق ہے۔ وہ کہتا ہے "اگرچہ "تاریخ طبقاتِ محمود شاہی" کا مصنف شہاب الدین کلیم کرمانی جونپوری سلطان جلال الدین اور سلطان محمود مالوی کا سلسلہ نسب چنگیز خاں کے داماد قلیج خاں سے ملاتا ہے لیکن یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس کی پشت پر ایک طویل داستان ہے۔ کم از کم یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ اس شجرے کی پشت پر کوئی وقیع سند نہیں ہے اور ہر صائب الرائے انسان اس دعوے کا کھوکھلا پن بآسانی محسوس کر سکتا ہے .... بعض تواریخ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ خلج یافث بن نوح کے ایک بیٹے کا نام تھا اور خلجی اُس کی اولاد سے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب"[2]

Barthold نے جو وسطی ایشیا کی تاریخ اور وہاں کے جغرافیائی حالات پر سند سمجھا جاتا ہے خلج کو ایک ترکی قبیلے سے تعبیر کیا ہے جو دوسرے ترکی قبائل سے بہت زیادہ جنوب میں سیستان اور ہندوستان وسط یعنی موجودہ افغانستان کے جنوبی حصے میں چوتھی صدی عیسوی میں آباد تھے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ چوتھی صدی سے بھی بہت پہلے وہاں آ بسے تھے[3] اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کا شمار بھی افغانوں میں ہونے لگا تھا۔ میجر ریورٹی اور ایلفنسٹن کے خیال کے مطابق خلجی ترک تھے جو بہت عرصے تک افغانستان میں ہرات اور مشرقی علاقے میں رہنے کے باعث وہاں کے اصلی باشندوں سے مماثل ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترک سے زیادہ افغان نژاد سمجھے جاتے ہیں۔

میر خوند کی سند پر روایت ہے کہ اُغز خاں نے ایک قبیلے کا نام خلج رکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے "ترک قبیلہ خلج (Khalj) جو بعض اوقات نظم میں خلج (Khalaj) بھی کہا جاتا ہے) کا نام بھی اغز خاں نے رکھا تھا۔ میر خوند لکھتا ہے "اغز خاں کی ایک مہم کے دوران میں اس کے چند آدمی لشکر سے جدا ہو کر پیچھے رہ گئے۔ جب وہ واپس آ کر لشکر میں شامل ہوئے تو اغز خاں نے ان سے اپنے احکامات کی

---

[1]۔ تاریخ فرشتہ مطبوعہ نولکشور پریس۔ صفحہ ۸۸

[2]۔ "منتخب التواریخ" بدایونی۔ ترجمہ Ranking صفحہ ۲۳۰۔

[3]۔ Encyclopaedia of Islam, Page 875

خلاف ورزی کی وجہ دریافت کی۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا کہ چونکہ ہم لوگوں کو کئی روز کا کھانا اپنے ساتھ رکھنے کا حکم ملا تھا اس لئے ہم لوگ کھانے کی تلاش اور تیاری میں رہ گئے۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو اپنے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اسی دوران میں میری بیوی کو دردِ زہ شروع ہوگیا۔ جب بچّہ پیدا ہوا تو معقول اور مقوّی غذا نہ ملنے کی وجہ سے ماں کے اتنا دودھ نہیں تھا کہ وہ بچّہ کو پلا سکے اور نہ میرے ہی پاس اشیاء خورد نوش ایسی تھیں جو اسے (بیوی کو) کھلا سکوں۔ میں نے ارد گرد دیکھا تو ایک لومڑی نظر پڑی جس نے ایک تیتر شکار کیا تھا۔ میں نے لومڑی کے لکڑی ماری اور وہ تیتر چھوڑ کر بھاگ گئی۔ میں نے جب تیتر بھون کر اپنی بیوی کو کھلایا تب وہ اس قابل ہوئی کہ بچّے کو دودھ پلا سکے۔ اغز نے یہ واقعہ سنکر بچّہ کا نام خلج رکھا یا بس ئے معنی بعض مصنفین کے مطابق "عورت کو پیچھے چھوڑ جاؤ" ہیں اور بعض مصنف کہتے ہیں کہ یہ ایک مرکب لفظ ہے "جوخل" بمعنی "چھوڑ دیا گیا" اور "آج" بمعنی "بھوکا" سے بنا ہے یعنی "بھوکا چھوڑ دیا گیا۔ اس شخص کی نسل بڑھتی گئی اور اس کی متعدد شاخیں ماوراءالنہر غور و گرم سیر اور خراسان اور عراق میں پھیل گئیں۔"[1]

خلجیوں کے ترکی النسل ہونے کا ثبوت عرب جغرافیہ دانوں کے بیانات سے بھی بدرجہ اتم ملتا ہے۔ ابن خرداذبہ لکھتا ہے "تاراز سے نوشاجان تک تین فرسنگ کا فاصلہ ہے اور وہاں سے کسرا باس ۲ فرسنگ ہے۔ یہ گرم مقام ہے" اور کرلوک" یہاں جاڑے کا موسم گذارتے ہیں۔ اس سے متصل ہی وہ مقامات ہیں جہاں خلج اپنے جاڑے کے اوقات بسر کرتے ہیں۔"

"کتاب معاجم البلدان" میں یہ عبارت ملتی ہے۔ "خلج غزنی سے متصل زابلستان کے قرب وجوار میں ایک مقام ہے۔"[2]

فخرالدین مبارک شاہ ابن ابوالحسن المروالردھی ترک قبیلوں کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس زمانے میں ترک بہت سے قبیلوں پر مشتمل ہیں۔ ان لوگوں کی ملکیت میں بہت سی چراگاہیں

---

[1] "طبقات ناصری" ترجمہ ریورٹی۔ صفحہ ۸۷۰ نوٹ۔

[2] Bibliotheca Geographorum Arabicorum, Vol. 2, Page 459.

ہیں اور یہ بالعموم میدانوں میں رہتے ہیں لیکن اپنے گلوں کی وجہ سے مستقل طور سے ایک مقام پر قیام نہیں کرتے۔ البتہ جاڑوں کے موسم میں جب زمین برف سے ڈھک جاتی ہے تو وہ ایک ہی جائے پناہ پر مقیم رہتے ہیں۔ تمام ترکی قبیلوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا تو قریب قریب ناممکن ہے البتہ ذیل کی فہرست میں چند مشہور مشہور قبیلوں کے نام درج ہیں "[1] فہرست میں گیارھویں نمبر پر قبیلہ خلج کا نام ہے۔ اور یہ امر خلجیوں کے ترک نژاد ہونے کے خلاف تمام شکوک رفع کر دیتا ہے۔ فخرالدین، غیاث الدین غوری کا ہمعصر تھا وہ نہایت معتبر اور پڑھا لکھا شخص تھا اور ابن اسیر نے اس کی بڑی تعریف لکھی ہے۔

ذیل میں چند عرب جغرافیہ دانوں کے بیانات سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جو خلجیوں کے ترکی النسل ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

غزنین اور دوسرے قصبات کی، جن کے نام ہم نے گنائے ہیں، حدود میں خلج ترک آباد ہیں جو بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ یہ لوگ موسم اور چراگاہوں کی سہولتوں کے مطابق بلخ اور تخارستان کے صوبوں میں چکر لگاتے ہیں "[2]

"خلج قوم کے ترک ہیں جو زمانہ قدیم میں غور کی پشت پر سیستان اور ہندوستان کے درمیان کے خطے میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ مویشی پالتے ہیں اور اپنی زبان، لباس اور وضع قطع میں ترکوں سے مشابہ ہیں "[3]

"اغز ۲۴ قبیلوں پر مشتمل تھا لیکن ان میں سے ۲ خلجی برادریاں وفاقی انجمن سے علیحدہ ہو گئیں۔ اس لئے اب ان دونوں کا شمار اغز میں نہیں ہوتا "[4]

"خلج" ترکوں کا ایک قبیلہ ہے جو خلوخ کی حدود سے زابلستان میں جا بسے غزنین کے اضلاع

---

[1] (الف) "تاریخ فخرالدین مبارک شاہ" (ب) "عجیب نامہ" صفحہ ۴۰۷۔

[2] "حدود العالم" مترجمہ ، Minorsky ، صفحہ ۱۱۱۔

[3] "استخری" صفحہ ۲۴۵

[4] "کاشغری دیوان لغت الترک

میں گھاس سے ڈھکا ہوا ایک میدان ہے۔ جہاں اب یہ لوگ رہتے ہیں۔ یہاں ہوا میں گرمی کی وجہ سے انکا رنگ سانولا پڑگیا ہے اور زبان میں کچھ تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔"[1]

"مسالک الممالک" سے جو محمود غزنین سے بہت پہلے کی لکھی ہوئی ہے پتہ چلتا ہے کہ خلج حقیقت[2] میں ترکوں ہی کا ایک قبیلہ ہے جو زمانہ قدیم میں سیجستان اور ہند کے درمیان گرامسیر میں آباد ہوگئے شکل وشباہت اور لباس میں وہ ترکوں سے ملتے ہیں۔ ترکی بولتے ہیں اور ترکوں ہی کی رسوم کی پابندی کرتے ہیں۔"

افغانستان کا غلزئی قبیلہ بلا کسی شک وشبہ کے ترک نژاد ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہی خلجی ہیں میجر ریورٹی (Major Raverty) نے اس پر سخت اعتراض کیا ہے۔ لیکن بقول وولزی ہیگ (Wolsey Haig) اگر غلزئی خلج نہیں ہیں تو پھر خلج کیا ہوئے۔"

اس موضوع پر حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی۔

۱۔ "تاریخ فیروز شاہی" ضیاء الدین برنی۔
۲۔ "طبقات اکبری" نظام الدین بخشی۔
۳۔ "تاریخ مبارک شاہی" یحییٰ بن احمد سرہندی۔
۴۔ "گلشنِ ابراہیمی" فرشتہ۔
۵۔ "منتخب التواریخ" عبدالقادر بدایونی
۶۔ "The Lands of the Eastern Caliphate." Le Strange
۷۔ "Turkestan down to the Mongol invasion." W. Barthold
۸۔ "حدود العالم" مترجمہ منارسکی (Minorsky)۔
۹۔ "The History of India," Mountstuart Elphinstone

---

[1] "جہاں نما" محمد مجیب بکرم۔
[2] "ابن حوقل" Quoted in J. R. A. S. Vol. XLIV

۱۰۔ "تاریخ فخرالدین مبارک شاہ" فخرالدین مبارک شاہ۔

۱۱۔ Nuzhatul-Qulub of Hamdullah Mustafa. Gibb. Mem. Vol. XXIII

۱۲۔ Bibliothica Geographorum Arabicorum for (a) Ibne Khurdzbeh, (b) Istakhri, (c) Ibn Haukal.

۱۳۔ Journal of the Asiatic Society of Bengal, Vol. XLIV.

۱۴۔ Encyclopaedia of Islam.

۱۵۔ "عجیب نامہ"۔

۱۶۔ "طبقاتِ ناصری۔ مترجمہ میجر ریورٹی۔ (Major Raverty).

امتحان میں شرکت کی اجازت نہ ملنے پر

اظہر کمالی۔ بی۔ اے (علیگ)

کیا بتاؤں دل کی حالت میں تجھے اے ہم نشیں — تا بہ ہنگام اجل یہ غم بہلا سکتا نہیں
ایک ہلچل سی مچی ہے عالم جذبات میں — ایک ہنگامہ بپا ہے میرے احساسات میں
صبر کا دامن مرے ہاتھوں سے چھوٹا جائے ہے — دل ہے نازک آبگینہ سا کہ ٹوٹا جائے ہے
آندھیوں کی یورشیں ہیں اور باغِ آرزو — بجھ گیا تقدیر کے ہاتھوں چراغِ آرزو
گلشنِ دل ہو گیا اے دوست پامالِ خزاں — لٹ گیا نزدیکِ منزل آکے میرا کارواں
سرنگوں ہیں ولولے مایوسیاں ہیں جوش پر — ایک بجلی سی گری ہے میرے عقل و ہوش پر
کشتیِ امید ڈوبی آکے ساحل کے قریب — اک خلش سی پا رہا ہوں ہم نشیں دل کے قریب
میں ہوں اور افسردگی مردہ دلی کا جوش ہے — فرطِ غم سے ہر نفس میرا الم بردوش ہے
میں غم و آلام کی تاریکیوں میں کھو گیا — میری امیدوں کی دنیا میں اندھیرا ہو گیا
میرے مستقبل پہ مایوسی کے بادل چھا گئے — غنچہ ہائے شوق و ارماں بن کھلے مرجھا گئے
ہم نفس "تقدیر سے رسوائیِ تدبیر دیکھ" — میرے مستقبل کے زریں خواب کی تعبیر دیکھ

خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا اے ہم نشیں — اب سوائے صبر کے باقی کوئی چارہ نہیں
مجھ سے ہمدردی ہے تجھ کو دوست تیرا شکریہ — معترف ہوں میں ترے اس بے غرض اخلاص کا
مجھ کو تیری دوستی پر اعتماد و ناز ہے — ہمدم و مونس ہے تو میرا امینِ راز ہے
جانتا ہوں میں کہ میرے غم سے تو بھی ہے غمیں — مانتا ہوں میں مرے باعث ہی تو اندوہگیں

ہاں مگر کرتا ہے تو رہ رہ کے کیوں وہ تذکرہ
جس سے ہوتا ہی مرے جذبات میں محشر بپا
جس غمِ جانکاہ کو میں چاہتا تھا بھولنا۔
وہ تری ہمدردیوں نے پھر سے تازہ کر دیا
میرے حالِ زار کو بدتر بنا دیتا ہے تو
زخمِ دل پر اور اک چرکا لگا دیتا ہے تو

اپنے غم خواروں سے بھی اتنی ہی میری التجا
آپ کی ہمدردیوں کا شکریہ صد شکریہ
دل کے زخموں کیلئے مرہم کی زحمت کس لئے
یوں سمجھئے اب یہ سامانِ جراحت کس لئے
چاہتا ہوں میں کہ یہ صدمہ بہلانے دیجئے
مجھ پہ جو بیتی ہے اس کا ذکر جانے دیجئے

تنقید و تبصرہ

نیا ادب اور کلیم۔ لکھنؤ

انجمن "ترقی پسند مصنفین" کا ماہوار رسالہ
جو اکثر تماہی نکلتا ہے

اس وقت اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات دو بڑے گروہوں پر مشتمل ہیں پہلا گروہ اُن اصحاب کا ہے جو ادب میں نئے امکانات اور رجحانات کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور روش قدیم پر چلنا زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں شاید اس وجہ سے کہ ان کے پیشرو اس راہ کو ان کے لئے ہموار کر گئے ہیں۔

دوسرا گروہ اُن ادیبوں کا ہے جو اُردو ادب کی بقا اور ترقی کے لئے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ پُرانی ڈگر کو چھوڑ کر ادب میں نئے امکانات اور راستے نکالے جائیں اور مقتضائے وقت کے ماتحت نئے رجحانات کو جگہ دی کر زبان اور ادب میں وسعت پیدا کی جائے۔

ادب میں ترقی پسندی کی یہ تحریک جیسے جیسے مقبول ہو رہی ہے اور ترقی کر رہی ہے نئے اور پُرانے ادب کے علمبرداروں کے اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں اور یہ کشمکش ایک ناخوشگوار صورت اختیار کر رہی ہے۔

قدیم ادب کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اسے اب کلاسیکی حیثیت حاصل ہوگئی ہے ان ہی بنیادوں پر وہ شاندار عمارت کھڑی ہوگی جس کی داغ بیل نئے امکانات اور رجحانات نے ڈال دی ہے۔ اسی بنا پر قدیم ادب کی اہمیت سے انکار کرنا یا نئے رجحانات کی مخالفت کرنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ ان دونوں گروہوں کو چاہیئے کہ تعصبات سے

بلند ہوکر زبان وادب کی ترقی میں ایک دوسرے کے معاون ہوں۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ ادب کے مقاصد کے تصورات بھی بدلتے رہے ہیں۔ ابتدا میں ادب کو حسن کی تخلیق کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور ہیگل کے خیال کے مطابق حسن آفرینی ہی ادب کا سب سے بڑا اور اہم مقصد تھا۔ ادب برائے ادب کا تصور بھی حقیقت میں اسی تصور کی ایک دوسری شکل تھی جو شعرا ادیبوں اور نقادوں کی انتہا پسندی پر مبنی تھی والٹیر نے اس تصور پر سختی سے جرح کی ہے۔ طالسطائی (Tolstoy) کی رائے میں ادب کا سب سے اہم مقصد "نیکی" ہے۔ آجکل "ادب برائے زندگی" کا تصور زیادہ مقبول ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان کی زندگی اور اس کی کیفیات اس کے دل ودماغ کے نشو و پرداخت پر اپنا پورا پورا اثر ڈالتی ہیں۔ اور انھیں کیفیات و تاثرات کے تحت اس کے اپنے رجحانات اور نظریات متعین ہوتے ہیں۔ اگر شاعر یا ادیب اپنی کاوشوں اور کارناموں میں ایسی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور اپنے ماحول کی عکاسی نہ کرے تو وہ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کا پورا حق ادا نہیں کرتا۔

آرٹسٹ کو مطالعہ و مشاہدہ کی جو قوتیں فطرت کی طرف سے عطا کی جاتی ہیں وہ اپنی شدت میں عوام کی قوتوں سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ جن نزاکتوں اور باریکیوں تک ہماری نگاہ نہیں پہونچ سکتی آرٹسٹ انھیں محسوس کر لیتا ہے، اس لحاظ سے وہ فطرت کا امین ہے اور اسے چاہیئے کہ اس امانت سے عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائے۔ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور اپنے کانوں سے سننا چاہیئے اور انھیں باتوں کو موزوں و مناسب الفاظ کے ذریعہ ہمارے سامنے پیش کرے تاکہ ہم اپنی زندگی کے حسین اور قبیح پہلوؤں پر نظر رکھ کر اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وقت کے تقاضے کو محسوس کر کے آنے والے دور کے لئے اپنے آپ کو پورے طور پہ تیار کرلیں۔

زبان وادب میں ترقی اور وسعت کی ضرورت کا احساس کوئی نئی چیز نہیں ہے اب

سے ستر برس پیشتر سرسید علیہ الرحمتہ اور ان کے رفقا نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا تھا چنانچہ ادب کو "نیچرل" بنانے کی تحریک کی پشت پر یہی احساس کارفرما تھا سرسید علیہ الرحمتہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"زمانہ اور زمانہ کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہو گئے۔ ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرز بیان اور ان کے الفاظ مشتمل ہم کو . . . بات کی اصلیت تک پہونچانا ذرا بھی تسلیم نہیں کرتے، بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو نون مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلاف واقعہ الفاظ شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا . . . . یہ تمام باتیں حال کے زمانہ کی طبیعت کے مناسب نہیں۔" (تہذیب الاخلاق جلد (۳) صفحہ ۱۷۴)

اس سلسلے میں ہمیں "ترقی پسند" شعرا اور "نئے ادب" کے حامیوں سے بھی کچھ کہنا ہے۔ ترقی پسندوں کے بعض جرائد اور ان کے ادبی کارنامے دیکھ کر ہم نے محسوس کیا کہ نئے امکانات اور رجحانات کا تصور ان کے ذہن میں صاف نہیں ہے۔ انقلاب، آگ، شعلے مزدور کسان تلوار اور اسی قسم کے چند الفاظ ہیں جن کی تکرار سے ان کا ادب بھرا پڑا ہے۔ یہ الفاظ پرانے ادب میں بھی ملتے ہیں لیکن اس کثرت سے نہیں۔ صرف ان چند الفاظ کی بہتات ہی "نئے ادب" کو پرانے ادب سے متمائز کرتی ہے۔ انقلاب کا لفظ تو اس ادب کے ہر جملے میں ملتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقی روح کہیں نظر نہیں آتی۔ "پروپیگنڈا لٹریچر" کو نیا ادب سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ادب کو صرف انھیں موضوعات تک محدود سمجھا جاتا ہے گذشتہ تین چار برس میں ان موضوعات پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اب کسی اضافے کا امکان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک میں کچھ عرصے سے جمود پیدا ہو گیا ہے۔

ایک اور چیز جو ہمارے "ترقی پسند" شعرا اور ادیبوں کی خلاقیوں میں بہت نمایاں

ہے وہ ہر پرانی چیز سے جس میں مذہب اور اس کا نہایت اہم پہلو اخلاق بھی شامل ہے۔ بیزاری کا اظہار ہے۔ اپنے ردِ عمل کی شدت میں یہ حضرات شاید اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ مشرق میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً مذہب کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے اخلاق ہماری سیاست، ہماری تعلیم غرضیکہ ہماری ہر چیز کی بنیاد ہمارے مذہب پر ہے اور ہم کسی وقت بھی اپنے آپ کو اس سے علیحٰدہ نہیں کر سکتے۔

فکری اجتہاد اور علمی تحقیق کے فقدان کی وجہ سے ہماری ذہنی قوتیں مغربی مفکرین سے اس درجہ مغلوب و مرعوب ہو گئی ہیں۔ کہ ہم بلا سوچے سمجھے ان کے خیالات اور نظریات پر ایمان لے آئے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ "حق، صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شائستگی ایک کا معیار ہمارے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان" اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی، اپنے اخلاق و آداب، سب کو ہم اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے اسے درست سمجھتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں، فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اتر آئی اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔" (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ تنقیحات صفحہ ۶)

مغرب کی یہی اندھی تقلید جس نے آجکل "فیشن" کی صورت اختیار کر لی ہے، ہماری مذہب سے بیگانگی کی ذمہ دار ہے۔ مختصراً ہم یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرینگے کہ ممکن ہے مغرب کی بڑھی ہوئی مادّیت مذہب پر ان حملوں کو برداشت کر سکے۔ لیکن ہم ان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ نئے ادیبوں کا یہ رجحان انکی تحریک کو مسلمانوں میں مقبول نہیں ہونے دے گا۔ اور مسلمانوں سے اردو کی جو وابستگی ہے وہ ظاہر ہے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ تحریک کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔" (۱۰)

علی گڑھ میگزین

جلد ۱۹ | بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۲

طلبا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا علمی وادبی سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

علی گڑھ میگزین

جلد ۱۹	بابت ماہ مارچ ۱۹۴۲ء	نمبر ۲

شذرات

احسن نمبر کی اشاعت کے بعد ہمارا ارادہ تھا کہ میگزین کو پابندی کے ساتھ ہر سہ ماہی پر شائع کیا جائے اس وقت جنگ کے اثرات ہندوستان سے اتنے قریب نہ تھے جتنے اب ہوگئے۔ اخباروں اور رسالوں پر کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی کا جو اثر ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ چنانچہ ہم بھی باوجود انتہائی کوششوں کے اب سے پہلے آپ کے سامنے کوئی دوسرا نمبر پیش نہ کرسکے۔

یہ میگزین اس وقت ہمارے طلبہ کے ہاتھ میں پہنچے گا جب ان میں سے اکثر یونیورسٹی کے امتحان میں مصروف ہوں گے اور یہاں سے رخصت ہوکر زندگی کی آزمائش گاہ میں داخل ہونے والے ہوں گے۔ جہاں ہر ہر قدم پر امتحان ہی امتحان ہے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یقین محکم اور عمل پیہم کی جو تعلیم انہوں نے مادر درسگاہ میں حاصل کی ہے وہ ہر ہر قدم پر ان کی کامیابی کی ضامن ہوگی۔ ہمارے یہی نوجوان جو آج اپنی تعلیم کی تکمیل کرکے کالج کی چہار دیواری سے نکل رہے ہیں مستقبل کے لیڈر اور رہنما بنیں گے۔ یقین ہے کہ وہ جس قوم کے فرزند ہیں اور جس دارالعلوم نے انھیں تعلیم و تربیت دی ہے اس کے نام کو وہ ہمیشہ بلند رکھیں گے۔

رخصت ہوتے وقت ان سے ایک گذارش ہماری بھی ہے اور وہ زبان و ادب کے بارہ میں ہے۔ اردو زبان کے گیسو اب بھی "منت پذیر شانہ" ہیں اس میں خامیاں اور کمزوریاں ہیں اس کے مخالف زیادہ اور ہمدرد کم ہیں لیکن

اسے کیا کہئے کہ یہ ہماری اور آپ کی زبان ہے جو ہمارے بزرگوں نے بطور امانت ہمارے سپرد کی تھی اور جسے ہم آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جائیں گے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس کی بقا اور ترقی کے لئے ہر ممکن سعی سے کام لیں۔

اس مرتبہ حکومت ہند نے اپنے ایک کمیونک میں ہمارے ہردلعزیز وائس چانسلر جناب ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد صاحب کو اعزازی لفٹننٹ کرنل مقرر کرنے کا اعلان کیا جس پر ہم سب کو دلی مسرت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر قابل غور ہے کہ ہمارے اکثر طلباء جنہوں نے فوج میں کمیشن کے لئے درخواست کی تھی اس اعزاز کے لئے منتخب ہوئے اور ٹریننگ دینے والے مرکزوں سے جو اطلاعات آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہ نوجوان کارگزاری اور کارکردگی میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ ہم اس دن کے آرزومند ہیں جب ہمارے یہ دلیر بھائی فتح اور کامرانی کے جھنڈے لیکر واپس ہوں گے اور جس طرح ہم نے انھیں خیرباد کہا ہے اسی طرح پھر انہیں خوش آمدید کہیں گے۔

اسی سیشن میں ہمارے پرو وائس چانسلر صاحب پروفیسر اے۔ بی۔ اے۔ حلیم صاحب جن کی بالغ نظری تعلیمی معاملات میں مسلم ہے انٹر یونیورسٹی بورڈ کے چیرمین منتخب ہوئے۔ ہم ان دونوں بزرگوں کو ان کے اعزاز پر ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

گذشتہ سال کے اہم واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے بڑی سرگرمی اور عملی جدوجہد میں وقت گزارا۔ سب سے پہلے نومبر کی پہلی دوسری تیسری تاریخوں میں مسلم لیگ کی کانفرنس کے تاریخی اجلاس منعقد ہوئے۔ قائداعظم محمد علی جناح۔ آنریبل حسن شہید سہروردی وزیر مالیات صوبہ بنگال (صدر کانفرنس) نواب محمد اسمٰعیل خاں (صدر صوبہ لیگ) اور دیگر اکابر ملت کی شرکت نے اس تاریخی کانفرنس کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا۔ مسٹر جناح نے اسٹریچی ہال میں جو تقریر کی اس میں انہوں نے واضح طور پر بتایا کہ گذشتہ سال جب انہوں نے اسی پلیٹ فارم پر تقریر کی تھی جب سے اب تک کیا کیا واقعات رونما ہوئے۔ جن لوگوں نے قائداعظم کی یہ تقریر سنی وہ حد درجہ متاثر تھے۔ ہزاروں کا مجمع خاموش اور اپنے محبوب رہنما کی پُرمغز تقریر کے ایک ایک لفظ کو سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا۔

کانفرنس کے سلسلہ میں مسلمانوں کا یہ اہم اجتماع مدتوں یادگار رہے گا مہمانوں کو ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب کیمرن نے لنچ اور پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم کی جانب سے ایٹ ہوم دیا گیا۔ طلبار کی جانب سے بھی یونین میں ایٹ ہوم ہوا۔

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن گذشتہ کئی سال سے گرانقدر مذہبی خدمات انجام دے رہی ہے انجمن مذکور کے تحت اس سال بھی "اسلامی ہفتہ" منایا گیا جس میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی۔ مولانا سعید احمد صاحب ایڈیٹر برہان۔ مولانا عبدالقادر صاحب امرتسری۔ حافظ کفایت حسین صاحب مولوی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نواب بہادر یار جنگ صاحب اور دیگر علماء مقررین نے مقالے پڑھے اور تقریریں فرمائیں اس سلسلہ میں اسلامی مطبوعات کا ایک عمدہ ذخیرہ بھی فراہم ہو رہا ہے۔ انجمن کے اراکین خصوصاً نائب صدر ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی و معتمد اعزازی، امجد اللہ صاحب صدیقی کی خدمات قابل ستائش و مبارکباد ہیں۔

- اس سال دو اہم کانفرنسیں علی گڑھ میں منعقد ہوئیں ایک انڈین میتھمٹیکل کانفرنس اور دوسری انڈین فلاسفیکل کانگریس۔ ۲۰ دسمبر کو فلاسفیکل کانگریس کا سترہواں اجلاس پروفیسر جی۔ سی۔ چیٹرجی کی صدارت میں ہوا۔ پرو وائس چانسلر صاحب نے یونیورسٹی کی طرف سے کانفرنس کے نمایندوں کا استقبال کیا اور موقع کے مناسب ایک نہایت پُرمغز تقریر کی۔ پروفیسر چیٹرجی کا فاضلانہ خطبۂ صدارت خاص طور پر غور اور دلچسپی سے سُنا گیا کانفرنس میں ہندوستان کے دور دراز مقامات سے آکر نمایندوں نے شرکت کی۔

میتھمٹیکل کانفرنس کا بارھواں اجلاس ۲۷ دسمبر کو ڈاکٹر و دیا ناتھ سوانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پہلے پرو وائس چانسلر صاحب نے اس یونیورسٹی میں شعبۂ ریاضی کے شاندار ماضی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان مشاہیر کا ذکر کیا جو ریاضی کی دنیا میں بڑے نام آور ہوئے اور جن کی خدمات پر ہماری یونیورسٹی کا یہ شعبہ ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔ اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے اس علمی سرمایہ کا ذکر کیا جو انہوں نے مسائل ریاضی کے حل کرنے کے سلسلے میں جمع کیا تھا اور خاص طور پر عربوں اور ایرانیوں کی ریاضی کی خدمات پر زور دیا انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہمارے

موجودہ اسکولوں میں ریاضی کی تعلیم اور نصاب پر فوری توجہ اور مناسب ترمیم کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب نے کانفرنس کا افتتاح کیا اور منجملہ اور باتوں کے آپ نے ارشاد فرمایا کہ البیرونی کی مشہور کتاب قانون مسعودی ریاضی اور فلکیات کے مسائل پر ایک اہم کتاب ہے اور دنیا کے بعض مشاہیر ریاضی داں اصحاب کا فیصلہ ہے کہ البیرونی سے زیادہ ذہن اور طباع کوئی اور ریاضی داں نہیں گذرا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کی جائے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ قانون مسعودی ترجمہ کی طرف سر شاہ محمد سلیمان مرحوم نے توجہ کی تھی۔ چنانچہ یہ ترجمہ اب مکمل ہو چکا ہے امید ہے کہ اس کی اشاعت سے ریاضی اور فلکیات کے لٹریچر میں ایک گرانبہا اضافہ ہوگا۔ کانفرنس میں بہت سے مفید مقالے اور لکچر بھی ہوئے۔

ٹریننگ کالج نے اپنے قیام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ "تعلیمی ہفتہ" منایا اس سلسلہ میں ایک دلچسپ پروگرام مرتب کیا گیا تھا جو نئے اور پرانے طریق تعلیم کے تجربے۔ تقریروں۔ مقالوں۔ تعلیمی نمائش۔ تعلیمی ورزشوں تعلیمی تفریحات ڈراما اور تعلیمی مشاعرہ پر مشتمل تھا۔ باوجود مالی مشکلات کے ہفتہ کامیاب رہا جسکے لئے پرنسپل وحید الحق صاحب صدیقی ممبران اسٹاف وطلباء ٹریننگ کالج قابل مبارکباد ہیں۔

یونیورسٹی کے حلقہ میں ایک باقاعدہ میونسپل کمیٹی کے قیام سے اس سال ایک ایسی ضرورت پوری ہوگئی جو عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ کمیٹی میں علاوہ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اور بعض اساتذہ کے طلباء کے نمائندے بھی شریک ہیں۔ مختلف سب کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جو اپنی اپنی ذمہ داریوں کو یونیورسٹی کے میونسپل حلقہ میں انجام دینگی۔ امید ہے کہ اس سے طلباء میں اچھے شہری بننے اور انتظام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

عرصہ سے ایک مستقل زنانہ ڈگری کالج کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی تاکہ ڈگری کلاسوں کے انتظام اور پڑھائی میں جو دقتیں پیش آتی تھیں دور ہو سکیں چنانچہ مسلم یونیورسٹی امنڈمنٹ ایکٹ کے بموجب یونیورسٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سال سے بی۔ اے اور انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لینے والی طالبات کے لئے علیحدہ ڈگری کالج قائم کیا جائے۔

یونین:-

علی گڑھ کی تعلیمی زندگی کی تعمیر میں ہمیشہ سے یونین کا بہت بڑا حصّہ رہا ہے۔ درسگاہ کے اکثر نامور فرز
یونین ہی کی آغوش میں پروان چڑھے ہیں! اِس وقت یونین کی گذشتہ زریں تاریخ دُہرانے کی ضرور
نہیں ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ میں یونین کا اتنا زبردست اور مفید ادارہ ہے جو ہمیں صحیح
بہم پہنچانے اور کامیاب انسان بنانے میں کافی مدد دے سکتا ہے! در ضرورت ہے کہ اُس سے صحیح کام
جائے۔ اِس سیشن میں بھی حسبِ دستور دسمبر میں یونیورسٹی کی فضا میں یونین کے الیکشن نے حرکت
پیدا کر دی۔ نئے کابینہ کی قیادت کا سہرا ہمارے دوست شاکر حسین خان صاحب بی۔ اے علیگ کے سر
مشتاق حسین خاں صاحب سکریٹری۔ اور ہاشم آزاد صاحب لائبریرین منتخب ہوئے۔ ہم سب کامیا
حضرات کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہوئے متوقع ہیں کہ یونین اُن کے دور میں دن دونی رات
ترقی کرے گی۔ اور اِس کی بدولت طلبہ میں تقریر کا ذوق روز افزوں ہوگا۔ کیونکہ آج کل تقریر ہی کامیا
کی بہت بڑی ضمانت ہے۔

نئے سال سے قدرۃً بہت سی دل خوش کن توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ لیکن ہمیں نہایت افسو
ہے کہ ہماری جامعہ کو اِس سال کی ابتدا میں دو بڑے حادثوں سے دوچار ہونا پڑا شیخ علی جواد صاحب
بی۔اے بی ٹی ایچ ٹیچر مسلم یونیورسٹی اسکول کی ناگہانی موت ایسا زبردست سانحہ ہے جسے بھلایا نہیں ج
مرحوم اِس درسگاہ کے اولڈ بوائے۔ یونین کے سابق سکریٹری۔ اور قومی و مذہبی تحریکات کے دلدادہ
سب سے بڑی بات اُن میں یہ تھی کہ عالم باعمل تھے اور جزئیات میں بھی پابندی کے ساتھ متبع شریعت۔
حق سبحانہ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔

دوسرا سانحہ عظیم ڈاکٹر اے۔ ایچ منصور ایم اے پی ایچ ڈی لکچرار شعبۂ عربی کی وفات حسرت آ
کی شکل میں رونما ہوا۔ مرحوم حد درجہ ہر دلعزیز خلیق ہمدرد اور قابل ہستیوں میں سے تھے۔ یونیورسٹی

بے لوث اور مخلصانہ خدمات کے علاوہ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن کریم کا جرمن زبان میں ترجمہ تھا جس سے اُن کے جذبۂ دینی و علمی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اللہ جل شانہ اُن کی مغفرت فرمائے اور ان کے احباب و اعزہ کو توفیق صبر دے۔

علی گڑھ کے بہی خواہوں اور ہمدردوں میں یہ خبر بھی نہایت افسوس سے سنی جائے گی کہ یونیورسٹی کورٹ کے معزز رکن۔ علی گڑھ تحریک کے زبردست حامی اور شہر کے معزز رئیس جناب عابد علی خان صاحب شروانی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ہم سوائے صبر اور دعائے خیر کے کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اللّٰھم اغفرلہٗ

کتابی جراثیم

جناب عبدالغفور صاحب ایم۔اے لکچرر ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انتساب۔ ایک دفعہ لائبریری میں ایک سستے قسم کا گھٹیا ناول نظر پڑا جن کے لئے بہترین جگہ لائبریری کی بجائے ایک ریلوے بک سٹال ہوتی ہے۔ کتاب کا نام "یک چشم بدمعاش" تھا۔ اور سرورق پر مصنف کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ کسی پڑھنے والے نے اس تصویر کی ایک آنکھ نکال ڈالی تھی۔ میں اس مضمون کو اسی "دوچشمے" بدمعاش کے نام معنون کرتا ہوں۔

اپنا نام زندہ رکھنے کی خواہش تو ہر انسان میں ہوتی ہے! اور ابدالآباد سے چلی آئی ہے۔ ایک فرعون اپنی فرعونیت کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اہرام بناتا ہے ایک چینی حکمران اپنے مقبرے کے راستے کو دورویہ ہاتھیوں اور اونٹوں کے سنگین مجسموں سے آراستہ کرتا ہے۔ اس لامحدود جذبے کا مظاہرہ مختلف حالات میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ مغلیہ زمانے کے جاہ و جلال کے دور میں تاج محل بنتا ہے اور زوال کے زمانے میں صفدر جنگ ایک اپنی علو ہمتی سے دنیا بھر کے وسائل اس کے سامان کی فراہمی میں لگا دیتا ہے! اور دوسرا خانخاناں کے مقبرے سے سنگ مرمر اکھڑوا کر اپنی لحد کی زینت کر لیتا ہے۔

اس زمانے میں حکومت اپنی تھی! اس کے لامحدود وسائل بھی اپنے تھے۔ کسی نے اپنی شان میں قصیدے لکھوا لئے۔ کسی نے ہجویں لکھا لیں۔ بہرحال کسی نہ کسی ڈھنگ سے اپنا نام بے رحم زمانے کے ہاتھوں مٹنے سے بچا لیا۔ لیکن جب حکومت گئی اور غلامی آئی تو اس طبعی خواہش کے اظہار کے یہ بلیغ اور بولتے چالتے وسائل نہ رہے۔ اس جذبے کو کہیں باہر نکلنے کو جگہ نہ رہی تو ذہن میں یوں منڈلانے لگا جیسے کسی خالی گھر میں کوئی بھوت بند کر دیا گیا ہو۔ جوں جوں غلامی کی وجہ سے ذہن چھوٹے ہوتے چلے گئے یہ جذبہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ یوں معلوم ہونے لگا جیسے کسی چھوٹی ہانڈی میں پوری دیگ کا جوش بند کر دیا گیا ہو۔

مگر اللہ میاں کی دین کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ وہ اگر اپنے عاجز بندوں پر ایک در بند کر دیتا ہے تو سو در کھول بھی دیتا ہے۔ ہمارے آباواجداد کو تو اپنا نام زندہ رکھنے کے لئے سنگ مرمر کی تختیوں پر

خدا جانے کس قدر محنت کتنا روپیہ صرف کرنا پڑا ہو گا۔ مگر ہم بغیر کسی وقت کے ایک ہی جست میں اس وسیع خلیج کو پار کر گئے جو عارضی اور ابدی زندگی میں حائل ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں کتب خانوں اور ان کے موجد کے قربان جانا چاہیئے۔ جن کے طفیل ہم سلوک کی کئی منزلیں باتوں باتوں میں طے کر گئے۔

سنتے ہیں کہ کارلائل نے ایک دفعہ کہا تھا کہ لائبریری بذاتہٖ ایک یونیورسٹی ہے یہ چیز ایک شاہکار قسم کا تعریفی جملہ ہے جو کبھی کبھی الہامی صورت میں کسی نہ کسی کے منہ سے نکل جاتا ہے۔ مگر کالج کے نوجوان طالب علم کا ذہن ضرور اس چیلسی (Chelsea) کے بڈھے کھوسٹ سے سرپٹ کوسوں آگے چل نکلا ہے اور کیوں نہ ہو آخر نوجوان دماغ ہی تو ہے اس میں علمی پھلجھڑیاں پھوٹتی ہیں اور اکثر بے سبب بھی چھوٹ جاتے ہیں ہمارے نوجوان کے خیال میں کتب خانہ بذاتہٖ محض ایک یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ اس میں اس ابدیت کا راز پوشیدہ ہے جو کائنات یعنی لفظ (Universe) کے معنوں میں پائی جاتی ہے۔ اور اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ کتب خانہ محض خود ابدی نہیں بلکہ ابدیت بخش بھی ہے۔ اس کی کتابوں اور ورقوں کے طفیل ہزاروں لاکھوں حشرات الارض کی طرح ختم ہو جانے والے انسانوں کے نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جریدہ عالم پر نہیں تو کم از کم جریدۂ کتب خانہ پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر کتاب اور بالخصوص کتب خانے کی کتاب کے کسی گوشے کسی کونے پر اپنا نام اور اگر ہو سکے تو پتہ اور تاریخ بھی چڑھا دیں۔ اور ہر صاحب مذاق انسان جانتا ہے کہ ایک کتبے کے لئے یہ سب تفصیل بے حد ضروری ہے۔ یہ کتبہ کیا ہے؟ ایک دوامی نشان آیندہ آنے والی نسلیں اس کا نام پڑھیں گی اور فخر سے کہ اٹھیں گی کہ "دریں گرد سوارے باشد" ابھی گذرا ہے یاں سے قافلہ اک شہ سواروں کا' فرق اتنا ہے کہ پرانے شہ سوار تو گرد کا ایک طوفان پیچھے چھوڑتے جاتے تھے مگر ہمارا نوجوان کتب خانے کی کتاب پڑھنے کے سلسلے میں جنگی (میونسپل کمیٹی) کی کوڑا گاڑی کی طرح کچھ اس قسم کے ناقابل انکار ثبوت پیچھے چھوڑتا جاتا ہے جس سے نہ تو آنکھ انکار کر سکتی ہے اور نہ ناک۔

آپ نے کبھی یہ بھی غور فرمایا کہ ان دستخطوں کا کیا مقصد ہوتا ہے بات یہ ہے کہ ہمارے نوجوان کو اس کتاب چھوڑنے کا اتنا قلق ہوتا ہے (اور اکثر یہ دستخط کتاب کے خاتمہ پر ہی کئے جاتے ہیں) کہ وہ

اس الوداعی اور جانکاہی موقعہ پر ایک آخری سلام کہے اور ایک الوداعی آنسو گرائے بغیر رہ نہیں سکتا۔
یہ کتبہ ایک آخری سلام ہے اس کتاب کو اور اس کتاب کے خیالات کو!!

اس معاملے میں ہمارے طلبا کی ذہنیت کچھ کچھ خلیفہ عبدالملک سے ملتی جلتی ہے کہتے ہیں کہ جب ان کے پاس ایک تیز رفتار قاصد خلافت کی خوش خبری لے کر پہنچا ہے تو وہ مدینہ منورہ کی مسجد میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ پیغام سن کر انہوں نے اطمینان کی ایک آہ بھری اور قرآن حکیم کو یہ کہ کر بند کر دیا ہذا فراق بینی و بینکم (آج سے تم میں اور مجھ میں جدائی ہے)، سچ جانئے اگر وہ کتاب قرآن نہ ہوتی تو وہ بھی ہمارے نوجوانوں کی طرح ایک کتبہ اپنے نام کا حاشیہ پر چڑھا دیتے۔ جب آپ ایک پیاری کتاب سے، اس کے پیارے خیالات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہیں اور آپ کو یقین ہے کہ دوبارہ بھول کر بھی اسکی صورت دیکھ نہ پائیں گے اور نہ ہی شاید یاد رکھ سکیں گے۔ تو اس پر اپنا نام لکھنے میں کیا ہرج ہے۔

ان کراماً کاتبین کی ایک سے زیادہ قسمیں ہیں ایک تو وہ جو محض نام تاریخ وغیرہ پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ان سے بڑھکر ایک دوسری قسم ہے جو دستخطوں کے ساتھ ساتھ اپنی رائے۔ تعریفی یا تنقیدی سے بھی مصنف کو سرفراز کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ الوداعی جلسوں کے آداب سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ آخری الوداع کا خاتمہ ایک الوداعی تقریر پر ہونا چاہیئے۔ ان کے جملے اکثر بڑے پُر مغز ہوتے ہیں" افسانے اچھے ہیں مگر کوئی خاص بات نہیں۔ اس کے پڑھنے میں وقت ضائع نہ کریں"۔ ان زریں الفاظ میں کبھی تو وہ مصنف کو (Patronise) کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی کبھی (یہ بات زیادہ خطرناک ہے) آیندہ پڑھنے والے کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے بعد ایک تیسری قسم آتی ہے۔ ان لوگوں کا دوسرے اصحاب کے مقابلے میں وہی رتبہ ہے جو ایک تخلیقی مصنف کے سامنے ایک ناقد کا یا ایک بنیادی تشکیل کرنے والے مہندس کے سامنے ایک معمار کا ہوتا ہے۔ اس قسم میں سب سے پہلے ایک صاحب مصرع طرح دے جاتے ہیں اور دوسرے صاحب اس کے لئے موزوں قسم کا دوسرا مصرع تلاش کرتے ہیں۔ اس کے بعد آیندہ پڑھنے والوں کی جانب سے باقاعدہ مشاعرہ شروع ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے کسی صاحب نے ناپسندیدہ قسم کی تنقید کی

تو دوسرے نے بہت صاف اور غیر مبہم الفاظ میں لکھ دیا۔ "آپ گدھے ہیں"۔ اب اگر تیسرے صاحب نے ان سے پھر اختلاف کیا تو وہ لکھیں گے "کہ آپ گدھے کی دم ہیں"۔ اور یہ صرف اس رعایت سے کہ گدھے کی دُم گدھے کے بعد آتی ہے۔ اب چوتھے کی رگِ ظرافت کو جھرجھری جو آئی تو انہوں نے لکھا کہ آپ "دم میں نمدہ" ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ صفحہ کا آخر پہنچ جاتا ہے نہیں تو یہ لوگ اس مشاعرہ کو شمع کے مدھم ہونے پر بھی ختم کرنے کو تیار نہیں بلکہ اگلے صفحے پر صبح سے ہی نشست کا سامان کر دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

ان عام رایوں کے علاوہ بعض لکھنے والے اچھے خاصے نبض شناس کتابی طبیب ہوتے ہیں اور وہ پڑھنے والوں کو اپنے ذاتی تجربات سے فیض یاب کرنا چاہتے ہیں" اس کتاب کو سنبھل کے پڑھئے، ورنہ رات کو برے برے خواب نظر آئیں گے"۔ "اس ناول کو پڑھنے کے بعد کبھی کبھی سر پر برف رکھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے"۔ "اس کتاب کو ٹہل ٹہل کر پڑھنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ نسخہ احتیاطاً آرام کرسی پر بیٹھ کر استعمال کرنا چاہئے، اور اگر سردیوں کے موسم میں پلنگ پر لیٹ کر کیا جائے تو اکسیر ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس وقت آپ کے پاؤں گرم ہوں اور سر ٹھنڈا۔ اگر پاؤں ٹھنڈے اور سر گرم ہوا تو یقیناً الٹا پڑ جائیگا"

کبھی کبھی بعض اصحاب مصنف کے نام کو یا کتاب کے دیباچہ کو ہی اس کے تعارف کے لئے کافی نہیں سمجھتے۔ بلکہ شروع شروع میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے چند اقتباسات پڑھنے سے پہلی مرتبہ سمجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ہمارے بیشتر تعارف لکھنے والے کس قدر جاہل اور انجان ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے غلط اور بیہودہ قسم کے تعارف کو پڑھ کر ہمارے نوجوانوں کا آبگینۂ دل مارے رنج کے یوں پگھل جاتا ہے جیسے گرمیوں کی بارش میں اُولے۔ اور وہ چند تعارفی یا تحسینی جملے جو وہ مصنف کی شان میں لکھ جاتا ہے۔ انکا اصلی محرک یہی جذبہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے ٹیگور کا تعارف اس طرز میں کیا ہے "ٹیگور اکیلے ہی ہاؤس آف نوبل کے لارڈ ہیں" اور اُسکے بعد انہوں نے احتیاطاً ٹیگور کا پتہ ذرا تفصیل کے ساتھ ان حروف میں لکھ دیا ہے۔

"کلکتہ۔ انڈیا۔ ایشیا۔ دنیا"۔ اور اس کے بعد کچھ اس قسم سے قلم چلایا گیا ہے۔ جیسے گم نام خط لکھنے والے

دستخط کرتے ہیں۔ شاید اس سے کائنات مراد ہے۔ اس پتہ لکھنے میں بھی ایک راز ہے۔ یہ اشارہ ہے ہماری کائنات پر بسنے والوں کے لئے تاکہ وہ ٹیگور کو ایک خط لکھیں کہ لارڈ سنہا کے بیٹے کی طرح بابت پانے ایک سیٹ ہاؤس آف لارڈز میں دعوے کر دیں۔

خیر یہ لوگ تو اس قسم کے اونچے لوگوں میں ہیں جو اپنی ذات گرامی اور خیالات کو پریس اور پلیٹ فارم پر اُچھالتے ہیں اور اچھالنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اصحاب زیر لب بڑبڑاتے ہیں۔ دیوار ہم گوش دارد جیسے محتاط اصول پر ایمان لاتے ہیں۔ اِن کا دائرۂ عمل کتاب کا متن ہوتا ہے اور ان کی تصحیحی کارروائیاں ہمیشہ کسی نہ کسی خاص نقطۂ نگاہ سے ہوتی ہیں۔ اور اس میں زیادہ مقبول اور عام سیاسی نقطۂ نگاہ ہوتی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک دفعہ کسی کاتب کو قرآن حکیم نقل کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے ہر جگہ جہاں جہاں شیطان الرجیم کا نام آیا ہے اپنے ابا انعام الرحیم کا نام لکھا دیا تھا۔ اس ترکیب سے اُنہوں نے انجان طور پر ایک پتھر سے دو پرند شکار کرلئے تھے۔ وزن کا وزن رہ گیا اور ایک آسمانی کتاب کی پاکیزگی پر حرف نہ آنے پایا۔ کچھ اسی قسم کی غلط فہمی ہمارے ایک نوجوان پڑھنے والے کو ہوگئی تھی۔ وہ بیچارے آینڈرسن کا ایک مشہور افسانہ "بھدی بطخ" پڑھ رہے تھے۔ یہ بطخ انڈے سہہ رہی تھی اور ایک تجربہ کار بڈھے بطخے کی رائے میں ان انڈوں میں سے ایک انڈا ٹرکی (ایک مرغ کا نام) کا بھی تھا۔ ہمارے نوجوان نے جب ٹرکی کا انڈا پڑھا تو معاً ان کی نگاہ کے سامنے ملک ٹرکی کی مظلومیت پھر گئی۔ ان کی رگِ عصبیت اس ذلیل اور مکروہ پروپگنڈا کے خلاف بھڑک اُٹھی۔ جو انگریزوں کی جانب سے ترکوں کے خلاف سالہا سال سے جاری ہے۔ ان کے خیال میں یہ مصنف بھی انگریزوں کے جاسوسی محکمے کا چھیڑا تھا۔ جو اس طریقہ سے ٹرکی پر کیچڑ اُچھال رہا تھا۔ ان کے ذہن میں اس وقت "نئی تہذیب کے گندے انڈے" "ارے مرغی کے" "وغیرہ کی (*Associations*) گھوم رہے تھے اور ترکی کا انڈا! آہ یہ ہتک تو ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اگر اس وقت کوئی انگریز سامنے ہوتا تو ضرور دو دو ہاتھ ہو جاتے۔ یہ ممکن نہ ہوا تو انہوں نے میدان قرطاس پر۔ مصنف سے ہی دو دو ہاتھ کرلئے سب سے پہلے اُنہوں نے ٹرکی کو کاٹ کر "انگلش" لکھ دیا۔ اور اب یہ جملہ بڈھے بطخے کی زبان سے یوں ادا ہونے لگا۔

"بھی اس میں شبہ ہی کیا ہے کہ یہ انگریز کا انڈا ہے" اور جب اس پر بھی ان کے غصّے کا ابال ٹھنڈا نہ پڑا۔ تو انہوں نے پورے جلال میں ایک ترچھی تیر نما لکیر لفظ ٹرکی سے عین صفحے کے نیچے تک کھینچ دی۔ اپنی جان میں تو یہ ایک تیر تھا جو وہ مصنف کی پسلی میں سے گزار دینا چاہتے تھے۔ صفحے کے پچھلے حصّے میں یہ عبارت درج کی گئی "معلوم ہوتا ہے یہ مصنف ٹرکی کا مذاق ہی نہیں اُڑانا چاہتا بلکہ (Insult) بھی کرنا چاہتا ہے۔"

واضح رہے کہ کالج کے طالب علم کی زبان میں (Insult) کا ترجمہ (Insult) ہے ہتک نہیں۔ آپ (Insult) کو ایک دفعہ ہمارے نوجوان کے انداز میں ادا کرکے تو دیکھیے مجسم آواز کی ایک بچھو ندر ہے۔ جو زن سے تالو سے اُٹھی تو دماغ تک چڑھ گئی اور سارے جسم کو کپکپانے لگی۔

اس پر بھی صبر نہیں آیا تو صفحے کے اوپر کے حصے پر مزید حاشیہ آرائی کی گئی۔ "یہ مصنف اپنی (Sect) (اس کے ہجے a سے کیے گئے) اور اپنے مذہب پر بڑا مغرور ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اسے ٹرکش نوجوان کے غرور (اس کے لئے اُنھوں نے انگریزی لفظ (Proudness) استعمال کیا ہے) کا پتہ نہیں۔ ٹرکش (یہ لفظ ٹرک کے لئے لکھا گیا ہے) انگریز سے زیادہ مغرور ہوتا ہے۔"

(Proudness) کا لفظ انگریزی لغت میں ایک قیمتی اضافہ ہے (Pride) میں وہ پھولے ہوئے مینڈک کا انتفاخ سے تنا ہوا پھیلاؤ نہیں جو (Proudness) میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی رعایت سے ژرف بین ناقد نے اس کا استعمال کیا ہے۔

اور اس کے بعد اُنہوں نے جو کتاب چھانی ہے تو قرآن حکیم کے اُس کاتب کی طرح جہاں جہاں ٹرکش کا لفظ آیا اُنہوں نے انگلش بنا دیا۔ حتےٰ کہ ایک جگہ "ٹرکش فرشتہ" کا لفظ ایک نہایت خوبصورت نوجوان کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اسے بھی انگلش فرشتہ بنا دیا گیا۔ قابل قدر ہیں وہ صمیم العزم ہستیاں جن کی برکت سے گیلی پولی جیسے خونریز معرکوں کی رنگینی کتابوں کے صفحوں میں ہی جھلک جاتی ہے۔ لیکن اس جہاد میں ایک کمی ضرور رہ گئی تھی۔ یہ مصنف انگریز نہ تھا ڈین تھا۔

آپ کہیں گے کہ ان غریب مصنفوں نے کیا قصور کیا ہے جو نئی تعلیم نے ان پر اتنے تنکاری للکارے دیے

ہیں۔ ایک طرف تو ان کی گردنیں اخباروں میں تنقید اور ریویو کرنے والے جھنجوڑتے ہیں وہ تو خیر تربیت یا
سید سے سدھائے تازی ہوتے ہیں اور ان کو شکار کے آداب بھی آتے ہیں۔ گردن شوق سے جھنجھ
نگڑی ضرور لیجئے مگر کوئی ڈھنگ کوئی طریقہ بھی تو ہونا چاہئے۔ اور ریویو کرنے والے تو پھر بھی ایک دو
ہیں۔ کتب خانوں کے پڑھنے والے تو کوڑیوں اور درجنوں کی تعداد میں بلّا بولتے ہیں۔ گلیوں کے آوا
کتوں کی طرح جو بغیر کسی صاحب سلامت، بغیر کسی پرانے تعارف۔ بغیر کسی سلیقہ اور شعار راہ چلتے چلتے فرا
کرتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟۔ اصل بات یہ ہے کہ شعرا اور مصنفین سب کے سب ازل سے ہی ر
درگاہ ہیں۔ اسی لئے تو قرآن کریم میں شعراء کو بہکانے اور گمراہ کرنے والے بتایا گیا ہے۔ اور چونکہ اس ز
میں مصنفین پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اور باوجود اس ابدی لعنت کے انہوں نے پیدا ہونے کی جرأت
اس لئے یہ تو دوہرے عذاب کے مستحق ہیں۔ بعض لوگ شعرا کو تلامیذ الرحمٰن بتاتے ہیں مگر چند محققین جنھ
عہد عتیق کی خوب چھان بین کی ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شعرا اور شیطان اکھٹے بیٹھ کر کسی آسمانی مکتب
سبق پڑھا کرتے تھے اور شاید اکھٹے ہی وہاں سے نکالے بھی گئے ہیں۔ خیر معاملہ کچھ بھی ہو مصنفین مواخ
بچ نہیں سکے۔ اسی لئے تو دانتے نے بھی دوزخ کے پہلے ہی چکر میں ہومر رزمیہ شاعری کے جد امجد اور
مشہور لاطینی طنز نویس کو دکھایا ہے۔

اچھے مصنفین تو شاید اس ابدی عذاب سے کسی بہانے بچ بھی جائیں۔ مگر برے مصنفین تو
بچ نہیں سکتے۔ وہاں سے بچیں نہ بچیں۔ مگر اس دنیا میں نہیں بچ سکتے۔ ان کے لئے اس دنیا میں ہی د
کے فرشتے۔ عذاب کے ٹھیکیدار موجود ہیں۔ اور وہ ہمارے طلبار ہیں۔ جو ان کی تصانیف پر وہ وہ ز
چیزیں لکھ جاتے ہیں۔ کہ مصنف کی روح لحد میں بھی ایک دفعہ بل کھا جاتی ہو گی۔ اللہ میاں کی عنای
اچھے مصنف ان سے اب تک محفوظ ہیں۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ خود اللہ میاں اچھے مصنف
ہمارے نوجوان طلبار اچھے مصنفوں کی کتابیں کبھی کھول کر بھی نہیں دیکھتے۔

حاشیہ پر لکھنے میں ان لوگوں کا کچھ قصور بھی نہیں، حاشیہ لکھنے کا رواج ہمارے ملک میں ای
سے چلا آرہا ہے۔ ہمارے بزرگ قدیم نسخوں پر اتنی محنت سے حاشیہ آرائی کرتے تھے۔ کہ کاغذ پر ایک لکھ

برابر جگہ بھی خالی نہ رہ جاتی تھی۔ اکثر اوقات کتاب کا حاشیہ متن سے زیادہ مشہور ہو جاتا تھا۔ اور آجکل کے ناشرین حاشیہ کی جگہ خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمارے پڑھنے والے۔ ہمارے پرانی روایتوں کے حامل۔ ہماری ادبی اور کلچرل وراثت کے محافظ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ کہ ان کے اجداد کی ایک اتنی اچھی رسم صفحہ کاغذ سے یوں مٹادی جائے۔ دوسرے آجکل کا طالب علم سائنس کے اصولوں کا معتقد جانتا ہے۔ کہ فطرت کو خلا سے دلی نفرت ہے۔ اسی لئے وہ صفحہ کتاب پر کوئی خلا نہیں دیکھ سکتا۔

ہمارے پڑھنے والوں کے ذہن میں بھی اس قسم کی ادبی روایات ایسی چھپی رہتی ہیں۔ جیسے کسی اندھیری کوٹھری میں کسی مکڑی نے جالا تنا ہوا، سو کبھی کبھی خیال کی مکھی بھنبھنا کر ایک انداز میں جو اڑان لیتی ہے۔ تو اس جالے میں بھنبھنا کر رہ جاتی ہے۔ ادھر تو ہمارے طلبا کے کانوں میں یہ روایتی زنزناہٹ گونج رہی تھی۔ اس پر ناشرین نے یہ ستم ظریفی کی۔ کہ حاشیہ کے حاشیہ خالی چھوڑنے شروع کر دیئے۔ اس حاشیہ سے ہمارے نوجوانوں نے پورا استفادہ حاصل کیا۔

خیر مغربی مصنف تو ان لوگوں کی لیاقت کی زد سے اکثر باہر رہتے ہیں۔ مصیبت تو اردو زبان میں لکھنے والوں کی ہوتی ہے۔ ان کی زبان اور خیالات دونوں کا بچ نکلنا آسان نہیں۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے۔ اچھے اور برے مصنفین سبھی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ اور ایک ہی قلم سے سب پر نشتر چلایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت ہو نہ ہو۔ مگر جہاں تک ہمارے نوجوان پڑھنے والوں کا تعلق ہے۔ سبھی مصنفین برابر کے برتاؤ کے حق دار ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے اپنے معرکۃ الآرا مضمون "بعض پرانے الفاظ کی نئی تحقیق" میں بعض ان عربی فارسی اور سنسکرت الفاظ پر بحث کی ہے۔ جو اپنی اصل سے ہٹ کر کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں کہ عربی، فارسی اور سنسکرت نسل کے ان ہندوستانی بچوں کی تعداد بیشمار تھی؛ کسی صاحب نے بچوں پر نشان استفہامیہ لگا کر یہ دریافت کرنے کی جسارت کی ہے۔ کہ یہ بچے حرامی ہیں یا حلالی، کیونکہ بقول مولانا اپنی اصل سے بہت ہٹ گئے ہیں۔ ہمارے مزاحیہ نویس اکثر گھریلو ڈرامے میں بیگم صاحبہ کو اچھالتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب اس پر لکھتے ہیں "مصنف نے بار بار اپنی تعریف اور ننھے کی ماں کا فضول اور بے جا اور کثرت سے استعمال کیا ہے" ایک افسانہ نویس نے بہری ہوئی عورت کے متعلق لکھا ہے۔ کہ وہ

بگڑے ہوئے بچار سے بدتر ہوتی ہے' ان کے ایک مداح نے لقمہ دیا کہ کیا سابقہ پڑا ہے کہیں کہیں ز
کی اصلاح بھی فرمادی ہے۔ مثلاً پریم چند کی زادراہ میں ایک جگہ آیا ہے۔ گوبر کی عورت کام چور تھی اور کھا
میں حاتم" اس پر ایک پڑھنے والے نے جو شاید لکھنے کے حاتم تھے۔ یا بوئے قلم پر یوں دولتی جھاڑی" بیہ
جاہل کو یہ معلوم نہیں۔ کہ حاتم کھانے کے لئے مشہور ہے یا کھلانے کے لئے" اس پر دوسرے صاحب نے پ
تو چند غیر ادبی کلمات ان کی شان میں لکھے۔ اور پھر یہ ستزاد فی البدیہہ ارشاد فرمائی" یہ اردو کا محاورہ
اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ جتنا وہ دل کھول کر کھلاتا تھا۔ اتنا ہی وہ جی کھول کر کھاتی تھی"

کبھی کبھی آپ ایک ناول میں (Climax) کے خطرناک طور پر قریب پہونچ جاتے ہیں
پلاٹ کی جذباتی کیفیت ایک بارود سے بھری ہوئی فضا کی طرح تنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہیرو اور ہیر
رومانی زندگی کی پرکیف اور رنگین فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ افسانہ ایک المیہ ہے اور المیہ بھی د
عظیم الشان المیہ۔ ہیروئن کی زندگی ایک تنگ وتاریک رات ہو کے رہ گئی ہے۔ اب اس کے لئے سوا
اس کے اور کوئی چارہ نہیں۔ کہ ایک جان توڑ جست میں زندگی کی الجھنوں سے چھوٹ کر ہیرو کے دامن
سمٹ کر جا پڑے۔ جو آسمانی بہشت میں آغوش تمنا کو وا کئے ہمہ تن چشم انتظار بنا کھڑا ہے۔ آپ ایک لمحہ
لئے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ آپ کی زندگی بھی اس غم کے دھارے میں ہچکولے کھاتی ہوئی نظر آتی ہے
لیکن دفعتہً آپ کی نگاہ حاشیہ پر پڑ جاتی ہے۔ کیلے دو درجن! سنگترے ڈیڑھ سیر!! گلاب جامن آ
پاؤ!!! ایک جھٹکے میں آپ اس خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں! ور ایک کیلوں سنگتروں والی دنیا "
دوبارہ آجاتے ہیں۔ آپ کو دنیا کی ان رس بھری سچائیوں کے ذریعہ ہوش میں لانے والا کونسا طبیب
اس کتاب کی دنیا میں آپ کا کوئی پیشرو جس نے اپنی دعوت چائے کا حساب حاشیہ پر لکھ لیا تھا۔ آپ
اس رومانی اور تخیلی دنیا سے نکال لانا ایک اہم فرض تھا۔ کتابی فلموں میں تو یہ کام پیشرو انجام د
ہیں۔ اور سینما گھروں میں وہ کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے جو فلم ختم ہوتے ہی (Interval) میں
بیڑی سگرٹ کی آوازیں لگاتے ہیں۔

ہمارے نوجوان کا پیدائشی حق آزادی ہے اور آزادی کا پہلا عنصر غیر ذمہ داری ہے! اور دو

قوتِ اظہار اور وہ بھی بے اختیاری۔ وہ اسی لاابالی انداز میں ریل کی کھڑکی سے خالی بوتل پھینک دیتا ہے جس خالی الذہن طریق سے وہ حاشیہ پر اشارات لکھ دیتا ہے۔ اگر بوتل کسی سڑک پر کام کرنے والے مزدور کو زخمی کر دے تو ان کی بلا سے اور اگر کتاب کا حاشیہ کسی کی طبع سلیم پر گراں گزرے تو ان کی بلا سے۔ ان کے علاوہ بعض اصحاب اپنا پتہ۔ کرایہ ریل۔ گاڑیوں کے اوقات۔ کالج اکاؤنٹ کا حساب بموقعہ اور بالخصوص بے موقعہ یاد آئے ہوئے اشعار سینما سٹارز کے نام۔ کتاب کے صفحوں کی یادداشت وغیرہ بھی اکثر انہیں کتابوں پر محفوظ کر لیتے ہیں۔ لکھا ہے کہ جب حضرت اکبر الٰہ آبادی سے قبر میں منکر نکیر نے سوال جواب کرنے شروع کئے تو گھبرا کر بول اٹھے کہ میری نوٹ بک (اور شاید اس کے ساتھ عینک بھی) پیچھے ہی رہ گئی۔ بتاؤں کیسے؟ میرے خیال میں ایسے ناخوشگوار حادثات کا علاج یہ ہو سکتا ہے کہ مصری فرعونوں کی طرح ہر نوجوان پڑھنے والے کے ساتھ ایک ایسی کتب خانے کی کتاب دفنا دی جائے جو ان کے زیرِ مطالعہ رہی ہو۔ اس میں ان کے متعلق پوری معلومات ہی نہیں ملیں گی بلکہ ان کی دلچسپیوں اور پُراسرار مصروفیتوں پر بھی بہت کچھ روشنی پڑ سکے گی۔

جیسے نقاشی میں تصویر کے بعد لکیر کا کام آتا ہے۔ اسی طرح حاشیہ آرائی کرنے والوں کے بعد "مشق آرائی" والوں کا درجہ رکھا گیا ہے۔ بعض پڑھنے والے نشان لگانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، یہ نشان ہر طرح کے ہوتے ہیں اور ہر رنگ کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے بڑے۔ آڑے۔ ترچھے گول۔ بیضوی۔ نقطے۔ لکیر۔ قوس۔ نصف دائرے۔ مکمل دائرے۔ اکیلا ٹک مارک دوہرے۔ تیہورے۔ نشان کیا ہوتے ہیں اچھی خاصی اقلیدس کی بھول بھلیاں ہوتی ہے اور اس پر طرفہ چیز رنگ آمیزی ہوتی ہے۔ بعض اصحاب سرخ نیلی پیلی دھاریاں لگاتے ہیں۔ بعض پڑھنے والے بہت ہلکے قسم کے نازک اور لطیف نشان لگاتے ہیں۔ اور بعض حضرات تو معلوم ہوتا ہے پنسل کی جگہ شاید بے دھار ناخن تراش کے قسم کی کوئی چیز استعمال کرتے ہیں۔ اور نفسیاتی لحاظ سے اس کی ضرورت بھی بڑی سخت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب تاثرات ذہن پر بعینہٖ اسی قسم کا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے ایک گاڑی راستہ پر پہیوں کا نشان بنا جاتی ہے۔ نرم اور ملائم راستوں پر تو ایک ہلکی پھلکی بائیسکل بھی لہریں بناتی چلی جاتی ہے۔ مگر سنگلاخ اور پتھریلی زمینوں پر

تو بھاری بھرکم ٹھیلے اور چھکڑے بھی نشان نہیں بنا سکتے۔ موٹی اور گہری لکیریں لگانے والے اصحاب معذور ہیں۔ وہ اپنے دماغ کے طبعی اور سطحی جغرافیہ سے بخوبی واقف ہیں۔ وہاں پنسلیں کام نہیں آسکتیں وہاں تو ناخن تراش کیا شاید دماغ تراشوں کی ضرورت پڑ جائے گی۔

آج دنیا میں تخصیصِ کار کا اصول کارفرما ہے۔ آپ کو ہر علم کے۔ ہر پیشہ کے اور ہر پیشہ کی ہر شاخ کے ماہرِ خصوصی مل سکتے ہیں۔ کان کے ماہر۔ زبان کے ماہر۔

لیکن جوں جوں انسانوں میں ماہرین بڑھتے گئے۔ بیماروں میں بیماریاں زیادہ ہوتی گئیں اور جراثیم کی دنیا میں جراثیم زیادہ ہوتے گئے۔ لائبریرین بیچارے نے ماہرین کے حلقے میں ابھی ڈرتے ڈرتے قدم رکھا ہی تھا۔ ابھی اس گھونگھے پر مہارت علم کا وہ گہرا رنگ نہیں چڑھا تھا جو بتدریج اس کے زندگی بھر کی وسیع دلچسپیوں کو ایک گھونگھے کے خول کی طرح سوکھا مردہ بنا دے۔ ابھی سر نکالنے کو ہی تھا کہ مختلف اقسام کے جراثیم اس پر یوں ٹوٹ پڑے جیسی برسات کی بھاوٹ میں اولے پڑ رہے ہوں اب تک اس غریب ماہر کو ایک موذی سے ہی واسطہ پڑا تھا جسے کتابی کیڑے کہتے ہیں۔ ان کا علاج یہ نیم کے پتوں اور نیپتھا کی گولیوں سے کر لیتا تھا۔ لیکن اب وہ زمانے کہاں جب معمولی نیم کی دھونی سے بھوت پریت اتر جاتے تھے۔ یہ نئے پریت لکھے پڑھے ہوئے پریت تھے۔ یہ نئے جراثیم تھے بھی بڑے زہری۔ یہ بھڑ یا تتیا نہیں تھے کہ ایک جگہ کاٹا اور چھالا ابھار دیا۔ انکا عمل رات کے اس پُراسرار اور خوفناک کیڑے کا سا تھا کہ جہاں جہاں بدن پر چل گیا آبلے ابھارتا چلا گیا۔ جہاں جہاں پھر گیا۔ کتاب کے دودھ جیسے شفاف حاشیوں کو۔ اس کے آبدار جسم کو کہیں کالا کر گیا کہیں نیلا۔ جیسے ایک مرض کی شعریت کو ایک ڈاکٹر ہی خوب سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح ان جراثیم کی اصناف ان کے نفسیاتی رجحانات اور کردار کی داد ایک لائبریرین ہی دے سکتا ہے۔

پچھلے دنوں امریکہ کے ایک ماہر نفسیات نے دستخطوں کے مشاہدہ اور مطالعہ سے کردار کی جانچ اور اندازہ کے اصول مرتب کئے تھے۔ میرے خیال میں تو اتنی دور جانے کی ایسی کچھ ضرورت نہیں تھی۔ ہر پڑھنے والے کے کردار کا صحیح عکس اس کے نشانوں میں اتنا ہی واضح ہوتا ہے۔ جتنا قسمت کا لکھا

ں لکیروں میں۔ جو شخص بے دھڑک پوری کتاب میں سرخ اور نیلے رنگ کی بھری اور موٹی لکیریں
جاتا ہے۔ وہ لازماً ایک برخود غلط۔ استعمار پسند۔ خود نما۔ خود غرض ڈاکو ہے۔ جو ہلکی ہلکی ٹیڑھی میڑھی
لگاتا ہے۔ وہ ایک کتابی گٹھ کترا ہے۔ اور جو ہلکے نقطے یا مدھم سیدھی لکیریں بناتا ہے وہ ایک
ڈلا چور ہے۔ جس کا کردار پانی سے بھی پتلا اور ڈھلتی پھرتی چھاؤں سے بھی زیادہ متلون ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو یہ نشانات یا حاشیہ آرائیاں مظاہرہ ہوتی ہیں۔ ایک دبی ہوئی
اور اپج کا جسے اظہار کا جائز ذریعہ نہیں ملتا۔ خواہ یہ جبلت جنسی میلان کی ہو۔ یا وہ افسوسناک
ستری جو اکثر ہمارے سماجی اور خانگی ماحول کی وجہ سے نوجوانوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ
ں میں ماں باپ کی اور مدرسوں میں استاد کی گھرکیاں کھاتے رہتے ہیں۔ کتابوں کے حاشیہ
ن کو گھرک کر کچھ نہ کچھ بدلہ نکالتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ مصنفین بھی بڑے آدمی ہوتے ہیں اس لئے
رک بازی سے اُن کو اطمینان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے اُن کے اچھے اور اعلےٰ جذبات کے
ئے ایسے عمل راہیں نہیں کھلی ہوئیں جن میں وہ اپنے اُبلتے ہوئے ہمدردی اور محبت کے چشمے
ل سکیں۔ مثلاً پریم چند کے ایک افسانے میں پولیس کے سپاہیوں نے نہتے کسانوں پر گولیاں
شروع کر دیں۔ اس پر ایک صاحب لکھتے ہیں "ہائے رے ظلم کی کوئی حد بھی ہے" اس اشارہ
انیت بھی ہے۔ اور ہمدردی بھی اور وہ ہمدردی جو ذہن کی چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتی۔
ے ادارے طلبا کے لئے کام اور عمل کی بہتر راہیں کھول دیں تو ان بیماریوں کا خود بخود علاج
ے۔ پھر وہ کتابوں کو زندگی نہ سمجھیں گے۔ بلکہ زندگی کی تیاری سمجھیں گے۔ کتابیں ان کے ہاتھ میں
دھار تیشہ نہ ہوں گے جو کہ ایک بچہ چوری سے ابا کے اوزاروں کے تھیلے میں سے نکال لیتا ہے۔
، وہ پتھر پر دے مارتا ہے۔ اور کبھی اپنی انگلی کی پوروں پر۔ کتابیں ان کے ہاتھ میں وہ جوہردار
ں گے۔ جن سے وہ سماج کی فاسد خون سے بھری ہوئی رگیں کھولتا چلا جائے گا۔

ہماری پرانی تعلیم میں بہت سی خرابیاں تھیں لیکن ان کے ساتھ کچھ خوبیاں بھی تھیں ان میں
ؤبی کتابوں کا احترام تھا۔ اگر اتفاقاً کسی سے کوئی کتاب گر جاتی تھی تو وہ اسے سر آنکھوں پر لگاتا تھا

اس کا مقصد یہ نہیں تھا۔ کہ وہ اس کاغذ کی قدر کرتا تھا۔ جس سے وہ بنی ہوئی ہے۔ یا اس سیاہی کی جس سے وہ لکھی ہوئی ہے۔ یہ کاغذ اور سیاہی کی عزت نہ تھی۔ علم کی عزت تھی۔ اس علم کی عزت جس کا بنانے اور سکھانے والا خود کردگار حقیقی تھا۔ ایک کتاب ان کے لئے ایک درخت تھا جس کی اہمیت انفرادی پہلو سے گزر کر سماجی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ہر فرد اپنے یا اپنے خاندان کی نگاہ میں اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ بلکہ عوام کی نگاہ میں بھی۔ اس زمانہ میں کتابوں کی کمی تھی۔ اور ہر کتاب میں قلمی ہونے کی وجہ سے ایک گہرا انسانی پہلو موجود تھا۔ اس زمانے میں ہم کتابوں کا احترام بھی کرتے تھے اور استعمال بھی۔ آجکل مصروفیت کی وجہ سے تقسیم کار کا اصول ہو گیا۔ ہم یہ دونوں کام بہ یک وقت انجام نہیں دے سکتے۔ بعض کتابوں کا ہم استعمال کرتے ہیں۔ اور احترام کم۔ بعضوں کا احترام کرتے ہیں اور استعمال کم۔ اور کم از کم ایک کتاب کا تو احترام ہی احترام کرتے ہیں وہ قرآن حکیم ہے۔

مسخرے

جناب سید حامد صاحب ایم۔ اے علیگ متعلم مسلم یونیورسٹی

کبھی کبھی انسان سوچنے لگتا ہے کہ اگر دنیا میں فلاں شے نہ ہوتی تو ہماری زندگی کس قدر بےکیف ہو جاتی اور جہان کا نقشہ کتنا بدلا ہوا ہوتا مثلاً نیکی نہ ہوتی یا عقل نہ ہوتی۔ محبت نہ ہوتی یا شجاعت نہ ہوتی یا امید نہ ہوتی یا خوشی نہ ہوتی۔ مگر آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ زندگی میں کوئی چاشنی نہ رہتی اگر مسخرگی کا وجود نہ ہوتا۔ نقشہ کا آب و رنگ اڑ کر محض ایک خاکہ رہ جاتا۔

مسخرہ۔ کتنا لچکیلا ہے یہ لفظ۔ اعتدال کی شاہراہ سے ذرا ہٹے اور اس کی قلمرو میں جا پہنچے۔ اس کی اقسام لاتناہی اور بے شمار ہیں مثلاً مسخرہ تام۔ مسخرہ ناقص۔ تقریباً مسخرہ نیم مسخرہ۔ ہمہ وقت مسخرہ۔ وقتاً فوقتاً مسخرہ اپنے واسطے مسخرہ اوروں کے لئے مسخرہ۔ اپنے وطن میں مسخرہ۔ صرف وطن سے باہر مسخرہ وغیرہ وغیرہ۔ فرصت کے لمحات کا اس سے بہتر استعمال کیا ہوگا کہ ہر شعبۂ حیات میں مسخروں کی تلاش کی جائے مسخرہ گیر ہر سمندر میں اپنا جال ڈال سکتا ہے اور انشا اللہ کبھی مایوس نہیں ہوگا۔ حاصل کلام نمائش میں وائی ٹون کا اشتہار دینے والے بہروپیوں سے لے کر بحر علم و ادب کے شناوروں اور دریائے سیاست کے نہنگوں اور بیشۂ شاعری کے ہزبروں تک نظر ڈالئے۔ اپنے ہمسایوں اعزہ اور دوستوں سے استفادہ کیجئے کہ اقربا کا حق مقدم ہے۔ اپنے ہم جماعتوں میں چھان بین کیجئے اور پھر ایک اچٹتی ہوئی سی نظر اپنے اساتذہ پر بھی ڈالئے اور آخر میں ذرا اپنے نفس کا بھی احتساب کیجئے اپنی چال ڈھال وضع قطع کو دیکھئے اور ذرا آئینہ سے مشورہ کیجئے۔

جامع العلائم مسخرہ تو آپ کو ملنے سے رہا۔ جس کسی میں مندرجہ ذیل علامتوں میں سے ایک علامت بھی موجود ہو سمجھ لیجئے کہ ہو نہ ہو یہ مسخرہ ہے۔ جس کے ساتھ رہ کر آپ کا یقین کہ کائنات کا کوئی نظام ہے۔ زائل ہونے لگے جس کا سینہ راز کا مدفن نہیں راز کا جوالا مکھی ہو۔

جو شخص پہلی ملاقات میں نہایت بے تکلف ہو جائے ۔ جو بڑے آدمیوں سے اپنی بے تکلفی دکھانے کے لئے من گھڑت واقعات نشر کرے اور رائی کے گرد ایک پہاڑ چپکا دے۔ جو الفاظ کے گورکھ دھندوں کو جوڑ کر شیطان کی آفت تیار کر دے حکمت یاد رہے کہ اگر تمام انسان سنجیدہ اور ثقہ ہوتے تو دھرتی ان کے وزن کی تاب نہ لاکر شق ہو جاتی مسخروں کی تخلیق کی ایک غایت یہ بھی ہے کہ انسان کا اوسط وزن زمین کی طاقتِ برداشت سے بڑھ نہ جائے) جسے گالیاں بہت سی از بر ہوں اور وقتِ ضرورت مزید اختراع کرسکتا ہو جو میں' کی ضمیر کے علاوہ کسی ضمیر کے وجود سے آشنا نہ ہو۔

جس سے غیر متوقع باتوں کی توقع کی جا سکے ۔

چلنے میں جس کا ایک شانہ نظر بہ فلک اور دوسرا رُخ بہ زمین ہو آخر کیا پتہ کسی وقت آسمان ٹوٹ پڑے یا زمین پھٹ جائے۔ جس کے قدم رکھنے سے جسم کی عمارت متزلزل نظر آئے۔ معلوم ہو کہ اب ٹھمکا لگا یا۔ جس کا پیٹ بلا ارادہ سینہ سے بہت آگے نکل جائے اور وہ بھی جس کا سینہ بالقصد پیٹ کو بہت پیچھے چھوڑ جائے! اور جو چلنے میں انسان کم اور پہلوان زیادہ معلوم ہو۔ وہ بھی جس کا پیٹ بہ نسبت خالق کے کوزہ گر کا زیادہ مرہونِ منت نظر آئے ۔

جس کا کوئی تکیۂ کلام ہو۔

نکتہ ۔ مسخرگی کی لطیف ترین شکل وہ ہے جس کی دریافت تبسم سے مترشح ہو۔ قہقہہ اور سخرگی کی تلاش رہیں اس سے استلذاذ) بتدیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ جو طنز اور تعریف میں امتیاز نہ کر سکے اور جو اپنے متعلق حسنِ ظن رکھتا ہو جو بذلہ سنج اور ظریف طبع ہو۔

جس کا تقویٰ عبا اور دستار کے علاوہ جبیں کی شکن میں پنہاں اور اُسی سے عیاں ہو جو آزاد طبع ہو اور لاابالی اور بہت سی قیود سے اپنے طور پر آزاد ہو گیا ہو۔ جسے دیکھ کر آپ سمجھ لیں کہ یہ بالکل بے ضرر ہیں۔

جس طالبعلم کے احساس تناسب کا یہ عالم ہو کہ یونین کھیل تفریح گپ ، ستک۔ محبت ان میں سے ہر بٹیا پر خوش خرامی کرے لیکن منزل مقصود تک پہنچانے والی شاہراہ سے تغافل برتے۔

سنتے چلے آئے ہیں کہ جھوٹ بولنے کو سلیقہ چاہئے لیکن طلاب کی اصطلاح میں "مکھن لگانے" کو اس سے زیادہ سلیقہ درکار ہے کہ برطانوی ہند میں ۹۵ فی صدی مکھن لگانے والے جھوٹ اور سچ کی آمیزش سے کام لیتے ہیں۔ جھوٹ میں سچ کو سمونا بیک وقت دو معرکے سر کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوشش کی جائے مکھن لگانے کی اور لگ جائے مرچ یا چونا۔ اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ "بخل ہر وقت غیر محمود ہے۔ مگر اس گھڑی کہ مکھن لگایا جا رہا ہو۔" فیاضی مضر ثابت ہوگی سوائے اس صورت کے کہ مکھن لگایا جانے والا کاٹھ کا الو ہو یا پرانا عادی جس کی آنکھوں پر مکھن کی تہوں نے پردہ ڈال دیا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ مکھن لگانے والوں کی دو قسمیں ہیں بخیل اور فیاض اول الذکر چابکدست ہیں اور آخر الذکر پھوہڑ۔ صرف دوسری قسم کا شمار مسخروں میں ہوسکتا ہے کہ پہلی نوع کا سراغ لگانا مشکل اور ثابت کر دینا محال ہے اور دوسرے اس طبقہ کا ہنر سوسائٹی کے معمولات میں سے ہوگیا ہے۔

جو ہنسے تو بہت دیر تک ہنستا رہے اور اس اندیشہ سے کہ ہنسی کی کوئی بات بغیر ہنسے چلی جائے آپ کی ہر بات کو ہنسی کا خراج لگاتار ادا کرتے رہے اور اس اندیشہ سے کہ اس کی بات پر کون ہنسے گا خود اپنی بات پر ہنس کر تالیفِ قلب کرلے اور وہ بھی جو بات کہے بعد میں اور ہنس دے پہلے اور ہنسی بھی سکینوں کی سی۔

جو ہر جگہ اپنا دکھڑا رونے بیٹھ جائے۔

جو اپنے خاندانی واقعات کی طرف اس پیرایہ میں اشارہ کرے گویا سیاسیاتِ حاضرہ کی طرح ہر متمدن انسان کے لئے ان سے واقف ہونا لازمی ہے۔

جو بے ربط باتیں کرے اور سمجھے مذاق کیا۔

جو دس سطریں نثر کی اس لئے لکھے کہ آگے چل کر ایک شعر لکھنا ہے۔

جسے ہر بات کے بعد شعر پڑھنے کا شوق ہو۔ شعر اور ماقبل کے درمیان صرف ایک لفظ کا اشتراک ہو مضمون کا نہیں۔

جس کا لباس صاف بتا دے کہ مجھے ان سے کوئی رابطہ نہیں اور اگر میری مرضی کو دخل ہوتا تو میں

ان کے پاس بھی نہ پھٹکتا۔

جسے دیکھ کر یہ محسوس ہونے لگے کہ سنجیدگی کی تخلیق بے کار ہوئی۔

خلوص اور محبت کے خس و خاشاک کو جس کے بہتے دریا میں قرار نہ ہو جو اوّل الذکر کو حماقت اور ثانی الذکر کو دیوانگی سمجھے۔

جس کی رگ و پے سے شرارت ٹپکتی ہو۔ جس کے عضو عضو سے شوخی پھوٹ رہی ہو

جو بے محل باتیں کہنے اور کرنے میں طاق ہو۔

جس کے اطوار اور عمر میں سن بلوغ کے بعد کبھی نہ بنے۔ یعنی جس کا بچپن جوانی اور بڑھاپے پر حاوی ہو۔

جو کھیل سے زیادہ وقت کھیل کی "سیاسیات" کو دیتا ہو۔

جو سلام کرے تو معلوم ہو رکوع کر رہا ہے یا بیٹھک لگانے کا قصد۔

جو بہت جذباتی ہو۔

جو موجودہ نفسیات سے متاثر ہو کر اپنے افعال سے قوتِ ارادی کے وجود کی تغلیط کرے۔

جس کی چال میں لچک کے عناصر جھول رہے ہوں۔

جو حُسن پرست ہو۔ "بوالہوس" مسخرہ کم ہوتا ہے "اہلِ نظر" زیادہ۔

جو رائے عامّہ سے اختلاف کو تشخّص کی علامت سمجھے۔

جسے بحث کی خاطر بحث کرنے کی عادت ہو۔

جس کی زبان کو میرٹھ کی مشہور مصنوع سے بلا خوفِ تردید تشبیہ دی جا سکے اور جس کے دہن کو علی گڑھ یا شاہجہاں پور کی صنعتوں میں سے کسی ایک سے مستفید کر دینا رفاہِ عام میں شمار ہو سکے جس کا خالق خلاق کون و مکاں کے بجائے اڈلین قرار دیا جا سکے۔

جس کی مونچھیں "خاکروبی" اور اکثر وہ بھی جس کی سلت "بابل نشیں" ہو۔

جو غیر اہم سنی سنائی بوسیدہ باتوں کو جو مٹی کی دلھن بنا کر پیش کرے۔ اگر مقولہ یا ضرب المثل ہے تو

اس انداز سے گویا موجد سے سینہ بسینہ اس تک پہنچی ہے اور اگر خبر ہے تو اس پیرایہ میں گویا رائیٹر (Reuter) کی توجہات اسی کے لئے وقف ہیں۔

جو مگن رہتا ہو۔

جو خبریں اختراع نہ کر سکے لیکن گڑھی ہوئی خبروں کے پرچار میں کسی گزٹ سے کم نہ ہو۔

جو آپ سے سنی ہوئی بات آپ کو سنا دے گویا آپ کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔

جس کی ڈاڑھی میں چند بال تبرک کے طور پر لہلہا رہے ہوں۔

جو آج نوکری کرے۔ کل یکہ چلائے۔ پرسوں خربوزے بیچے اور اس کے بعد بھالو نچائے اسی طرح جو آج قانون گو ہو کل مصاحب پرسوں ہومیوپیتھک کا ڈاکٹر یا بیمہ کمپنی کا ایجنٹ یا واشنگ فیکٹری کا منیجر اور اس کے بعد لڑکے پڑھائے۔ جو عرس میں بغیر حال لائے ہوئے نہ مانے اور کھلے بندوں رقص کرنا شروع کرے اور آنسو بہاتا اور "دریا بجاب اندر" کو "دریا میں بہا بندر" پڑھ پڑھ کر سر دھنے۔

اشارہ۔ جسم کی ورزش کو جمناسٹک اور زبان کی ورزش کو گپناسٹک کہتے ہیں پہلی کا ماہر کچھ وقت مسخرا اور دوسری کا لاگو ہمہ وقت مسخرہ ہوتا ہے۔

جو قلندر ہو یا مچھندر۔ مداری ہو۔ یا سپیرا۔ شعبدہ باز ہو یا بہروپیا۔ نٹ ہو۔ یا بالکا۔ جڑی بوٹی والا ہو یا "ساقی" بیڑی کا اشتہار دینے والا ہو۔ یا سینما کا۔ سرمہ لگانے والا ہو۔ یا جنسی امراض کی دوائیں بیچنے والا۔ مراثی ہو۔ یا کوکینیا۔ لی چھنیا جان پر فدا ہو۔ یا دختِ رز پر۔ لٹو۔ چرسیا ہو۔ یا بھنگڑ۔ رئیس ہو۔ یا مصاحب۔ شاعر ہو۔ یا مدیحی۔ (فی زمانہ) ولایت یا نبوت کا مدعی ہو۔ یا الوہیت کا۔ بھٹیارا ہو۔ یا قوال۔ غنڈا ہو۔ یا اٹھائی گیرا۔ "پروفیسر" ہو۔ یا ایکٹر۔ دھنا ہو۔ یا کبابیا۔ ڈوم ہو یا مراثی۔

اعتذار۔ متذکرہ بالا فہرست میں مذاق کو شامل کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں تھا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی دھنا۔ بہت سنجیدہ ہوتا ہم جب اسے "در پئے جانانِ جاں ہم رفت" کا ورد کرتے ہوئے دیکھیے مسخرہ نظر آئے گا۔ لہٰذا یاد رہے کہ دھنا صرف (Part-time) مسخرہ ہے۔

حکمت۔ جب ہی تو بزرگوں نے کہا ہے کہ پیشے کے انتخاب میں بہت غور و خوض سے کام لینا چاہیئے۔
جو بغرض فصاحت بقول شخصے۔گو یا کہ۔ الا ماشا اللہ علیٰ ہذالقیاس۔ واللہ اعلم وغیرہ کے موتیوں کو
بغیر ضرورت اور بغیر محل سلک تقریر میں پرونے کا عادی ہو چکا ہو۔
جس کی بات سنتے وقت آپ بات پر اتنا غور نہ کریں جتنا بات کرنے کے انداز اور دست و پا اور
سر و سینہ کے ہر آن مختلف زاویوں پر۔
جس کی ہنسی پر آپ کو ہنسی آجائے۔
جو چھپا رستم ہو۔
جو مذاق کرنے سے بگڑ جائے، نہیں، بچھ جائے۔
جو زبان سیکھ لے مگر لہجہ میں بھولا بھالا رہے۔جو قلم کو غلم کہے اور "کہنا" اور "بولنا" میں امتیاز نہ کر سکے
جو اپنے جملہ کے پہلے لفظ کو ایک لمبا پینگ دے اور باقی الفاظ کا اوسط عمر ہندوستانی ہو جائے۔
جو تمر در ہو۔
جو سلام کا جواب گردن کے اشارہ سے دے۔جیسے یہ حضرت تخلیق ہی ہوئے ہیں سلام لینے کے واسطے
غافل شیخ شیراز کے اس شعر سے۔

گر بلندت کسی دہد دشنام   بہ کرسا کن دہد جواب سلام

جو تبسم اور سلام کے اجتماع کو کفر اور اسلام کا اتحاد سمجھے۔جس کے لئے لب تبسم سے ملوث ہونا اور مے
سے آلودہ ہونا برابر ہو۔جو خشونت اور درشتی کا اجارہ دار ہونے پر نازاں ہو۔
فرانسیسی مثل ہے "کوئی ہیرو اپنے خانگی ملازم کی نظر میں ہیرو نہیں ہوتا" آپ اگر پرائے گھروں
میں جھانکنے پر قادر ہوں تو لا محالہ اس نتیجہ پر پہونچ جائیں گے کہ مسخرے جتنے ہمیں نظر آتے ہیں در اصل
تعداد میں اس سے بہت زیادہ ہیں۔یہ اور بات ہے کہ وہ ہمہ وقت مسخرے نہیں۔
جس کی آواز بہت منفرد ہو عام اس سے کہ پھٹا ہو یا نہیں۔
جو جامع حیثیات ہو۔ زاہد ہو اور طبیعت رندانہ پائی ہو۔

جو آپ سے باتیں کرے تو معلوم ہو زانوئے تلمذ تہ کر رہا ہے یا معلومات حاصل کر رہا ہے اور وہ بھی جو گویا احسان کر رہا ہے یا سبق دے رہا ہے یا اجلاس کر رہا ہے۔

جو لکھ وہ کچھ دے جس کا عشر عشیر بھی اس کی زبان پر نہ آتا ہو۔

جو برسوں کی پروردہ ڈاڑھی اور مونچھوں کو بلا کسی عذر شرعی کے یکلخت جلا وطن کر دے۔

جھوٹی روحانیت جسے کہیں کا نہ رکھے۔

جس کا چشمہ آنکھوں سے اس طرح پیشانی پر پہنچا دیا جاتا ہو جیسے کسی تصویر کی نقاب کشائی کی جائے۔

یہ۔ ہندوستان ایک برّاعظم ہے جس کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں جا وہاں پر دورانِ قیام تک کے لئے مسخرگی کی قبا پہن لینا ہے۔ مثلاً دِلّی والا آسام پہنچ کر یا میسور والا لاہور یا خان بھائی علی گڑھ یا ملایالم بولنے والا کشمیر۔

جو اپنی ہر خوبی چھپائے مگر یہ خوبی کہ وہ اپنی خوبیاں چھپاتا ہے۔

جو تاکید اور زور کے لئے "فضول" کو "بے فضول" اور "ضروری" کو "لاضروری" کہے۔

جو کسی بڑے افسر کا بیرا یا چپراسی ہو کر یہ سمجھنے لگے کہ صاحب کا ہر ماتحت خود اس کا ماتحت ہے۔

جو سرِ راہ استنجا کرے اور بڑے طمطراق کے ساتھ۔

جو یہ دیکھ کر کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں بلا تامل یہ فرض کرلے کہ وہ اسے جرم کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا چل رہا ہو تو قدم لڑکھڑانے لگیں اور لکھ رہا ہو تو قلم رُک جائے۔

مثل ہے کہ چیونٹی کی موت آتی ہے تو پر لگتے ہیں۔ (Herr Hess) کی شامت آتی ہے تو اسے اڑنے کا شوق چرّاتا ہے۔ امروزہ سیاست میں سب سے بڑا مسخرہ وہی ہے۔

اسی طرح اقوامِ عالم میں مسخرگی کا سہرا ہندوستانیوں کے سر ہے۔ ان میں سے ایک قوم کہتی ہے۔ "تم گائے کو ذبح کرو گے ہم تمہیں ذبح کریں گے۔ حساب برابر"۔ دوسری کہتی ہے "تم مسجد کے سامنے شادیانے بجاتے ہو۔ اب تمہارے گھر والے تمہارا ماتم کرکے اوسط پورا کر دیں گے۔ رنج و راحت ازل سے توام ہیں۔ پھر دونوں کہتے ہیں "آؤ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے۔ اب تک تو انگریز

ہمارے لئے لڑ رہے ہیں۔ پھر ہمیں ملک کی حفاظت کرنا پڑے گی۔ آؤ ہو جائیں دو دو ہاتھ۔ فنِ جنگ کے لئے خانہ جنگی سے بہتر اور سہل الحصول کیا تربیت ہوگی۔" . . ایک کہتی ہے" ہماری تمہاری نہیں نپٹتی ہمیں اپنا گھر الگ بنا لینے دو" دوسری کہتی ہے" نہیں رہوگے تو ساتھ ہی رہوگے! آخر تمہارا اس میں حرج کیا ہے۔ ہمارے دل میں بھی تو حکومت کرنے کی حسرت ہے"

جس طرح انگریز ہندوستان کی بہبود کے لئے اِس ملک پر حکومت کر رہے ہیں۔ جیسے جرمنی نے ناروے کی کمک کو فوجیں بھیجیں تھیں اسی طرح انڈین نیشنل کانگرس مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی ہے۔ شیر نے بکری کو کھاتے وقت کیا کہا تھا؟ . . " تو تو نادان ہے جو چلا رہی ہے ابھی تو ایک حقیر بکری ہے کچھ عرصہ میں شیر کا جزوِ بدن بن جائے گی" ہندوستان کی اکثریت کا تمسخر ملاحظہ ہو اقلیت کو یہی سبز باغ دکھایا جا رہا ہے" دس کروڑ کیوں بنتے ہو جب چالیس کروڑ بننے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ پاکستان کس کام کا جب ہندوستان ملے"

جو اپنی علیحدہ ذاتی زبان رکھتا ہو کہے" ہندوستانی" اور دل میں اس کے معنی لے 'ہندی' پھر اندیشہ ہو کہ ہندی کی بہ نسبت ایک اور زبان ہندوستانی سے نزدیک تر ہے' اس لئے ایک قلابازی اور کھائے اور ایک نیا نام اُگل دے ہندی الملقب ہندوستانی۔ کوئی دریافت کرے ان سے کہ اس مجم پر کیوں قناعت کر لی زبان کا نام یہ رکھتے تاکہ اشتباہ کا کوئی امکان ہی نہ رہتا" ہندی جو امید کی جا رہی ہے زمانۂ آئندہ میں بھارت ورش میں بولی جائے گی جو سنسکرت کی (*Posthumous*) اولاد ہے۔ جس کو وہ لوگ بولتے ہیں۔ جو اس کو سمجھتے نہیں۔ جس کو ملچھوں کے فرشتے بھی گندا نہ کر سکیں گے"۔ . .

ہر مقیاس الحرارت تمسخر کے اس درجۂ حرارت کی پیمائش نہیں کر سکتا۔ سچ ہے بڈھوں کی باتیں بھی بڑی علامتیں آپ کو سمجھا دی گئیں۔ مزید سہولت کے لئے مثالیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ پہلے تین بہت نیچے طبقہ کے لوگ ہیں کچھ ادب اور کچھ تعلیم کا خیال اساتذہ پرا ور زندگی اور آسائش کا خیال طالبعلموں پر قلم اٹھانے سے روکتا ہے۔

سہ کشورِ دل ہی میں گھٹ کر رہ گئیں کیسی کیسی نازنین شہزادیاں

کوّا۔ کوّے اور انڈے کا قرب مرغیوں والے گھر کے لئے خطرناک سمجھا گیا ہے لیکن ہم آپ کا ایسے کوّے سے تعارف کرائیں گے جو انڈے لے نہیں جاتا لاتا ہے۔ کوّے کا حلیہ یہ ہے مضبوط جسم چوڑا سینہ فراخ شانے۔ اعضا ورزش کی غمازی کرتے ہیں۔ رنگ کا تو آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا۔ انڈے بیچنے کے بجائے ہیڈ کانسٹیبل ہوتا تو زیادہ جچتا۔ سر پر سفید پگڑ۔ سردیوں میں جسم پر فوج کا نکالا ہوا اوور کوٹ ہاتھ میں انڈوں کی ڈلیا ہر مسخرے کی طرح منفرد چال کا مالک ہے۔ اس کی چال کا تجزیہ کیا جائے تو فوجی مارچ اور رقص کا ارادہ یہ نکلیں گے اسکے اجزائے ترکیبی۔ آواز لگانے میں تان سین سے استفادہ کرتا ہے۔ "انڈے جاہئیں"! اس مختصر سے جملہ میں موسیقی کے تمام اتار چڑھاؤ سما جاتے ہیں۔ بیروں میں بیٹھتا ہے تو انھیں بناتا ہی۔ اور موقع ہاتھ آجائے تو آپ پر بھی پھبتیں ڈال جاتا ہے۔ ڈانٹئے تو اس کی "حضور سرکار" اور مصنوعی گھبراہٹ آپ کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پیسے مانگتے ہوں تو چک سے آنکھیں ملا کر کمرے میں سطح جھانکتا ہے گویا آنکھوں کے طول و عرض کا چک کے سوراخوں سے موازنہ کر رہا ہے۔

ملّن۔ صوفی اور بازیگر کا نادر اجتماع۔ چال ایسی کہ بیر کی ہر تال پر پریاں رقص کریں۔ پھرتی بتاتی ہے کہ نٹ کی اولاد ہیں اور وضع قطع جبّہ قبہ کوئی شاہ صاحب ہیں جسم میں اللہ رکھے ڈیڑھ ہڈی سے زیادہ نہیں اور جیب میں بھی خدا کے فضل سے پیسہ کوڑی کا قیام کم ہی رہتا ہے۔ لیکن چال دیکھئے اور تیور دیکھئے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ رستم بھی یہی ہیں اور قارون بھی یہی۔ مگن رہتے ہیں۔ زنگاری رنگ ہے۔ ہنستا ہوا چہرہ جس کا طول نکیلی ڈاڑھی نے اور نمایاں کر دیا ہے۔ آواز حلق کے علاوہ ناک سے بھی مستفیض ہے۔ پیشہ نام کے لئے مالش کرنا لیکن دراصل خود ان کی اصطلاح میں ٹھگنا ہے۔ یہ کسی ایک آستان سے وابستہ نہیں ان کا فیض عام ہے۔ یونیورسٹی کے اربابِ اختیار (گذشتہ اور موجودہ) میں سے ہر شخص "وہ تو میرا یار ہے۔ پچھلی عید میں ہی دس روپئے ٹھگ لایا ہوں"۔

تخیل پر تکیہ ہے۔ یہ کہنا کہ ان کے یہاں جھوٹ اور سچ میں اُڑد اور سفیدی کا تناسب ہوتا ہے ان کی قوّت اختراع کی توہین ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں "میاں بلوچستان کے وہ سردار خاں جو تھے انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا تجھے آسودہ حال رہنے کا گُر بتائیں۔ میں نے پوچھا میاں وہ کیا۔ کہا دیکھ کبھی سچ مت بولنا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے یہ بات پلّو میں باندھ لی ہے۔" اس حکایت کے مفہوم سے مجھے اختلاف نہیں البتہ فن کا جوہر اکتسابی نہیں فطری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس پر بعد میں جلا کر دی گئی ہو۔

لنگی باندھتے ہیں کوٹ پہنتے ہیں۔ کندھے پر انگوچھا پڑا رہتا ہے کپڑوں کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ خاک کو حیرت ہوتی ہوگی اور فخر کہ "این! یہ میرا ہی کارنامہ ہے۔" آنکھوں سے شرارت اُبلی پڑتی ہے۔ لارڈ ولیم بنٹنگ کے زمانہ میں ہوتے تو یا تو بلندی پر ہوتے یا تاریکی میں سولی کی زینت بنتے یا زنداں کی۔ حرفوں کے بنے ہوئے ہیں۔ چلتے پرزے ہیں۔ آفت کے پرکالے ہیں۔ تمتیاً مرنج ہیں۔ افسردگی و اضمحلال کے لئے تریاق ہیں۔ پڑھے لکھے ہوتے تو کسی رئیس کے دستِ راست بنتے۔

میجر عبداللہ۔ ان کے نام کے پہلے جزو کے متعلق شدید اختلاف آرا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ لارڈ عبداللہ ہیں کچھ مُصِر ہیں کہ نہیں میجر۔ لیکن چونکہ "یارانِ میکدہ" میں۔ عبدالشکور صاحب نے انھیں آخرالذکر مرتبہ پر فائز دکھایا ہے لہٰذا نظر برسوابق میں بھی یہی لکھتا ہوں۔ شکور صاحب نے میجر کی دکھتی رگ پکڑ لی ہے اور میں اس پر ترقی نہیں کر سکتا وہ یہ کہ موصوف بلا کے ہنگامہ پسند واقع ہوئے ہیں۔ جہاں ہمہمہ وہاں میجر۔ ہاکی کا میچ ہو یا ٹینس کا۔ میلاد شریف کی محفل ہو یا یونین کا جلسہ۔ انگریزی میں تقریر ہو خواہ اُردو میں۔ مداری بندر نچا رہا ہو تو میجر موجود ہیں اور نیوٹ کا مظاہرہ ہو رہا ہو تو عبداللہ براج رہے ہیں اور محض عام تماشائی کی حیثیت سے نہیں آپ ٹورنامنٹ جیتئے تو کپ میجر کے سر پر ہوگا۔ اور کھیل کی مدح یا قدح ان کی زبان پر تنقید سے انہیں کون روک سکتا ہے۔ پٹے میں لگا نہ روزگار ہیں۔ بلوہ ہو رہا ہو تو میجر بھی آستین

چڑھاکرا ور لٹھ ہاتھ میں لے کر فوراً کود پڑیں گے۔ یہاں ان کی ٹانگ معرض بحث میں آتی ہے۔ ان کی داہنی ٹانگ کو بائیں ٹانگ کی ہر حرکت سے اختلاف ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نفاق فطری ہے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اکتسابی ہے اور یہ پھوٹ کسی بلوہ کی ڈالی ہوئی ہے لیکن اس سے میجر کی سنجرگی کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ آپ ان کی لبنی ٹانگ والا قدم دیکھئے تو گمان ہوگا کہ قدموں سے زمین ناپ رہے ہیں، لیکن دوسرا قدم رکھتے ہی یہ راز آشکار ہو جائیگا کہ پہلا قدم دور اس لئے پھینکا گیا تھا کہ فاصلہ جلدی طے ہو جائے۔ ان کی شوخیٔ رفتار کسی آنکھ سے مخفی نہیں اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے وہ اس ذیل میں "کوّے" اور طوطے دونوں کو برسوں سبق پڑھائیں۔ آواز بڑی کھنکتی ہوئی اور سُروں سے مالا مال پائی ہے۔ سیٹی اور بھونپو کا امتزاج جھلکتا ہے۔ حاصل کلام لطفِ خرامِ ساقی و ذوق صدائے چنگ ان کی ذات میں جمع ہو گئے ہیں ان کے جیسے وفادار اور مستعد نوکر کم ملتے ہیں۔ راقم کی نظر سے ایسا بادپا انسان نہیں گزرا بقولِ غالب تیری سرعت کے مقابل میجر۔ برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں۔

مرزا غالب۔ جن کا یہ شعر ہے وہ خود کیا کم مسخرے ہیں۔ شعرا کا دستور ہے کہ محبوب کی غیبت میں اسکے جور و تغافل کا شکوہ کریں گے۔ لیکن محبوب کے حضور میں پہنچینگے تو بھیگی بلی بن جائیں گے ؎

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

لیکن مرزا غالب کا تمسخر ملاحظہ ہو کہ خود محبوب کو کھری کھری سنانے سے دریغ نہیں کرتے اس کے ناز کا جواب نیاز کے بجائے وہ طنز سے دیتے ہیں ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو۔ پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟

ان کے خطوط اور زندگی میں یہ عنصر اور زیادہ نمایاں ہے۔ کسی بزرگ نے جن کے غالب بہت معتقد تھے۔ مرزا کو ایک شجرہ دیا کہ اسے نقل کر دو۔ کوئی اور ہوتا تو سرمایۂ سعادت سمجھ کر آنکھوں سے

لگاتا۔ غالب اس جھنجھٹ سے بہت گھبرائے مبادا یہ ہراول ثابت ہو۔ نقل کیا لیکن اس انداز سے کہ ہر نام کے بعد دوسرا چھوڑ کر تیسرا لکھتے گئے۔ بزرگ مزاور نے دریافت کیا "یہ کیا" عرض کی حضور شجرہ بزرگوں تک پہنچنے کا زینہ ہے۔ سو اگر ایک ایک سیڑھی بیچ میں سے نکال دی جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ ذرا اچک اچک کر چڑھ سکتے ہیں ؎

ایک بار کچھ لوگوں میں رتھ کے مذکر یا مونث ہونے پر بحث ہوئی۔ معاملہ نے یہاں تک طول پکڑا کہ غالب سے استصواب کیا گیا۔ فرمایا یہ کیا مشکل ہے بھیا۔ رتھ میں اگر مرد بیٹھے ہوں تو مذکر ہے اور اگر عورتیں تو مونث۔

حالی کی زبانی اسی قسم کے اور لطائف سنیئے پھر خود مرزا کے خطوط پڑھیئے اور آپ کو ان کے تمسخر میں شبہ نہیں رہے گا۔

لیکن فارسی ادب کے تاجدار شیخ سعدی جس قدر شاعری کے اعتبار سے غالب پر فائق ہیں ۲۱، سے بھی زیادہ تمسخر کے اعتبار سے۔ شعریت اکثر دیکھا گیا ہے۔ تمسخر کی ہمکنار ہوتی ہے شیخ کا اس میدان میں کوئی حریف نہیں۔ سب سے پہلے تو ان کی غیر معمولی عمر اور اس کی دلچسپ تقسیم کو لیجئے۔ اور پھر ان کی متنوع شخصیت کو۔ سبزہ آغازوں سے جی بھر کر دل لگایا اور تصوف کے اعلےٰ مراتب پر بھی فائز ہوئے۔ ایک طرف شیخ شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کے آگے زانوئے ارادت تہ کیا دوسری جانب پر پریوں کے سامنے سر نیاز خم کیا۔ پیری میں چکر ایسا کہ تمام اسلامی دنیا کی پا پیادہ سیاحت کی اور اس سے جی گھبرا گیا تو ربع صدی سے زیادہ اعتکاف میں گزار دی کتنی مالا مال تھی۔ شیخ کی زندگی تجربات سے کبھی سقائی کی کبھی مجاوری۔ بادشاہوں کی قصیدہ خوانی کی اور قناعت کا دامن بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ زندگی کی گوناگوئی اور تنوع سے ان سے زیادہ کون آشنا ہوگا اور اس کے تلوّن کا بھی انھیں تجربہ تھا۔ بولنے پر آئیں تو فصاحت کے دریا بہا دیں اور خاموشی کا شوق چرائے تو ع زباں بریدہ بہ کنجی نشستہ صم بکم۔ فارسی غزل کے پیمبر فارسی نثر کے سرتاج۔ قصاید اور رباعیات اور قطعات اور مثنویات کا اچھا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

ہیں۔ فارسی کے علاوہ عربی میں بھی قادر الکلام۔ بعض اوقات شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ مفرد نہیں مرکب تھے۔ کئی انسانوں کو ملا کر ان کی تخلیق ہوئی تھی۔ عمر بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے۔ سنجیدگی اختیار کریں تو پند و نصیحت کے دفتر کھول دیں اور ظرافت پر اتر آئیں تو فحاشی کی سرحد تک پہنچ جائیں۔" ایک درویش سے دولت مندی اور درویشی کے متعلق بحث کرتے کرتے دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور ڈھول دھپے تک نوبت پہنچا دیتے ہیں۔ دشنام

دادمش لطش گفتم۔ گریبانم درید زنخدانش شکستم ۱؎

دورانِ سیاحت میں شیخ کا گزر ختا میں ہوا۔ جامع مسجد میں ایک پریرو لڑکا عربی کا سبق یاد کر رہا تھا ضرب زید عمرواً۔ فرمایا صاحبزادہ خوارزم اور ختا میں تو صلح ہو گئی زید اور عمرو میں ابھی تک لڑائی جاری ہے۔ اُس نے مسکرا کر وطن پوچھا۔ بتایا شیراز کہا سعدی شیرازی کے اشعار بھی یاد ہیں فرمایا۔

اے دلِ عشاق بدام تو صید من بتو مشغول و تو با عمرو زید

اسے کسی نے بتایا کہ سعدی یہی ہیں تو شہر میں رُکنے کی درخواست کی۔ کھانا بھائی تا اور بدیہتہً قطعہ کہا۔

بزرگی دیدم اندر کوہساری قناعت کردہ از دنیا بغاری
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی کہ باری بندی از دل برکشائی
بگفت آنجا پریرویانِ نغزند چو گل بسیار شد پیلاں بہ لغزند

اسے بھی چھوڑئے۔ اس حکایت کو لیجئے کہ لوگوں نے ایک لومڑی کو بے تحاشا بھاگتے ہوئے دیکھ کر سبب دریافت کیا۔ کہا سُنا ہے کہ اونٹ بیگار میں پکڑے جا رہے ہیں لوگوں نے کہا دیوانی ہوئی ہے اونٹ سے تجھے کیا نسبت۔ جواب دیا اگر کسی نے کہہ دیا کہ یہ بھی اونٹ کا بچہ ہے تو میں کیا کروں گی۔ اس خیال تک ذہن کی رسائی بدونِ تمسخر ہو سکتی ہے؟ اگر شیخ کے تمسخر میں کوئی شبہ رہ گیا ہے تو یہ شعر اس کا ازالہ کر دے گا۔

۱؎ شبلی شعرالعجم۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق ؎ کہ یاراں فراموش کردند عشق

انگریزی ادب میں سب سے بڑا نام شیکسپیئر ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات خرگوش چرانے کی پاداش میں وطن چھوڑ کر بھاگنا پڑا لندن جاکر تھیٹر میں ملازمت کی۔ گھوڑوں کے تقریباً سائیس مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد ترقی کی تو ایکٹر بن بیٹھے اور پھر یہ کہ دن لڑکا ڈرامہ نگار اور شاعر بن گیا۔ اور وہ بھی ا ، پائے کا کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عریانیات میں شیخ سعدی سے پیچھے نہیں مسخرگی کا یہ عالم کہ چند ڈراموں کے علاوہ ظرافت کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں دیا۔ شاہکار یہ کہ مسخروں کے سرتاج فالسٹاف (Falstaff) کی تخلیق کی۔ ان کے ہر طربیہ ڈرامہ میں ایک مسخرہ (Clown) ضرور ملے گا اور مسخریہ کہ اکثر وہی ان کے نقطۂ نظر کا ترجمان ہوگا۔ ایک مکمل ڈرامہ (Comedy of Errors) تمام و کمال تمسخر ہے۔ شیکسپیئر کے یہاں محبت بھی تمسخر کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ محبت میں بھی ان کی سلامت روی ہمہ گیری اور تعلیدِ فطرت ٹپکتی ہے۔ عشق کرتے ہیں تو بیک وقت ایک سیاہ فام عورت اور ایک سفید فام نوجوان سے۔

اِن بزرگوں کا نام لینے سے ان کی توہین مراد نہیں۔ ہر عظمت تمسخر کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ چاندی ہے جو باوجود دھبوں کے روشن ہے۔ جو لوگ تمسخر سے بچتے ہیں وہ اگر ایسا نہ کریں تو ان کا معمولی وجود اپنی اہمیت کھو بیٹھے عام طور پر جن مشاہیر کا تجربہ نہایت وسیع اور نظر ہمہ گیر ہوگی ان کے عقاید و افعال میں سختی، سنجیدگی اور تنگ نظری کی بجائے لچک، شوخی اور روشن خیالی آجائیگی اور یہ تمسخر کی اعلیٰ ترین اور لطیف ترین شکل ہے۔ ناظرین اگر یہ مضمون پڑھتے وقت گاہے گاہے اپنے گریبان سے تاک جھانک کر لیا کرتے تو انہیں اندازہ ہوجاتا کہ وہ اجنبی سرزمین میں نہیں انکے جذبات کا پاس رکھتے ہوئے ان کی حرکات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اس عنوان پر جن کا حق نہیں ہے انہیں یہ مضمون پڑھنے کا نہ تو استحقاق ہے اور نہ وہ اس استحقاق کے لئے کوشاں ہوں گے۔ ایک ذرا غور سے اپنے احباب آشناؤں اور ہمسائیوں کو دیکھیئے ہر علامت آپ کو کسی نہ کسی وقت

مجسم نظر آئے گی۔ انشاء اللہ۔ اس ذیل میں راقم آپ میں سے بہتوں کے علاوہ اپنا بھی ممنون ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہوگیا ہوگا کہ مسخرگی کسی طبقہ فرقہ سرزمین عمر اور وقت تک محدود نہیں۔ لیکن دنیائے ادب اس لحاظ سے بہت زرخیز ہے۔ عرشِ ادب کے مسخروں سے آپ متعارف ہو چکے اب فرشِ ادب کے مسخروں پر نظر ڈالیئے۔

ایک طبقہ ہمارے شعرا کا ہے جو کلام سنانے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ اور جو کرایہ پر غزلیں لکھوا کر پڑھتا ہے اور لہٰذا ایک گروہ اشعار بیچنے والوں کا بھی ہے اور ایک طبقہ ان رئیسوں کا ہے جو درباری شاعروں کے کلام کو اپنا لیتے ہیں۔ زرہِ عنایت خسروانہ پھر ہماری تنقید اور تمسخر میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک فاضل نقاد اٹھتا ہے اور تمام اساتذہ کا نامۂ اعمال سیاہ کرتا ہے۔ خیال ہوتا تھا کہ ذاتی بغض ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ پس منظر تیار کیا جا رہا تھا ایک گمنام شاعر کو روشنی میں لانے کے لئے۔ ایک دوسرا نقاد ایک استاد کے کلام پر تنقید کرتے کرتے متخیلہ کے بازوؤں پر مجلس آئین سازمیں پہونچ جاتا ہے۔ شعر کو قرارداد سمجھ کر اس میں ترمیم کر دیتا ہے۔ ہمیں ہمدردی ہے۔ اکبرآبادؔ کے "باشندگانِ خصوصی" سے کہ ان کا حق ایک ریاست نے چھین لیا۔ غریب کو نہیں معلوم کہ تنقید اور تولید میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور اساتذہ کو اصلاح دینا نقاد کے فرائض میں نہیں۔

ایک تیسرا نقاد ذوق اور شعور سے زیادہ مزاح اور طنز کو تنقید کے لئے لازم جانتا ہے اور اس شعر کو جو ۲ + ۲ = ۴ کے اصول پر پورا نہ اترے اپنے سستے طنز کا ہدف بنا کر سخن سنجی کا حق ادا کرتا ہے۔ چونکہ یہ تنقید موسمی پیداوار ہے ممکن ہے آپ بغیر مثال کے نہ سمجھ سکیں۔ اساتذہ پر تو ہم قلم اٹھانے سے رہے (ہر مردے دہر کارے) تیسرے درجہ کے ایک شاعر کا شعر ہے۔

وہ اشکوں کو مرے لے کر دامن پہ ذرا جا پنچو
جم جائے تو یہ خوں ہے بہ جائے تو پانی ہے

ہمارا نقاد اس پر اس طرح تنقید کرے گا۔ "شاعر بہت عرصہ سے کہتا چلا آرہا ہے[1] اس کا قائل ہے لیکن یہ ہٹ دھرم دنیا والے مانتے ہی نہ تھے۔ کہ ثبوت؟ بالآخر اس نے ہو چکا تھا محبوب کی عیاری سے بہرہ ور) ثبوت فراہم کرنے کا سامان کر ہی لیا۔ محبوب ...

[1] آگرہ۔

میں تمہارے فراق میں جو خون کے آنسو رویا کرتا ہوں اس کا تم نے آج تک یقین نہیں کیا۔ میرے آنسو کو دامن پر لیکر جاؤ جو بہ جائے تو تم سچے اور جم جائے تو میں۔ تو در پردہ مقصد اس سے شاعر کا یہ تھا کہ خون محبوب کے دامن پر جم جائے اور وہ اسیوقت اسے پولس کے حوالہ کردے کہ یہی ہے میرا قاتل دیکھو اسکے کپڑوں پر میرے خون کے دھبے ہیں۔

شعر میں خامی یہ ہے کہ شاعر نے بعد کے مرحلوں کا ذکر نہیں کیا اور ناظرین کو اس کی جستجو رہی کہ آیا محبوب سشن سپرد ہو سکا یا نہیں۔ یہاں تک ہے ہمارے نقاد مزاج کی پرواز اور یہ ہے اس کی سخن سنجی۔ اس قسم کی تنقید کی دوسری مثال آپ کو اسی مضمون میں غالب کے متعلق ہرزہ سرائی میں ملے گی۔ لیکن راقم نے تنقید کا دعویٰ کب کیا تھا۔

متحرک محقق ہماری یونین کو ایک لمحہ کے لئے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جو وہاں پہنچتا ہے پارس ہو کر نکلتا ہے۔ لیکن پہنچتا جوہر قابل ہی ہے۔ راقم یونین کا خیال کرتا ہے تو تھالی سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا بیگن نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اس قلعہ میں داخل ہونے کے لئے کیا کیا نہیں کرنا پڑتا۔ کتنے طلسمات نہیں توڑنے پڑتے۔ کچھ دنوں کے لئے خود پسندی کو ظاہری طور پر رخصت کر دیا جاتا ہے۔ وقار کو بالائے طاق رکھ کر ہر کس و ناکس کی تواضع سلام سے کی جاتی ہے کبھی یہ عالم تھا کہ احباب کو حسرت تھی کہ آپ تقدیم کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ امیدوار کی شخصیت میں تنزل آگیا ہے غلط ہے۔ کیونکہ انتخاب میں کامیاب ہونے کے بعد یہ کریلا نیم چڑھ جاتا ہے۔ سلام کرنا کرسی کی توہین ہے اور اگر خدانخواستہ کامیاب نہ ہوسکے تو اس "ہوا خیزی" کا تدارک غرور کے جوہر پر صیقل کر دینے سے کیا جاتا ہے۔

کوئی امیدوار کبھی خود "کھڑا" نہیں ہوتا احباب کا اصرار (جس میں مخفی ہے اس کا خلوص) سب جاہ سے بے نیازی اور دوسروں کی نظر میں اس کا استحقاق اور کنارہ کش ہونے کا استحالہ مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن احباب کا اصرار بعض صورتوں میں جب کہ امیدوار کو امیدوار کہنا Humour ; غلط گوئی ہے واقعی وجود رکھتا ہے احباب کی بجائے اگر ارباب اغراض [illegible] سے تو یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا۔ انہیں بھی امیدوار کی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہوتی۔

مقصد ترغیب دینے سے ایک ہنگامہ پسند دل اور ایک شیرینی پسند دہن کی پیاس بجھانا سمجھئے لیکن ان احباب کے کردار پر حملہ کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں کیونکہ بعض انصاف پسند اپنی قوتِ فیصلہ کو شیرینی کے بوجھ کے نیچے دبنے نہیں دیتے اور جس کا کھاتے ہیں اس کے خلاف (گاتے تو نہیں) گنگناتے ہیں۔ سوابق کی تلاش کے لئے انہیں تاریکی میں ٹھوکریں کھانا نہیں پڑتیں مشہور سائنسداں اور ادیب لارڈ چانسلر سر فرانسس بیکن (Sir Francis Bacon) نے اپنی صفائی یہ پیش کی تھی کہ اس نے ایک بڑھیا سے جس کا مقدمہ اس کی عدالت میں تھا روپیہ ضرور لیا لیکن تحفہ سمجھ کر رشوت جان کر نہیں ثبوت یہ کہ مقدمہ کا فیصلہ اس پیرزن کے خلاف تھا۔ سچ ہے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ ایک ادیب کی تردید ادیب ہی کرسکتا ہے۔ سعدی نے کہا تھا۔

ہمہ کس را دنداں بہ ترشی کند شود مگر قاضی را کہ بہ شیرینی۔ آپ نے دیکھا انگلستان کا مایۂ ناز ادیب اور قاضی القضاۃ عملاً شیخ کے اس مقولہ کی تردید کرتا ہے اور زبانا بھی۔ قاضی کے دانت بھی شیرینی سے کند نہیں ہوتے۔

طوالت کا خوف دامنگیر ہے نہیں تو الکشن کی پوری روداد آپ کے سامنے رکھی جاتی کیونکہ وہ تمام وکمال ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔ کارکنوں (Workers) کے تجربات خصوصاً دلچسپ ہوتے ہیں۔ رائے دہندوں میں سے بیشتر مخالف امیدوار کے لئے بلا تامل وعدہ کرلیتے ہیں۔ کچھ ان میں سے خود غرض ہوتے ہیں اور کچھ خیر خواہِ خلق اوّل الذکر اپنے وقت کی تضیع گوارا نہیں کرسکتے اور آخرالذکر کارکنوں کی دلشکنی! اسی طرح صاف انکار کردینے والوں کو بھی دو طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوّل تو وہ غریب جو سادہ لوحی کے ماتحت سچ سچ کہہ دیتے ہیں۔ اور دوسرے فن مباحثہ کے وہ شائقین جو کارکنوں کو اپنے اس شوق کا تختۂ مشق بنانا چاہتے ہیں۔ خاصی رسّا کشی ہوجاتی ہے۔

مباحثہ کا فن برا نہیں لیکن امیدوار کی بدقسمتی ہے اگر اس کے کسی رُکن کو یہ عارضہ کی صورت میں لاحق ہوا ور مزید بدقسمتی اگر بحث کا لہجہ مربیانہ نہ ہو۔ جمہوریت اور خودشناسی کے اجتماع نے ہم کو کسی کی برتری قبول کرنے کے لئے نااہل کردیا ہے۔ جو ہم سے اس کی توقع کرے گا منہ کی کھائے گا۔

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ کڑی چھوٹی جا رہی تھی۔ اسناد (Qualifications
چھپواتے وقت حافظے سے زیادہ ذہن پر تکیہ کیا جاتا ہے۔ کبھی قطرہ کو تالاب سے الگ کر کے دریا بنا کر
پیش کرتے ہیں یعنی خوش قسمتی سے کبھی کسی رسالہ میں آپ کے مضمون کو جگہ مل گئی تو مضمون کا عنوان کتاب کا
نام بن جاتا ہے اور تو مشق مضمون نگار فاضل مصنف۔ اور کبھی اپنے دوستوں سے کچھ اسناد مستعار
لے لی جاتی ہیں۔

عیاں را چہ بیاں۔ لہٰذا (Qualifications) میں حال (یونیورسٹی کی زندگی) کا
ذکر بہت کم ہوتا ہے ماضی کا بہت زور شور رہے۔ (اسکول اور کالج کے بے شمار عہدوں کا مفصل بیان
تاکہ آپ کو تحقیق کی زحمت گوارا کرنے کی جرأت نہ ہو۔ لیکن کبھی کبھی کوئی گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے کے لئے
نکل آتا ہے) گاہ بگاہ مستقبل کی کلک بھی حاصل کی جاتی ہے مثلاً امیدوار کی تصنیف کردہ فلاں فلاں
کتابیں پریس میں ہیں۔

پمفلٹ کی آبادی بڑھانے کے لئے بعض اوقات ایک (Qualifications) سے
قلم لے کر دوسری (Qualification) تیار کر دی جاتی ہے۔ مثلاً کسی امتحان میں آپ کی
شاندار کامیابی آپ کو وظیفہ کا مستحق قرار دیتی ہے۔ کامیابی سے قلم نکلی وظیفہ یابی۔ ہو گئے دو تناور
درخت۔

کارکنوں کے طرزِ عمل میں نکتۂ تمسخر کی بے شمار تفسیریں ملتی ہیں۔ تشریف لائے۔ آپ نے ایک
حسرت بھری نگاہ کتابوں اور ایک ان کے جانشینوں پر ڈالی۔

آپ کا کسی (Candidate) میں (Personal Interest) تو نہیں ہے؟
چھوٹتے ہی یہ سوال ہوتا ہے۔

جی نہیں۔

تو آپ کسے ووٹ دے رہے ہیں۔

"میں نے طے نہیں کیا" جواب ملتا ہے "یہ تو نہیں ہو سکتا"

اگر شومئ قسمت سے آپ یہ کہہ دیں کہ طے کر لیا ہے اور مخالف امیدوار (ب) کے حق میں تو گفتگو کا سلسلہ اور طویل ہو جاتا ہے۔ (ب) کی اسناد کی دھجیاں بکھیر دی جاتی ہیں۔ انھیں مصنوعی بجا اور غیر موزوں ثابت کیا جاتا ہے۔ ایک نام کے علاوہ تمام مندرجہ باتوں سے (ب) کو معصوم بتایا جاتا ہے۔

اگر شروع میں آپ کے منہ سے نکل گیا کہ (Personal Interest) ہے تو اسلام ورنہ یونین کے مفاد کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کی جائے گی کہ (ب) غیر مستحق ہے اپنی قیمتی رائے کو رائگاں نہ کیجئے اس کی قدر پہچانئے۔ ترقی یافتہ ممالک کے باشندوں کی روش سے استشہاد کیا جائے گا۔ ماحصل سب کا یہ کہ (ج) کو ووٹ دیجئے۔

اگر آپ نے وعدہ کا عذر کیا تو یہ رہروانِ راہِ صداقت آپ کو اس بند سے آزاد کرنے کی سعی فرمائیں گے۔ " وعدہ آپ نے اس وقت کیا تھا جب دونوں امیدواروں کے استحقاق سے آپ کماحقہ آگاہ نہیں تھے۔ لہٰذا آپ بلا تامل اسے فسخ کر سکتے ہیں "

بعض کارکن محض صورتِ حالات کا جائزہ لینے آتے ہیں۔ اکثر انتخاب کا نتیجہ انکے ہنر کی ہجو کرتا ہے۔ اس ڈرامہ کا آخری سین دیدنی ہوتا ہے۔ کبڈی اور الکشن میں بہت سے دوسرے مشترک پہلوؤں کے علاوہ ایک پہلو مشابہت کا یہ بھی ہے کہ ہارے ہوئے امیدوار کو مردہ تصور کر لیتے ہیں۔ کبڈی میں تو اسے کھیل میں شرکت سے محروم کر دیتے ہیں جب تک کوئی ساتھی کسی مخالف کی جان قبض کر کے اُسے جلا نہ دے۔ الکشن میں اتنی سریع رستخیز ممکن نہیں۔ یہاں تکفین۔ عزاداری اور ماتم کی تمام رسوم انجام دی جاتی ہیں۔ جنازہ تیار کیا جاتا ہے۔ شعرا مرثیے لکھتے ہیں اور مرثیہ خواں مرے ہوئے امیدوار کے کارکنوں کے کمروں پر جاکر یہ مرثیے نہایت دلسوزی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ مجروحوں کے لئے یہ مراثی نمک داں اور فاتحین اور غیر جانبداروں کے لئے زعفران زار ثابت ہوتے ہیں۔

ایک آدھ روز میں یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے دونوں امیدوار ماتوں بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے باہر نکلتے ہیں۔ ہزیمت خوردہ امیدوار اکثر مردِ میدان شکست کے ساتھ بھی مون منانے چلا جاتا ہے۔

فطرت کی کہانی عورت کی زبانی

از جناب مولوی ظفر حسن صاحب
سبزواری - بدایونی

ہے ذکر ایک روز کا شاہنشہ خرد — تاج ضیائے علم کئے اپنے زیب سر
فوجِ قیاس و وہم و تخیل لئے ہوئے — سیر ریاضِ دہر کو نکلا بکر و فر
اُف رے سمندِ ذہن کی چابک عنانیاں — پہونچا کبھی زمین پہ کبھی آسمان پر
تھا تو نہال فطرت انسان سامنے — ہر چیز اُس نہال میں تھی جاذب نظر
دیکھا لگا کے چشمۂ فکر بلیغ کو — پھولوں سے تھی لدی ہوئی اک شاخ پر ثمر
پتوں میں پھول - پھولوں میں پتے جڑے ہوئے — جگمگ سی تھی نجوم کی اوج سپہر پر
ہر رنگ ہر مذاق کے اثمار نو بہ نو — سیب و عنب سے ذائقہ و بو میں خوبتر
رعنائیِ بہار کا آئینہ دار تھا — اُس شاخ بےنظیر کا ہر پھول ہر ثمر
مستانہ ایک جنبش پیہم ہوا سے تھی — یا شاہد حسین کی لچکتی ہوئی کمر
گھونگٹ میں برگ سبز کے چہرہ چھپا ہوا — جیسے عروس سبز دوشالے میں جلوہ گر

فوارے چھوٹتے ہوئے موجِ شمیم کے
لرزاں وفور رعب سے جھونکے نسیم کے

شاہ خرد تو بحر تحیر میں غرق تھا — فکر بلیغ کو بھی نہ ساحل کا تھا پتا
چلتی تھی کچھ نہ شوخی رفتار ذہن بھی — دھندلی سی ہو رہی تھی مہ علم کی ضیا
اندیشہ و قیاس خیال و گمان و وہم — ہر ایک اِن میں عاجز و مجبور محض تھا
چھایا ہوا تھا چار طرف عالم سکوت — ہنسکر زبان حال سے اس شاخ نے کہا
میں ہوں طلسم فطرت انساں کا ایک راز — ای عقل تجھکو دخل مری انجمن میں کیا

تو جانتی ہے مجھکو سراپا گل و ثمر ۔۔۔ دلکش ہے میری شکل مری بو ہے جانفزا

لیکن کچھ ایسے پھول بھی دامن میں ہیں اگر ۔۔۔ کھولوں تو باغ دہر کی مسموم ہو ہوا

میرے پہلوں میں لذت شہد حیات ہے

لیکن انہیں میں تلخی زہر ممات ہے

انداز و ناز و انس ہے میری سرشت میں ۔۔۔ آدم کا تھی سرور ریاض بہشت میں

پھر خاکدان ارض میں بھی میں رفیق تھی ۔۔۔ یکساں رہی میں عیش و غم و خوب و زشت میں

آباد میرے دم سے ہوا دشت کائنات ۔۔۔ باغ جہاں کی پود رہی میرے کشت میں

ہر حال ہر مقام سب مجھے ساز گار ہے ۔۔۔ یکساں مرا وقار حرم میں کنشت میں

سرتا بہ پا نیاز ہوں لیکن ہوں نازنین ۔۔۔ ایثار میری شان نزاکت سرشت میں

کہتے ہیں لوگ شعبدہ روزگار ہوں

لیکن میں راز قدرت پروردگار ہوں

میں پیکر نیاز ہوں لبریز ناز ہوں ۔۔۔ مستانہ ایک نغمہ سوز و گداز ہوں

میں جذبہ لطیف ہوں مجموعہ حیات ۔۔۔ میں آتش رقیق ہوں با سوز و ساز ہوں

مخلوط حسن و عشق ہے میرے ضمیر میں ۔۔۔ تخلیط کائنات کی دانائے راز ہوں

درج دہان فطرت آدم میں ہوں زباں ۔۔۔ میں جسقدر حقیر ہوں اتنی دراز ہوں

برق تپاں ہے سینہ سوزاں میں دل مرا ۔۔۔ میں گو شرارہ خیز ہوں۔ خرمن نواز ہوں

خوددار بھی ہوں شرم کی پتلی بھی ہوں مگر ۔۔۔ مجبور ہوں وفا سے محبت نواز ہوں

ہوں شمع خون ناحق پروانہ سے بری ۔۔۔ جلکر فروغ انجمن شمع ساز ہوں

بزم طرب میں بربط شیریں نوا ہوں میں ۔۔۔ ماتم کدہ میں مجمر سوز و گداز ہوں

بانگ جرس ہوں قافلہ علم و عقل میں ۔۔۔ ہنگام جنگ زخمیوں کی چارہ ساز ہوں

ہر حال ہر مقام میں مرد و نکی ہوں شر ۔۔۔ عورت ہے میرا نام میں قدرت کا راز ہوں

صابر بھی ہوں غریب بھی ہوں باوفا بھی ہوں
شوخی کروں تو فتنۂ محشر ادا بھی ہوں

ڈھلنا ہر ایک سانچہ میں انداز ہے مرا
مجھ پر درست و چست ہر اک قد کی ہے قبا

نرمی میں پرنیاں ہوں نزاکت میں یاسمن
سختی میں سنگ و آہن و فولاد سے سوا

افسوں مری نگاہ ہے جادو مرا خرام
ہے موہنی مرے لب شیریں کا معجزا

لبریز ہے شراب محبت سے میرا جام
ہو بوالہوس تو زہر ہے اس میں ملا ہوا

مثل مگس مکیں نہال وجود ہوں
انساں کو مجھ سے فیض ہے چھوٹا ہو یا بڑا

چھیڑا مجھے تو خیر نہیں نظم دہر کی
آشوب فتنہ زا ہے پروں کی مرے ہوا

میں زہر کی بجھی ہوئی ناگن بلا کی ہوں
کاٹے کا میرے کوئی نہ منتر نہ کچھ دوا

لب آشنائے شکوہ نہیں کوئی حال ہو
جلتی ہوں۔ اور پھر تبسم۔ یہ ہے ادا

کوہ الم بھی ایک پر کاہ ہے مجھے
ہے چرخ سے بلند کہیں میرا حوصلا

ہوں سخت جان اور نزاکت ہے اسقدر
میرا دل رقیق ہے پانی کا بلبلہ

مر جاؤں ایک دم میں اگر جی میں ٹھان لوں
مردوں کو کب نصیب ہے ذوق فنا مرا

چاہو مجھے۔ تو رحمت پروردگار ہوں
چھیڑو مجھے۔ تو زحمت لیل و نہار ہوں

موجودہ اُردو ادبیات میں نئے میلانات

جناب منظور عالم صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی

ارسطو نے ادب کی تعریف یہ کی تھی کہ ادب زندگی کی نقالی ہے، یعنی ایک حساس انسان اپنے گرد وپیش کے واقعات، زندگی کے نشیب وفراز اور گونا گوں انسانی حالات سے متاثر ہو کر اُن کو ایک خاص طریقے سے قلم بند کرے تو اس کا نام ادب ہے، ادب آئینہ ہے زندگی کا، نمونہ ہے انسانی کردار کا اور حامل ہے انسانی واقعات کا۔ لیکن تاریخ اور کسی مہاجن کی بہی یا کسی مقام کی گائیڈ بھی انسانی واقعات اور اس کے حالات کی حامل ہوتی ہیں تو پھر ادب میں اور تاریخ میں کیا فرق ہے؟ تاریخ بھی کسی قوم کے عروج وزوال کے اسباب ونتائج کو، اس کے تہذیبی ارتقار کو، معاشرتی وتعلیمی حالات کو، مذہبی، روحانی، اخلاقی اور ادبی میلانات کو، اُس قوم کی خوبیوں اور برائیوں کو بیان کرتی ہے تو پھر ادب میں اور تاریخ میں کیا امتیاز ہے، ایک مورخ میں اور شاعر میں کیوں تفادت ہے؟ ادیب کو مورخ پر کیوں فوقیت ہے؟ جنگجوؤں کی قربانیوں کو قوم فراموش کر سکتی ہے قلم کی شوخیوں کو کیوں نہیں؟ کارلائل سلطنت ہندوستان کو چھوڑ سکتا تھا لیکن شیکسپیر کو کیوں نہیں؟۔

ادب خود روح ہے، جمالیات ہے، انسان کی روحانی غذا ہے، ادب خود ترقی ہے، تاریخ اس ترقی کی داستان ہے۔ ادب کا دائرہ لطیف جذبات ولطیف احساسات، اس کا مقصد روحانی انبساط اور نتیجہ وجدانی کیفیات ہے، مورخ صرف پرانے واقعات سے بحث کرتا ہے لیکن ایک شاعر قلب کی گہرائیوں میں جاتا ہے۔ خوشی وغمی کا ایک سماں باندھتا ہے۔ دل کی تانوں میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور انسان اس پیکر خاکی کو بھلا کر اپنے محور کی طرف رخ کرتا ہے۔ مقصد اس کا اعلیٰ ہو جاتا ہے اور مادی دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے اس میں ایک نئی امنگ، نیا ولولہ، ساحرانہ قوت اور بے بہا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ ملکوں کی تاریخ پلٹ دیتا ہے۔ وہ بہادر اور جانباز جو ملک وقوم کے واسطے لڑے اور جنہوں نے دنیا کو

آزادی کا سبق دیا ابتدا میں لوریوں اور رزمیہ گیتوں سے ہی متاثر ہوئے تھے۔

یہ ہے ادب اور یہ ہے اس کا مقصد لیکن اس کی شکلیں؟ ان انسانی جذبات کو بیان کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ جب انسان تہذیب سے ناآشنا تھا، وادئ نیل کی تہذیب معرض وجود میں نہ آئی تھی یونان کی اصنام پرستی ابھی زیب داستان نہ بنی تھی اور ہند کے میدانوں اور پہاڑوں نے کرشن کی بانسری نہ سنی تھی، اس وقت انسان قدرتی مناظر سے اثر پذیر ہو کر اور اپنے جذبات اور قدرتی مناظر میں ہم آہنگی پاکر چند گیتوں میں اس کا اظہار کرتا تھا۔ وہ پہاڑوں، اور سبز وادیوں میں، دریاؤں کے کنارے اپنے ہمدموں سے اپنی کسی محبوبہ سے اپنی محبت چننے پیرائے میں بیان کرتا تھا ــــ یہ تھا اس وقت کا ادب ــــ انسان نے قدم ترقی کی طرف بڑھایا، قومیں پیدا ہوئیں تہذیب و شائستگی کا وجود ہوا، انسان نے لکھنا سیکھا اور دلی جذبات کو سپرد قلم کیا ــــ دنیا کے ابتدائی ادب کا موضوع محبت تھا اور پیرایہ نظم ــــ جب یونانی کسی مرغزار پر کسی دیوتا یا دیوی کے سامنے، جب اہل ہند اپنے کسی راجہ مہاراجہ کے سامنے ناچتے، قربانیاں کرتے، خدا کی پوجا۔ اگ اور باجے سے کرتے اور اپنے کسی نامور کے کارناموں کو دہراتے، اور اس کی تصویر پیش کرتے تو وہ اظہار خیال کا ایک نیا باب کھول رہے تھے ڈرامہ کی ابتدا ہو رہی تھی ــــ نظم کے ساتھ ڈرامہ پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ نثر میں حکایتیں بیان ہونے لگیں اور لکھی جانے لگیں۔ ناول نگاری، مختصر افسانہ نویسی ادب کا جزو لازم ہو گئے، انسانی اقوال و افعال، اس کے مشاہدے، اور تجربات کے بنا پر مقالہ لکھے گئے اور ان پر تنقیدیں کی گئیں۔

انسان کی ترقی فوری نہیں بلکہ بہت آہستہ ہے، جب بعض خیالات کی ترویج کسی قوم میں ہو جائے اور قوم ان سے متاثر ہو تو وہ کسی حادثہ یا انقلاب کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ انقلاب فرانس اگرچہ ۱۷۸۹ء میں شروع ہوا، لیکن صحیح طور سے اس انقلاب کی تاریخ لگانی دشوار ہے ۱۷۸۹ء سے ایک عرصہ پہلے انقلاب فرانس شروع ہو گیا تھا۔ انقلاب فرانس اس واقعہ کا ہی نام نہیں جس نے اخوت، مساوات اور آزادی کے سبق سے شروعات کی اور شہید قوم و وطن نپولین کے ہاتھوں اسکا

خاتمہ ہوا۔ بلکہ والٹیر کی انقلابی تحریروں، اس کی آگ لگا دینے والی تنقیدوں، روسو کے انمول خیالات کی اشاعت، اہل وطن میں اصلاحات کا جذبہ، حکومت کی بے پروائی، اعلیٰ طبقہ کا سماج پر ظلم، رعایا کی زبوں حالی، افلاس اور قحط ــــ ان کا نام بھی انقلاب ہے۔

یہی حال ادب کا ہے، ہم بہت آسانی سے کہہ بیٹھتے ہیں کہ فلاں دور قدیم ہے، اور فلاں دور متوسطین ــ یہ تقسیم ادوار کی نہ تو کسی ایک شخص کی کوششوں کی رہین منت ہے اور نہ چند لوگوں کے متفق ہو کر کہنے کی کہ آج سے فلاں دور کا خاتمہ ہوا اور کل صبح سے نئے دور کا آغاز ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہوا اور نہ ہوتا ہے۔ کسی زبان کے ادبیات عالیہ میں نئے خیالات کی ابتدا، نئی باتوں کا وجود قوم کا ان کو قبول کرنا، اور پھر ان کی توسیع کا نام نیا دور ہے۔ اُردو ادب کے موجودہ دور کی ابتدا تاریخ مقرر کرنے سے نہیں ہوتی بلکہ اہل قوم کا اُردو ادب میں ایک نیا انقلاب پیدا کرنے کے معنی موجودہ دور کے ہیں۔ یہ انقلاب کم و بیش پچاس سال سے ہو رہا ہے، بعض حضرات جو تاریخ کی ماہیت سے ناواقف ہیں ہر دور کی ابتدا کسی شخص کی پیدائش، یا کسی ایک حادثہ سے کرتے ہیں۔ عموماً موجودہ اُردو دور کی ابتدا اس وقت سے کی جاتی ہے جس وقت حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" شائع کیا لیکن یہ ایک تاریخی اور فنی غلطی ہے۔

انگریزی حکومت، انگریزی تعلیم کے اثرات، مغربی تہذیب اور اس کا قبول سائنس کی ایجادیں اور ان کا ملک میں رواج صحیح طور سے اس دور کے اسباب ہیں۔

دور مغلیہ کے بعد ہندوستان سیاسی اور معاشرتی بحران سے گذرا ہے۔ مرکزی حکومت کا عدم وجود، ملک میں طوائف الملوکی، جان و مال اور عزت و ناموس کا خطرہ، ملک میں افلاس، سماجی دورنگی اور اختلافات، تعلیمی فقدان، اخلاقی پستی ناامیدی اور مایوسی اور ان کے بعد ایک نئی حکومت کا قیام اور نئی زندگی اور فرنگی تہذیب ــــ ان سب نے ملک کی کایا پلٹ دی، زندگی میں نئی امنگ پیدا ہوئی۔ حالات نے نئی صورت پکڑی، ملک کا کوئی فرد اور کوئی شے ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔

اور جب زندگی میں انقلاب ہو رہا ہو تو ادب کیوں کر بچ سکتا ہے ادب میں ہماری زندگی سے زیادہ انقلاب ہوا۔

پہلی اور نمایاں صورت اس انقلاب کی حقیقت نگاری ہے اور یہی سب سے بڑا فرق ہمارے آج کے اور کل کے ادب میں ہے، اور یہ یورپی تعلیم، تہذیب اور ادب کا ثمرہ ہے۔

گذشتہ صدی سے دنیا کے ادبیات عالیہ میں جو نمایاں چیز ہم کو نظر آتی ہے وہ حقیقت نگاری ہے۔ مساویانہ حقوق اور آزادی کی جنگ کے ساتھ ہی یہ تحریک شروع ہوئی، سیاسی انقلابات سے قبل اہل مغرب اگرچہ کرب اور بے چینی کی زندگی گذار رہے تھے۔ لیکن حقوق انسانی کی طرف عوام کی توجہ مبذول نہ ہوئی تھی۔ بادشاہوں کی جاہ وحشمت، امیروں کا رعب، محلات کی خوبصورتی اور قلعوں کا استحکام، یہ سب عوام کے لئے جاذب توجہ تھے۔ پارسا لوگ اپنے بچوں کو سکھایا کرتے تھے کہ امیر محل میں رہیں گے اور غریب جھونپڑے میں، نیک جنتی ہیں اور بُرے دوزخی۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ ان باتوں کو تنقید کا نشانہ بنا سکے، لیکن "حقوق انسانی کے اعلان" کے بعد اہل یورپ نے سمجھ لیا کہ جو بادشاہ ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو گدا ہے وہ بھی آدمی۔ جب تک اس دنیا میں ہیں سب یکساں ہیں۔ ان خیالات نے زندگی کے جملہ امور پر گہرا اثر ڈالا۔ مردوں کے حقوق کے ساتھ عورتوں کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ شریف اور رزیل کا امتیاز اٹھنے لگا۔ بیسوا کی حمایت میں آوازیں اٹھیں اور سوسائٹی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ نثر میں، نظم میں، مصوری اور بت تراشی میں یہ تحریک شروع ہو گئی۔ اب تک جو مجسمے بنائے جاتے تھے وہ کسی امیر یا بادشاہ یا کسی جنرنیل کے ہوتے تھے۔ یا عشق ومحبت کے۔ اس فن میں غالباً سب سے پہلا شخص ایک فرانسیسی روڈان نامی تھا۔ جس نے اس امر کا اعتراف کیا کہ دنیا میں ان باتوں کے علاوہ درد ودکھ اور مصیبتیں بھی ہیں۔ بچپن اور جوانی سے سب خوش ہیں، لیکن بڑھاپے سے کوئی خوش نہیں۔ ہنس مکھ آدمی سب کو بھاتا ہے لیکن بیمار کسی کو نہیں۔ اپنے ان خیالات کو روڈان نے کئی ایسے مجسموں میں ظاہر کیا جو زندگی کے درد بھرے مجسمے ہیں اس کا ایک مشہور بت ایک طوائف کا ہے۔ اور اس وقت کا نقشہ ہے جب کہ طوائف اپنی جوانی اور

خوبصورتی سوسائٹی کے گندے اور شرمناک طبقے کی نذر کرکے بوڑھی اور بیماریوں کا شکار ہو گئی۔ دنیا پہلے ہی اس کو ذلیل سمجھتی تھی لیکن اب اس کو آبادی سے نکال دیا گیا اور وہ ویرانے میں تنہا، لاچار، مفلس اندھی آلام و مصائب کا شکار اپنی بدقسمتی پر آنسو بہا رہی ہے۔ یہ ایک دردناک مجسمہ ہے، بعض ناقدین نے روڈان کے ان خیالات پر سخت نکتہ چینی کی، لیکن بعد میں یہ احساس قوی ہو گیا، کہ ہم حقایق سے اور ان افعال سے جو خود ہمارے کئے ہیں کیوں آنکھیں بند کریں مجرم ہمیشہ اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ جرم اس کو بتلایا جاتا ہے تو وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتا ــــ دنیا اور اس کے اکثر لوگ بھی مجرم ہیں اور اگر ناول نگار اپنے افسانہ میں، شاعر اپنے شعر میں، مصور اپنی تصویر میں ان واقعات کی عکاسی کرے جس کے افشا کے بعد جھرجھری اور ندامت پیدا ہو تو ہم لوگ ان کی ستر پوشی کیوں کریں، کیا ہمارا فرض یہ نہیں کہ ان عیوب کا پردہ چاک کرکے عوام کی نظروں میں لائیں اور لوگوں کو ان کی فرد جرم سنائیں۔

رفتہ رفتہ اس حقیقت نگاری نے مغربی ادبیات میں اتنا زور پکڑا کہ جب تک ادب پارۂ زندگی نہ ہو نہ اسے پسند کیا جاتا اور نہ اس کی کوئی وقعت ہوتی۔

اور چونکہ مغربی تہذیب کے بعض خصائل ہمارے ادب کا گہوارہ ثابت ہو رہے ہیں یہ لازم تھا کہ یہ تحریک ہمارے ہاں بھی زور پکڑتی اور ہوا بھی ایسا ہی۔

انسان کے افعال و اقوال، اس کے جذبات و حالات اور اس کے کردار و خیالات کو ایک خاص پیرائے میں پیش کرنا حقیقت نگاری ہے، ــــ واقعات و خیالات ان افراد کے جن کو ہم انسان کہتے ہیں اور جو اس زمین پر بستے ہیں، اور جن سے ہم روزانہ گفت و شنید کرتے ہیں۔ ان حالات کا جن سے ہماری دنیا میں بسنے والوں کا کوئی تعلق نہ ہو، جن کو نہ کانوں نے سنا ہو اور نہ آنکھوں نے دیکھا ہو، نہ حقیقت نگاری ہے اور نہ صحیح ادب۔ پرانے افسانوں کو پڑھیئے، الف لیلہ اور طلسم ہوش ربا کی حکایتوں کو دیکھئے، ان میں کتنی باتیں ایسی ہیں جو آپ ہم پر گذری ہوں گی، اور کتنے کردار ایسے ہیں جنکے لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسانی ہیں۔ کرداروں کے نام انسانی ہیں ان کے افعال و اقوال انسانی نہیں۔ دیو پریوں کے قصے، اڑن کھٹولے، آدمی کا بندر ہو جانا، شیر کا آدمی ہونا، سیمرغ، جادو کے قلعے آن

ہوتی ہیں۔ ہم افسانوں سے ان کا دور کا بھی کوئی رشتہ نہیں۔ جناتوں اور پریوں سے اتنی ملنے کی آرزو ہے لیکن آج تک انکی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ یہ حقیقت نگاری نہیں بلکہ دماغی عدم توازن ہے۔

صحیح ادب وہ ہے جو خود ہماری تصویر کشی کرے۔ آجکل کا ادب دیکھئے۔ کوئی نظم کوئی ناول، یا کوئی مختصر افسانہ پڑھئے یہ بات صاف عیاں ہو جائے گی کہ یہ سب ہماری زندگی کے ٹکڑے ہیں ——— ممکن ہے کہ بہت سے واقعات ہم پر ہی گذرے ہوں، ان افسانوں کے کردار ہم ہوں یا ہم انکو پہچان سکتے ہوں۔ آجکل کوئی گل بکاولی کی تلاش میں نہیں نکلا کرتا یا سم سم کہنے سے کسی خزانہ کا دروازہ نہیں کھلتا۔ طوطے میں انسان کی جان نہیں ہوتی، ——— بلکہ ان ماں باپ کے جذبات جن کا اکلوتا بچہ نازونعم سے پالا ہوا جنگ کے نذر ہو گیا ہو۔ وہ جوان لڑکی جو ایک بوڑھے سے بیاہ دی گئی ہو، اس کی آرزؤں کا خون، وہ دوشیزہ جس کو سماج کے ظلم سے بیسوا بننا پڑا ہو اس کی بربادی اور سیاہ کاری، ان غریبوں کی زبوں حالی جن کو مفلسی نے قعر مذلت میں ڈال دیا ہو، معصوم بچوں کی گداگری، امراء کے بچوں کا لاڈ پیار اور ان کی غلط تربیت، ہماری حرص، ہمارا ایک دوسرے پر ظلم ——— یہ ہے حقیقت نگاری جس کو ہمارا ادب پیش کر رہا ہے۔

ہندوستان کا موجودہ زمانہ باعتبار معاشرت و سیاست نہایت ہی اہم ہے۔ حکومت کے مظالم نے ہماری سوسائٹی میں جو مسائل پیدا کر دئے ہیں ان کا حل تو کجا ان کا بیان کرنا ہی نہایت مشکل ہے، شرفاء کی بدحالی اور غرباء کی پستی نوع انسان پر ایک بدنما داغ ہیں، آپس کی فرقہ وارانہ کشیدگیاں اور ان کے سبب سے معاشرتی بندھن نئی نئی پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں۔ حکومت کے بے انتہا ٹیکس اقتصادی انحطاط، افلاس میں روز بروز اضافہ کر رہے ہیں، ان سب کی بناء پر ملک میں ایک بے اطمینانی ہے، زندگی اجیرن ہے، بے روزگاری نے ہمتیں پست کر دی ہیں، نوجوانوں میں مایوسی زیادہ ہے خوشی و انبساط کم۔ عمل کا فقدان ہے، غیر ارادی امیدوں کی بہتات۔

ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ جو مسائل صنعتی و تجارتی انقلابات کی وجہ سے یورپی ممالک میں نمودار ہوئے اور آج تک ان کا صحیح حل سوائے خون اور غارتگری کی شکل کے نہیں ہوا، ان ہی سے آج

اس ملک کو دوچار ہونا پڑا ہے، اگر ایک طرف بڑے بڑے سرمایہ دار سانپ کی طرح دولت پر قابض ہیں تو دوسری طرف وہ انسانی ریوڑ ہے جو صبح سے شام تک کارخانوں میں کام کرتا ہے۔ لیکن اس کو اس کا صلہ نہیں ملتا۔ اس کی عرق ریزی سرمایہ داروں کی خواہشوں کو پورا کر رہی ہے۔ اس کی بیوی بچے بھوکے مر رہے ہیں، سردی میں اکڑ گئے ہیں، صحت جواب دے چکی ہے، اور بیماریوں کا شکار ہیں۔ دوسری طرف ریل، ہوائی جہاز، ریڈیو، جگمگاتی ہوئی ہوٹلیں، عیش پرستی، معصوموں کی عصمت دری اور شراب نوشی ——— یہ ہے ہماری سماجی زندگی، ہماری بستیوں کو دیکھئے، تنگ و تاریک گلیوں میں تنگ و تاریک مکان، ایک کمرے میں پورا خاندان، صفائی کا نام نہیں، گندگی بے شمار، دوسری طرف عالیشان کوٹھیاں اور چوڑی سڑکیں، باغ اور پارک —— یہ ہے ہماری زندگی کا مرقع آجکل اردو کا کوئی سا افسانہ یا نظم پڑھئے، آپ قوم کی حالت کی سچی تصویر پائیں گے۔

لیکن کسی شے کو اعتدال سے زیادہ استعمال کیا جائے تو دل میں کراہت پیدا ہو جاتی ہے، ہمارے ادیب حقیقت نگاری کر رہے ہیں، لیکن ان کی قلم کی شوخیاں گستاخی تک پہنچ جاتی ہیں، اور اخلاق کا دامن ترک کر دیتی ہیں، بعض حضرات آرٹ اسی کو سمجھتے ہیں کہ جو کچھ گذر رہا ہو اس کو من وعن بیان کیا جائے۔ لیکن ادب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ واقعات کی جانچ پڑتال کے بعد ان کے بیان میں کسی اضافہ اور کمی کا ہونا لازمی ہے، "حسن و شباب" ایک افسانہ ساقی، میں شائع ہوا، ایک شخص ذوالفقار اپنی بیوی کی بیماری اور اپنی سالی کی معصومیت سے بے جا فائدہ اٹھا کر ایک ناجائز حرکت کرتا ہے، لیکن افسوس افسانہ نگار نے اس واقعہ کے بیان میں اشارۃً یا کنایۃً کافی نہ سمجھا، بلکہ رقم طراز ہیں: "ذوالفقار نے آگے جھک کر اس کے لبوں میں اپنے لب پیوست کر دئے، اور اس کے ہوش و تعقل کو سن کرکے اپنی قوی گرفت میں اسے بستر پر دراز کر دیا، پھر اس کے ہاتھ اس کے جسم کو کپڑوں کی قید سے آزاد کرنے لگے اور رانگیں ساقہائے سیمین سے مس ہو کر جوانی کے شرارے بکھیرنے لگیں" اس میں شک نہیں کہ حق کڑوا ہوتا ہے اور اس قسم کے واقعات ہر روز ہوتے ہوں گے، لیکن سنجیدہ ادب اس بارگراں کا متحمل نہیں ہو سکتا، یہ تفصیل کسی کوک شاستر کے لئے زیادہ موزوں تھی —— وہ

حقیقت نگاری جو متانت کو چھوڑ دے دراصل عریاں نگاری ہے، پچھلے زمانہ میں شعراصرف "بوس وکنار" پر ہی اکتفا کرتے تھے اور وہ بھی پردے میں۔ مگر اس زمانہ کا ادیب اس قدر بے باک ہے کہ اس عریاں داستاں کو منظرِ عام پر لائے بغیر نہیں رہتا۔ اگرچہ یہی طریقہ بعض یورپی مصنفین کا بھی ہے، لیکن ہماری اور اُن کی معاشرت میں زمین آسمان کا فرق ہے ——— ہمارے افسانہ نویس اس امر سے بے رخی برتتے ہیں کہ یہ تفصیل ہمارے نوجوانوں پر کیا اثر ڈالے گی۔ ان کے تیز اور نئے جذبات کیا برانگیختہ نہ ہوں گے، اور کیا وہ خود بھی ایسے ہیرو بننے کی کوشش نہ کریں گے اور زیادہ مہلک نتیجہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ ہماری لڑکیاں ایسے افسانے پڑھتی ہیں، ایسے افسانے مسلسل پڑھنے کے بعد نتائج ظاہر ہیں۔

نہ صرف حقیقت نگاری اور عریاں نگاری بلکہ ایک اور جزو ہمارے ادب میں کارفرما ہے ———

یورپی ادب میں جمہوری خیالات کی ترویج کے ساتھ ادب میں ایک نئی صورت پیدا ہوئی۔ پہلے زمانہ میں عموماً بادشاہ حکومت کرتے تھے، اور ان کے امرا زبردست قلعوں میں رہا کرتے تھے۔ ادیب کی نگاہ میں کل کائنات یہی تھی، اس کا زورِ قلم بادشاہوں کے قصوں اور امیروں کی حکایتوں کے بیان کرنے میں صرف ہوتا تھا، ہمارے ہاں بھی ہر کہانی "کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا" سے شروع ہوتی جس کی سات لڑکیاں ہوتیں جن میں چھوٹی ہمیشہ عقلمند ہوتی تھی۔ لیکن نئے زمانہ کیساتھ نہ بادشاہ رہے، اور نہ زبردست قلعے، یورپ میں نہ نائٹ رہے، اور نہ ان کے کارنامے۔

لیکن گذشتہ پچاس برس سے ہمارے اہلِ قلم نے اپنی توجہ حقائق اور عوام کی طرف کی ہے کل کا ادیب رہتا تھا اس زمین پر لیکن آنکھیں آسمان پر ہوتی تھیں، لیکن آج کا ادیب نہ صرف اس زمین پر رہتا ہے بلکہ اپنے ماحول پر ہی نظر رکھتا ہے ——— نظیر اکبرآبادی کی وہ سیدھی اور سچی نظمیں جن میں جمہوریت کا عنصر غالب ہے اس کے زمانہ میں اہلِ ذوق کی تضحیک کا نشانہ تھیں، لیکن اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو امیر ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو غریب ہے وہ بھی آدمی ہے۔

یہ ایک امرِ مسلمہ ہے کہ وہ تحریکیں جو کسی قوم کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیں، عموماً ان کی ابتدا نہایت مایوس کن ہوتی ہے۔ اور عام و خاص اس کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اور اس سے بے اعتنائی

بستے ہیں، ہٹلر نے جب نازی پارٹی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت اس کی حقیقت ایک سٹری سے زیادہ نہ تھی۔ حکومت کی قوت کو متزلزل کرنا اور اس کو ڈھا کر ایک نیا آرڈر قائم کرنا مجنونانہ حرکت تھی، کچھ ایسی ہی مثال موجودہ اردو ادب کی ہے جب میاں نظیر اکبرآبادی نے اردو شعرا کی ڈگر سے ہٹ کر ایک نئی راہ سنبھالی اور شاعری میں عمومیت اور جمہوریت کو دخل دینا شروع کیا تو نہ ثقات کی نظروں میں انکی شاعری شاعری تھی اور نہ عوام میں اس کی قدر تھی۔ لیکن تبدریج قوم سیاست کی طرف مائل ہوئی۔ حکومت خوداختیاری کی جنگ اور معاشرتی کمزوری اور زبوں حالی نے سوچنے والوں کے دماغ پر ایک ضرب کاری لگائی اور ہم میں یہ احساس ہو چلا کہ صحیح ادب اور ترقی کے معنی یہ ہیں کہ ادب کو قوم کے حالات کا آئینہ ہونا چاہیئے ——— جب کوئی خیال ملک میں بڑھتا جائے تو اس کے نتائج اکثر دو ہوا کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ادب نو کی بنیادیں نہ صرف مضبوط ہوتی جاتی ہیں بلکہ اس قسم کا ادب زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انتہا پسند لوگ بھی اس میں پیدا ہو جاتے ہیں' اس امر کو واضح کرنے کے لئے بہترین مثال انگریزی ادب میں اس دور کی ہے جس کو "رومینٹک" دور کہا جاتا ہے اس دور کے مشہور شعرا ورڈس ورتھ، کولرج، شیلی، کیٹس اور بائرن وغیرہ تھے، یہ سب شعرا ایک نئے آرٹ اور شاعری میں ایک خاص صنف کی تخلیق کے باعث ہیں، لیکن ایک مشہور انگریزی نکتہ چین کی یہ رائے ہے کہ ان شعرا کا زیادہ کلام زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے گا' اور یہ کسی حد تک ٹھیک ثابت ہوا۔ جب حالی اور اُن کے رفقا نے پرانی باتوں کے خلاف مغربی ادب سے متاثر ہو کر جہاد کیا اور ایک نئی شاہراہ کھولی' تو اس شاہ راہ پر چلنے والے بہت سے پیدا ہو گئے' اور اردو میں اس نئے باب کے کھلتے ہی مختلف قسم کی نئی آوازیں سُنائی دیں۔ اس زمانہ کا صحیح نمائندہ اکبرالہ آبادی ہے۔ لیکن یہ لوگ انتہا پسند تھے' جس چیز سے اکبر اور اُن کے ہم عصر شعرا اور ادیب متاثر ہوئے تھے، وہ اگرچہ قوم کے لئے نہایت خطرناک تھی، لیکن وقتی بھی تھی شاعر کو چاہیئے کہ وہ ان امور کو چھیڑے جو کہ عمومی ہوں اور رہتی دنیا تک قائم رہیں۔ اکبر کا مسلک اگرچہ اس کے زمانے میں اور اب تک' اور غالباً جب تک مغربی بول بالا اس دیس میں رہے گا اس وقت تک۔ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ لیکن اس کے بعد اکبر ماضی کے

افسانے کے سوا نہ رہے گا۔ شاعر کی عظمت اور اس عظمت کا قیام اس کے کلام کے نفس مضمون سے ہوتا ہے۔ اکبر کا نفس مضمون تھا، اُس مغربی معاشرت کے رکھ رکھاؤ کی تنقید جس کو اس غلام ہندوستان نے کچھ تو کل جدید لذیذ سمجھ کر اور زیادہ تر آقایان مغرب کے دل لبھانے اور اُن کو خوش کرنے کی خاطر اور بدرجہ مجبوری اختیار کر لیا تھا کچھ عرصہ بعد سیاسی سرگرمیوں اور انگریزی تہذیب کی ظاہر داریوں کی وجہ سے تنفر پیدا ہو چلا، اگرچہ اکبر کے کلام نے اس انقلاب پیدا کرنے میں بہت کچھ حصہ لیا، لیکن اب اس کا کلام تفنن طبع کا ذریعہ ہے ـــــ لیکن پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہر دور میں ایک انتہا پسند فرقہ پیدا ہوتا ہے اس کے بعد اعتدال شروع ہوتا ہے۔ اکبر اگر موجودہ دور کا انتہا پسند شاعر ہے تو اقبال اعتدال پسند شاعر ہے۔ جو رنگ اکبر کا تھا اقبال نے بھی اختیار کیا لیکن وہ رنگ پھیکا رہا، قوم اب ایسے کلام کے واسطے تیار نہ تھی، طغیانی کے بعد لوگ اس چیز کے متلاشی تھے، جس میں سوچنے کا موقع ملے، جو بڑے مسائل کو چھیڑے، لاطینی شاعر ورجل کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ اس کا دماغ دنیا کو متحرک کر سکتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ورجل نے شاعری میں ان مسائل پر بحث کی ہے جو ابدی ہیں اور جن پر ہر ذی حس انسان توجہ دے سکتا ہے ـــــ بڑے شاعروں کے کلام میں یہی خوبی ہونی چاہیئے۔ وقتی اور لوکل باتیں دیر پا نہیں ہو سکتیں، اقبال نے اکبر کی راہ سے بغاوت کی اور ان باتوں کو اٹھایا جن کو عوام سمجھ نہیں سکتے، جو خوش گپیوں میں کام نہیں آ سکتے، اور وقتی نہیں ہو سکتے۔ اقبال کی شاعری کائنات کے اہم مسائل پر تبصرہ ہے، اس کا کلام دنیا کو متحرک کر رہا ہے۔ اور آئندہ نظام کے تجدید میں اقبال کو مشعل راہ بنایا جاتا ہے، لیکن اقبال نے جن امور کو بیان کیا وہ ہر شاعر کا کام نہیں۔ اقبال کی شاعری سے اور خصوصاً اس کے فلسفہ سے موجودہ اُردو شعرا اس قدر متاثر ہوئے کہ اس رنگ میں کہنے کی کوشش کرنے لگے، لیکن جب قابو حاصل نہ کر سکے تو دوسری طرف مڑ گئے اور جو زیادہ سود مند ثابت ہوا۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے اس لئے کہ جن باتوں کو اقبال نے سلجھایا ہے ان کو اگر ہر شاعر حل کرے تو وہ اپج پیدا ہو نہیں سکتی۔ چبائے ہوئے نوالے ہی رہیں گے اور پھر بات تو یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک

ہی شاعر پیدا ہوتا ہے۔ ایک دور میں ایک ہی شخص قوم کو ترقی دیتا ہے، اور ایک زمانہ میں ایک اولوالعزم انسان دنیا کو زیر و زبر کرتا ہے، یہ قانون قدرت ہے جو اٹل ہے اور جس میں چون و چرا کی مطلق گنجائش نہیں ـــــ ہاں تو اُردو کے موجودہ شعرا اقبال کی صحیح تقلید تو نہ کر سکے لیکن اُن کو تقلید میں ایک ایسا رنگ ہاتھ آگیا اور اس میلان نے ایسی ترقی کی کہ اقبال کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ـــــ کوہ ہمالیہ کی طرح اقبال اپنی وسعت اور عظمت کے ساتھ کھڑا ہے۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے پہاڑیوں کا ہمالہ سے صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ اسی سلسلہ کے ہیں خواہ اُن کی سخت اور محل وقوع کہیں ہو۔ یہ رنگ اُردو کے شعرا کا وہی ہے جو انگریزی کے اس زمانے کے شعرا کا ہے "مزدور، کسان آیا، ننھے چھوٹے غریب بچے" آجکل کے شاعروں کے موضوع ہیں، جن حضرات نے انگریزی موجودہ شاعری کا مطالعہ کیا ہے، اور اس پر تنقیدیں پڑھی ہیں وہ باسانی کہہ سکتے ہیں کہ ایسی ہی شاعری اُردو میں کی جا رہی ہے۔ اور اس قسم کی تنقید اس پر بھی ہو سکتی ہے، انگریزی شاعر میس فیلڈ حقیقت نگاری کا علمبردار ہے، اس کا کلام کیا ہے عریاں حقیقت نگاری، جس کو بعض ناقدین نے کریہہ الفاظ میں یاد کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ اس نے جو کچھ دیکھا وہ لکھ دیا۔ بقول ایک نقاد اس کی شاعری کیا ہے کسی میونسپل انسپکٹر کی ڈائری ہے یا بوچڑ خانہ کی تفصیل ـــــ شاعری میں حقیقت کے ساتھ جمالیات لازم و ملزوم ہے۔ لفظ شاعری کے ساتھ ہمارے دماغ میں ایک وجدانی کیفیات کا تصور قائم ہو جاتا ہے، غنیمت ہے کہ اُردو کے بعض شاعروں نے اس پہلو کو فراموش نہیں کیا ہے اور حقیقت نگاری کے ساتھ شعریت بھی اُن کے پیشِ نظر ہے، احسان بن دانش کو ہم مزدوروں کا شاعر کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کی شاعری میں قابل توصیف بات یہ ہے کہ حقیقت کے ساتھ تخیل کی چاشنی بھی ہے۔ جوش نے کسان پر مشہور نظم لکھی، اگر میس فیلڈ کو یہ موضوع دیا جائے تو وہ یہی لکھے گا جو ایک عام آدمی کسان کو دیکھ کر دوسرے سے اس کی حالت بیان کرے۔ کسان اس کی نگاہ میں "ارتقاء کا پیشوا اور تہذیب کا پروردگار" نہیں ہو سکتا۔ شام کی سرخی کسان کی زبوں حالی کی خوں چکاں داستاں نہیں ہو سکتی، اگر بعض شعرا جمالیات اور شعریت کو فراموش کر بھی دیتے

میں تو ان کی شاعری کی نہ تو عزت ہے اور نہ قدر۔ قدر صرف اتنی ہے کہ کسی "ادبی و علمی مجلہ" کے زینت ہو جائیں۔

اُردو شاعری کے لئے ابھی کافی میدان ہے۔ اُردو شعراء اور مصنفین کو ابھی بہت کچھ کرنا ہوگا تب صحیح معنی میں اُردو کی شاعری اس ملک کی عزت کا باعث ہوگی۔ ادب کی ترقی عموماً دو طرح سے ہوتی ہے۔ اول قوم و ملک میں نئے خیالات کی ترویج ہو اور دوسرے صحیح تنقید ہو۔ ہمارے ملک میں خیالات کی ترویج ہو رہی ہے۔ اہل ملک میں احساس کا مادہ شدید ہو گیا ہے۔ لیکن عمدہ نکتہ چینیوں کی کمی ہے۔ تنقید ابھی یک طرفہ سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ بعض رسائل اور بعض اہل قلم نکتہ چینی کے صحیح معنی سمجھ کر اس پر عمل کر رہے ہیں۔ لیکن اب بھی سخت ضرورت ہے کہ لوگوں کو بتلایا جائے کہ دوسروں کو فحش الفاظ میں یاد کرنا، دوسرے کی پگڑی اچھالنا۔ اور کیچڑ پھینکنا تنقید نہیں، برائی کے پہلو کو ہی پیش نظر رکھنا، جو خرابیاں نظر آ رہی ہیں ان پر ہی اپنی توجہ صرف کرنا تنقید نہیں، تنقید کی تعریف ایک مشہور انگریزی انشا پرداز نے یوں کی تھی کہ حسن کا مشاہدہ کرنا، اس خوبصورتی کو پرکھنا اور اس پر قلم اٹھانا تنقید ہے۔

کتنے ادیب ہیں جو دوسروں کی خوبیوں کو ظاہر کرتے ہیں اور ان کو منظر عام پر لاتے ہیں تنقید جو نہایت وسیع لفظ ہے نہ صرف ادبیات کے لئے مفید ہے بلکہ زندگی کے ہر پہلو کے لئے ناگزیر کسی شئے کے محاسن و عیوب کو معلوم کر کے اس کو دوسروں کو بتلانا نہ صرف افراد کے لئے بلکہ پوری قوم کے لئے ممد حیات ہے۔ مگر ہماری بدنصیبی ہے کہ جس طرح سیاست میں فرقہ بندیاں ہیں اور اس کے مطابق نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں اسی طرح ایک ادیب بھی دوسرے کو اپنے قلم کا نشانہ بناتا ہے۔ تنقید ــــ وہ تنقید جو ادب، سیاست، معاشرت، مذہب کی روح رواں ہو ــــ بے لاگ ہونی چاہئیے۔ اور یہی مشکل کام ہے، لیکن اس دشواری کو دیکھ کر منہ نہ موڑنا چاہئیے۔ اُردو زبان کے موجودہ دور کا جائزہ لیجئے، تو یہ کہنا پڑے گا کہ سوائے دو ایک بزرگوں کے جنہوں نے خود کو اُردو میں فنا کر دیا ہے، ہمارے جملہ نقاد تعمیری پہلو سے روگرداں ہو کر تخریب کی

طرف سمٹ آئے ہیں، سرسید اور اُن کے زمانے کے ادیب مثلاً حالیؔ، شبلی اور آزاد یا بعد کے لوگوں میں عبدالحق کی تنقیدات دیکھئے کہ جو کہنا چاہتے تھے کہہ بھی گئے اور معلوم بھی نہیں ہوا۔ مگر آج کل نظر اس بات پر ہے کہ یہ دیکھنا چاہئیے کہ فلاں شاعر یا ادیب میں کیا خامیاں ہیں، اور اگر کسی شاعر یا افسانہ نگار میں کوئی کمزوری نظر آگئی تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے۔ اور یہ نہایت ہی مذموم فعل ہے۔

نقاد کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز پر وہ قلم اٹھائے اس سے وہ کماحقہٗ آگاہ ہو، دو ایک زبانوں میں دسترس رکھتا ہو، اور اس کے بعد بلا رو رعایت، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ نکتہ چینی کی جائے۔ اچھی چیزوں کو پرکھا جائے خرابیوں کو منظر عام پر لایا جائے۔ نیا راستہ دکھایا جائے۔ خامیوں کو رفع کرنے کی ترکیب بتائی جائے۔ اور یہ سب استقلال اور شائستگی سے ہو۔ تنقید خود ادب ہے اور ادب قوم کے خیالات اور خیالات میں جب تک شائستگی اور سنجیدگی نہ ہو۔ وہ دنیا کے ادبیات میں جگہ نہیں پا سکتی اس لئے تنقید کے لئے ضروری ہے کہ وہ وقتی نہ ہو بلکہ بذات خود ایک نمونہ ہو اس قوم کے جذبات کا، اس کی تہذیب کا اور اس سے میلانات کا۔

اثر خامہ راسخ الکلام وسیع النظر مولنا قمر الحسن صاحب قمر بدایونی مرحوم و مغفور

نفرت گناہ ہے نہ عداوت گناہ ہے
اس عہد میں تو صرف محبت گناہ ہے

ارمان ہے گناہ نہ حسرت گناہ ہے
تم سے امید لطف و عنایت گناہ ہے

دل دیکھے ان کو جان مصیبت میں پڑ گئی
اب اپنی زندگی کی حفاظت گناہ ہے

میرا خیال غیر کی نسبت نہ پوچھئے
اس کا جواب یہ ہے کہ غیبت گناہ ہے

تم میں بھی یہ صفت ہے تو اب تم سے کیا کہیں
ہم تو یہ جانتے تھے کہ نخوت گناہ ہے

صحرا کو جائیں کوچۂ دلدار چھوڑ کر
وحشت کا یہ اثر ہو تو وحشت گناہ ہے

پوچھا ستم ثواب ہے بولے نہ ہو تو کیا
پھر بھی ستمگری کی شکایت گناہ ہے

اب تک تو دوستوں سے عداوت گناہ تھی
اب اپنے دوستوں سے محبت گناہ ہے

بد قسمتی سے خواہش مافات کیا قمر
میرے لئے تو ذکر مصیبت گناہ ہے

غزل

جناب پریم بہاری لال۔ رواں بی۔ اے (علیگ) متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہر اک ذرہ کو دل ہر دل کو پر تنویر کرنا ہے
مرتب پھر نظامِ حسنِ عالمگیر کرنا ہے

بیاں افسانہ ہائے شوق کی تفسیر کرنا ہے
محبت کی حدوں کو اور وسعت گیر کرنا ہے

وہی اک خواب جس نے حسن کی فطرت بدل ڈالی
اسی اک خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا ہے

غزل

جناب محبوب الحسن صاحب ارشدی بدایونی

اسیرِ غم آشیاں اور بھی ہیں — ہمارے شریکِ فغاں اور بھی ہیں
تمہیں باوفا جاننے کے علاوہ — مجھے کچھ غلط فہمیاں اور بھی ہیں
چمک پھر چمک برقِ حسنِ تجلّی — طلبگار جلوہ یہاں اور بھی ہیں
شکایات جور و ستم پر ہی کیا ہے — میرے دل میں رازِ نہاں اور بھی ہیں
نہیں حصر کچھ ضبط آہ و فغاں پر — محبت کی پابندیاں اور بھی ہیں
حواسوں کی دنیا پہ چھا جانے والی — سرِ طور کچھ بجلیاں اور بھی ہیں
تمہارا جواب اور دل کا کہاں ہے — مکیں اور بھی ہیں مکاں اور بھی ہیں
نیا آشیانہ بنا لینے والے — فلک پر ابھی بجلیاں اور بھی ہیں
مجھی پر کرم کیوں ہے برق طپاں کا — چمن میں کئی آشیاں اور بھی ہیں
فقط ارشدی پر ہی کیا منحصر ہے — محبت کے مجرم یہاں اور بھی ہیں

غزل :-

دُکھتا ہے دل تو آہ کئے جا رہا ہوں میں — اس میں بھی کچھ گناہ کئے جا رہا ہوں میں
خود زندگی تباہ کئے جا رہا ہوں میں — تقدیر کو گواہ کئے جا رہا ہوں میں
قربان شوقِ دید کے ناکام ہوں تو کیا — دل نذر جلوہ گاہ کئے جا رہا ہوں میں
دل اس عذاب میں ہے کہ اللہ کی پناہ — اس پر بھی ضبط آہ کئے جا رہا ہوں میں
ابتک خبر نہ تھی کہ محبت گناہ ہے — اب جانکر گناہ کئے جا رہا ہوں میں
سعیِ وفا کا حشر تو معلوم ہے مگر — جبتک بھی ہو نباہ کئے جا رہا ہوں میں

ہے اُن کو ناگوار فغاں اس خیال سے — اب دل ہی دل میں آہ کئے جا رہا ہوں میں
دل کو کسی حسین تصور کے فیض سے — صد جنت نگاہ کئے جا رہا ہوں میں
یہ بھی تو اک گناہ ہے زاہد اگر کہے — دنیا سے بے گناہ کئے جا رہا ہوں میں

جس کی سزا ہے برہمی حسن ارشدی
ابتک وہی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

زمزمۂ تغزل

سید نقی حیدر صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی

دل عاشق کو بیقرار نہ کر — سر مگیں چشم اشکبار نہ کر
یوں ہی تیغ نظر قیامت ہے — اور بھی اس کو آب دار نہ کر
شاخ طوبیٰ پہ آشیاں ہے ترا — خاکساری کو اختیار نہ کر
اپنی قسمت بدل سکے تو بدل — پر گلہ اسکا بار بار نہ کر

تیرے نخچیر ماہ اور پروین
اور اُن کے سوا شکار نہ کر

اقبال کا نظریہ "عورت" کے متعلق

آنسہ ریاض فاطمہ بلگرامی بی اے (علیگ)
متعلمہ مسلم یونیورسٹی

اقبال شاعرِ حیات ہے اور اس کی شاعری کا مقصد زندگی کی ترجمانی ہے۔ انسانی زندگی سے متعلق کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس کی اقبال نے اپنے وسیع علم اور پختہ تجربہ کی روشنی میں وضاحت نہ کی ہو اور اس پر اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو اور چونکہ "عورت" حیاتِ انسانی کا اہم ترین جزو ہے اس لئے اقبال کی توجہ اور خیالات میں وہ بھی حصّہ دار ہے۔

اگرچہ اقبال نے عورت کے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہا ہے لیکن پھر بھی جو کچھ کہا ہے وہ نہایت مکمل مفصل اور مدلل ہے۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں اس موضوع پر یا تو کچھ مواد ملتا ہی نہیں ہے اور اگر ملتا بھی ہے تو خال خال۔ "عورت" کے متعلق اقبال کے خیالات کا بیشتر حصّہ "ضربِ کلیم" میں پایا جاتا ہے جو کہ ایک عمر کے مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ ہے۔ اس طرح یہ خیالات اقبال کے صحیح اور پختہ نظریہ کے آئینہ دار ہیں۔

"عورت" ایک ایسی مخلوق ہے جو ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر دور میں لعنت و عتاب کا مرکز رہی ہے۔ شاعر۔ نثار۔ حکیم۔ فلسفی غرض ہر شخص نے اُسے کسی نہ کسی پہلو سے معلون کیا ہے کسی نے اس کی دماغی قوتوں کا مذاق اڑایا۔ کسی نے اس کی اخلاقی حالت کا جائزہ لیا اور اس کو ریاکار۔ زمانہ ساز۔ سرکۂ تلخ اور آبِ شور قرار دیکر موردِ عتاب ٹھیرایا۔ کسی نے جسمانی کمزوری کی بنا پر اُسے قابلِ حقارت قرار دیا، اور اگر معدودے چند نے وسعتِ نظری دکھائی تو انھوں نے "عورت" کو بجائے قابلِ نفرت اور لائق حقارت سمجھنے کے مستحق ہمدردی سمجھ لیا۔ لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ خواہ کسی نے "عورت" کو کچھ ہی کیوں نہ سمجھا ہو اُسے قابلِ احترام کبھی نہ سمجھا۔ اس کی وجہ ایک حد تک یہ ہے کہ ہمیشہ سے تحریر اور تقریر جو اظہارِ خیال کے خاص ذرائع ہیں مردوں کے ہاتھ میں رہے۔ چنانچہ انھوں نے

اپنے ذاتی خیالات کے معیار سے "عورت" کو جانچنے کی کوشش کی اور جنسی رقابت کی وجہ سے اپنے دامن کو تعصب و تنگ نظری سے پاک نہ رکھ سکے۔ اسلام کے ارشادات نے مردوں کے دامن کو اس بدنما داغ سے صاف کیا اور ان میں رواداری و وسعت نظری پیدا کرنا چاہی لیکن زمانے کی رو میں بہہ کر مسلمانوں نے جہاں دوسرے احکامات کو پس پشت ڈالا وہیں "عورت" کی عزت و حرمت کا حکم بھی قصۂ پارینہ ہو گیا

اقبال کی آمد سے مردہ انسانیت میں تازہ جان پڑ گئی۔ بھولے ہوئے سبق دہرائے جانے لگے۔ صدیوں کے فراموش کردہ اصول وارشادات پھر سے زندہ ہو گئے اور آخر کار اس کا وقت بھی آ گیا کہ عورت کو اس کی کھوئی ہوئی عزت واپس دلائی جائے اور اس کا غصب کردہ رتبہ اسے پھر سے عطا ہو۔ چنانچہ اقبال نے "ضربِ کلیم" میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں

اقبال نے "عورت" کو نہایت ارفع و اعلیٰ درجہ دیا ہے۔ ان کے خیال میں دنیا کی آرائش۔ زیبائش۔ رنگ و بو سب "عورت" کے دم سے ہے۔ زندگی کی رونق اسی سے قائم ہے ــــ "عورت" ایک گل ہے۔ گلشن بداماں۔ "عورت" ایک پیکر انسانیت ہے ملکوتیت بکنار۔ "عورت" مرکزِ حیات۔ محرکِ حیات اور مظہرِ حیات ہے ؎

راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات — گرم اس آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود

یہ ایک عام خیال ہے کہ "عورت" ناقص العقل ہوتی ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس نے افلاطون کو پیدا کیا اور خود افلاطون نہ بن سکی۔ اس نے ارسطو جیسے عالم۔ کنفوشس جیسے حکیم نطشے جیسے فلسفی اور اقبال جیسے شاعر کو جنم دیا اور خود ان کی مثل عالم حکیم فلسفی اور شاعرہ نہ ہو سکی۔ یہ فطرت

کی ستم ظریفی ہی تو ہے۔ لیکن اس نکتہ کو بھی اقبالؔ ایک نئے زاویہ سے دیکھتے ہیں ؎

مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

اقبالؔ "عورت" کی صلاحیتوں سے بدظن نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں "عورت" قابلِ نفرت و حقارت نہیں بلکہ مستحقِ عزت ہے۔ علم و ادب کے وہ چشمے جو بعد میں دریا اور سمندر بن کر موجزن ہوئے اولاً اسی کے آغوشِ شفقت میں پرورش ہوئے۔ ملک و قوم کی فلاح کا منبع ماں کا آغوش ہے۔ دنیا کی تاریخ نپولین اور مصطفےٰ کمال کے کارناموں پر قائم نہیں ہے بلکہ ان کی ماؤں کے ان خیالات پر جو انھوں نے میٹھی میٹھی لوریوں اور نرم نرم نصیحتوں کے ذریعہ سے ان کے دلوں میں جاگزیں کئے تھے۔ اقبالؔ "عورت" کے اس مقدس فرض کو سمجھتے ہیں اور اس کی قدر بھی کرتے ہیں۔ وہ فاطمہ بنت عبداللہ کے پردے میں تمام دخترانِ اسلام کو مخاطب کرتے ہیں ؎

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

اس نکبت زدہ اور اپنے ہاتھوں پامال شدہ ملت کے سنبھلنے کی اگر کچھ امید ہے تو ان پنگوروں سے جن کو ماؤں کے مقدس ہاتھ حرکت دے رہے ہیں۔ نشاۃ جدیدہ کے خواب کی تعبیر "عورت" کے ہاتھ میں ہے ؎

پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں

چنانچہ اقبالؔ کے نظریہ کے مطابق "عورت" تصویرِ کائنات کا رنگ ہے۔ اسرارِ حیات کا مظہر ہے۔ اور اس کی مشتِ خاک ثریا سے بھی زیادہ مشرف ہے۔ لیکن یہاں یہ ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی "عورت" ہے جس کو اقبالؔ ان اوصاف سے متصف کرتے ہیں؟۔ کیا ہماری "جدید عورت" ان کے اس معیار پر پوری اترتی ہے! کیا اقبالؔ "عورت" کی موجودہ راہ و رفتارِ ترقی سے مطمئن ہیں؟ ان کے کلام میں اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ‏ قوم نے ڈھونڈھ لی فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر ‏ وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین ‏ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اقبالؔ موجودہ تعلیم سے چنداں مطمئن نہیں ہیں۔ اس تعلیم نے بجائے جوہرِ نسوانیت کو چمکانے اور جلا دینے کے اس کو اور بھی ماند کر دیا ہے۔ تعلیم کا اصلی مقصد انسان کو انسان بنانا اور اس میں جذبۂ خودداری پیدا کرنا ہے۔ لیکن ہماری تعلیم ان مقاصد سے سراسر خالی ہے! اس تعلیم کا نتیجہ ہے کہ دین و مذہب کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے اور ہر معاملہ میں مغربی معاشرت کی اندھی تقلید کی جا رہی ہے ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن ‏ کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دین سے گر مدرسۂ زن ‏ ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

اقبالؔ اس تعلیم سے بیزار ہیں۔ یہ اسی غلط اور غیر فطری تعلیم کا نتیجہ ہے کہ "عورت" اپنے فرائض فطری کو بھول کر بیرونی زندگی میں برابر کی شریکِ کار ہونا چاہتی ہے۔

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے ‏ ہند و یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال ‏ مرد بیکار، زن تہی آغوش

موجودہ دور ذہنی بیداری کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اب صدیوں کی غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں۔ انسان آزاد ہونا چاہتا ہے۔ صرف غلامی کے بندسے نہیں۔ بلکہ وہ فطرت و تہذیب کے بندسے بھی آزاد ہونا چاہتا ہے۔ مذہب ایک زنجیر ہے ناقابلِ برداشت حقوق کے حصول کے لئے ایک مجنونانہ دوڑ ہو رہی ہے۔ اور جو دوڑنے والا فطرت۔ تہذیب اور مذہب کی حدود سے زیادہ سے زیادہ آگے نکل جائے وہی سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے۔ صنفِ نازک بھی اس دور میں کسی سے پیچھے رہنا نہیں چاہتی۔ اسے پہلے ہی انسانی درجہ سے گرا کر جانوروں کی صف میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ ڈرتی ہے کہ اگر اس وقت بھی وہ خاموش رہی تو شاید اس سے زندہ رہنے کا حق

بھی چھین لیا جائے گا۔ چنانچہ وہ بھی اس مجنونانہ دوڑ میں، بغیر کچھ سوچے سمجھے مردوں کے ساتھ شریک ہے۔ وہ اس وقت چند رعایات حاصل کر لینا چاہتی ہے۔ لیکن یہ کہ آیا وہ رعایات اس کی فطرت اور ضرورت سے بھی مناسبت رکھتی ہیں یا نہیں اُسے اس کا مطلق خیال نہیں ہے۔

سند تو لیجئے لڑکوں کے کام آئے گی

وہ مہربان ہیں اب پھر رہیں نہ رہیں

"عورت" کو اب تک ذلیل سمجھا جاتا رہا ہے۔ صرف اسی لئے کہ وہ اب تک اپنے فطری فرائض کو نہایت خوبی اور جانفشانی سے انجام دیتی رہی تھی۔ اس نے اپنے حقوق کو اپنے فرائض پر قربان کر دیا تھا۔ اور اس چار دیواری ہی کو اپنی دنیا مان لیا تھا۔ لیکن اب اسے بھی اپنی سادہ لوحی اور اپنی بیچی کا احساس ہو رہا ہے۔ اب وہ اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اب وہ بھی اپنے غصب شدہ حقوق کو واپس لے لیگی۔ بلکہ حقوق سے بھی کچھ زیادہ۔ اسے زندگی چاہیئے۔ عزت کے ساتھ۔ حرمت کے ساتھ خواہ وہ کسی قیمت پر ہو۔ خواہ وہ فطری حدود کو توڑ کر ہی کیوں نہ حاصل ہو ؎

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوشمند! غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

اقبالؔ کی نکتہ رس آنکھ "عورت" کے پوشیدہ جذبات اور کیفیات تک پہنچ گئی، اور انہوں نے اس مجنونانہ دوڑ کا مطلب سمجھ لیا۔ کہ یہ ایک ڈوبتے ہوئے انسان کی آخری کوشش ہے۔ ایک ڈوبتا ہوا شخص ہاتھ پیر مار کر بچنے کی کوشش کرتا ہے خواہ وہ حرکت اس کے لئے اور زیادہ مہلک ہی ثابت ہو۔ چنانچہ "عورت" بھی اپنے آپ کو بچانے کی سعی میں جدوجہد کر رہی ہے۔ اور اگر وہ غلط راستے پر ہے تو یہ اس کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ماحول کا۔ اس کی تعلیم کا اور اس کی تربیت کا ؎

قصورِ زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

جدید "عورت" اب نسوانیت کی آرزو مند نہیں ہے۔ وہ اب مردانگی چاہتی ہے۔ وہ اب

سوئی کے بجائے قلم اور کفگیر کے بجائے شمشیر کی طالب ہے۔ مردوں نے اس کو جسمانی۔ دماغی اور اخلاقی کمزوریوں کے اتنے طعنے دیئے ہیں اور اس بہانے سے اس کے اتنے حقوق کو پامال کیا ہے کہ اب "عورت" اپنی ان کمزوریوں" کی لعنت کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرنے لگی ہے اور کوشاں ہے کہ جلد سے جلد اپنے کو ان سے پاک کرے، اور میدانِ علم وعمل میں نمایاں حصہ لیکر اپنی صنف کو بھی زندہ رہنے کا اہل ثابت کردے لیکن اس بے محابا جدوجہد کا نتیجہ؟ کون جانے! اقبالؔ تو اس معاملہ میں قدرے ناامید سے ہیں ؎

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

لیکن یہ ناامیدی اور مایوسی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اقبالؔ "عورت" میں ترقی و بہتری کی صلاحیت نہیں پاتے۔ اس کی وجہ کچھ اور ہی ہے ؎

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

غزل

از عبید اللہ خانصاحب بی۔ اے (علیگ)

اک دھوم ہے جہاں میں وہ کیا حسیں ہے آج — بیچینِ شوق سجدہ سے اپنی جبیں ہے آج
کس سنگ آستاں پہ جھکایا سرِ نیاز — ہر بادہ کش کو دیکھئے زہرہ جبیں ہے آج
افسانہ دردِ دل کا مرے ختم ہو چکا — اب کس لئے ہر ایک پریشاں حزیں ہے آج

آئی عبیدؔ ان کے تصور سے تازگی
جام جہاں نما ہیں مئے انگبیں ہے آج

شکایت

جناب اخلر احمد صاحب کمالی - بی۔ اے (علیگ) متعلم مسلم یونیورسٹی

خداوندا! مجھے اپنے مقدر سے شکایت ہے
یہ گلزارِ جہاں میرے لئے وجہِ مصیبت ہے

مجھے کیوں پردہ دارِ غم ہنسی معلوم ہوتی ہے
مصیبت سے بھری کیوں زندگی معلوم ہوتی ہے

بہاروں میں خزاں کو جلوہ گر کیوں دیکھ لیتا ہوں
میں پہلے ہی مآلِ خیر و شر کیوں دیکھ لیتا ہوں

خوشی کو کیوں پیامی جانتا ہوں رنج و کلفت کا
میں کیوں مرہم کو ہم معنی سمجھتا ہوں جراحت کا

مرے آنسو نکل آتے ہیں کیوں انسان کو خوش پاکر
مجھے افسوس کیوں ہوتا ہے صحنِ باغ میں جاکر

مجھے کیوں آنسوؤں کا راز ملتا ہے ترانوں میں
نظر آتا ہے عنصر غم کا عشرت کے فسانوں میں

عیاں کیوں ہے مآلِ کامرانی صفحۂ دل پر
مجھے طوفان کا خطرہ کس لئے رہتا ہے ساحل پر

سکوں ملتا نہیں کیوں مجھکو باغِ زندگانی میں
خیال آتا ہے کیوں پیری کا اس چڑھتی جوانی میں

مجھے کیوں سعیِ انسان رائیگاں معلوم ہوتی ہے
ہر اک بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

مری قسمت میں تھی جو شادمانی چھین لی تو نے
خداوندا مجھے کیوں فطرتِ حساس دی تو نے

مجھے احساس کیوں سونپا، مجھے ادراک کیوں بخشا
میں اک ذرہ تھا مجھکو رتبۂ افلاک کیوں بخشا

اقبالؒ کا فلسفۂ تعلیم

آنسہ عائشہ بلقیس عمر۔ بی۔اے (علیگ)
متعلمہ مسلم یونیورسٹی

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

کون ہے جو مشرق کے مایۂ ناز شاعر ڈاکٹر اقبال کے کلام سے ماخوذ مندرجہ بالا خیال کی صحت کا قایل نہ ہو۔ اقبال جس کا نام آسمان شاعری پر ہمیشہ آفتاب کی مانند تابان رہیگا۔ جس کی شان میں خود اس کے استاد نے فرمایا ہے۔

در دیدۂ معنی نگہان حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتوان گفت

شاعر محض اور شاعر مفکر میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ شاعر محض صرف جذبات سے متاثر ہوکر لکھتا ہے۔ مگر مفکر کا کلام جذبات اور دماغی کاوش دونوں کا باہمی نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک مفکر کا کلام اسکے بعد زندہ رہتا ہے اور خود اسے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رکھتا ہے۔ اقبال ایک مفکر شاعر ہے وہ موجودہ تعلیم کا مخالف ہے جو انسان کو مادّہ پرستی سکھاتی ہے۔ اور روحانیت سے دور لے جاتی ہے۔ ہماری موجودہ تعلیم یوروپ کی تقلید ہے اور یوروپ مادہ پرستی میں مشہور ہے۔ اس کو روحانیت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسی موجودہ تعلیم کی بدولت ہم روحانیت سے اس قدر دور ہوگئے ہیں کہ اپنی فطرت کے امکانات سے بھی بےخبر ہیں۔ اقبال اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنی خودی کو تقویت دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے کلام میں مغربی تہذیب کی خامیاں دکھائی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ انسان کس طرح اپنی قوت کو قومی جمعیت میں صرف کرسکتا ہے۔ وہ صرف ایسی تعلیم کا حامی ہے جو انسان کو خود آگاہی اور کائنات سے آگاہی سکھاتی ہے۔ ایسی تعلیم جو اس کو خوددار غیرت مند اور آزاد بناتی ہے۔ برخلاف اس کے موجودہ تعلیم انسان کو غلامی اور محکومیت سکھاتی ہے۔

آج کل ہم اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے ہوئے ہیں۔ دوسروں کی

تقلید کرنا پسند کرتے ہیں۔ اپنی ہر چیز ہماری نظر میں کم مایہ نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم اپنی حقیقت کو بھی بھول گئے ہیں۔ خودداری فنا ہو چکی ہے۔ ایسے حالات میں ایک محکوم قوم کا دماغ نفی خودی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ فکر اور رائے کی آزادی نگاہوں میں بے قدر و قیمت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور آسانی سے اپنے سے طاقتور شخصیت کا اثر قبول کر لیا جاتا ہے۔ اور ایسی تعلیم کو جو خودی کی طرف لے جائے نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیا کی حالت کو دیکھ کر اقبال کو خیال ہوا کہ وہ اپنے کلام کے ذریعہ سے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کریں اور انہیں توقع تھی کہ انکا کلام ضرور اثر پیدا کرے گا۔

۵ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی   آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

اقبال ایک عالم نو کی تعمیر کا متمنی ہے اور اس کی تعمیر کا ابتدائی خاکہ وہ انسانوں کے دماغ پر مرتسم دیکھنا چاہتا ہے۔ تعمیر جدید سے پہلے وہ دلوں کو ایک ایسے علم سے منور کرنا چاہتا ہے۔ جو ان کو خودگر و خودنگر بنا دے۔ وہ علم کی مدد سے روحانی اور اخلاقی اور اس کے ساتھ جسمانی ارتقا دیکھنا چاہتا ہے۔ مادی علم اور روحانی علم کا فرق ملاحظہ ہو۔

۵ علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر دل زنی یارے بود

صرف مادی علم کبھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا اقبال انسانوں کے دلوں میں احساسات اور جذبات کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ ایسا علم جو ذہنی ارتقا کو فنا کر دے اختراع اور ایجاد کے شوق کو نابید کر دے انسانی ترقی میں کوئی مدد نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ تعلیم سے ہم کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا ہمیں ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو راہِ تجسس میں شمع ہدایت بنکر ہمیں زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب بنا سکے۔ انسان کو عالم بنانے سے پہلے اسے انسان بنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن موجودہ تعلیم انسانیت سے بہت دور لیجاتی ہے۔ اور خودغرضی و خودپرستی کا سبق سکھاتی ہے۔ اقبال انسان کو ایک مکمل انسان دیکھنا چاہتا ہے اس لئے وہ صرف مادی تعلیم کو پسند نہیں کرتا۔ اقبال کا نظریہ تعلیم یہ ہے کہ انسان اپنی ہستی کو پہچانے اور اس کی مدد سے خدا کو پہچانے۔ "من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ"

"جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا" اپنی خودی کو بیدار کرنا اور اپنی حقیقت کو سمجھنا انسانی ترقی کے لئے یہی چیز سب سے ضروری ہے۔ برخلاف اس کے موجودہ تعلیم ہم کو مساوات کے نام پر منافقت سکھلاتی ہے۔ موجودہ تعلیم کی حقیقت اقبال کی زبان سے سن لیجئے۔

ے یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت! پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات!

علم انسان کا دوست ہے۔ عقل اس کی رہنما ہے! اور عمل اس کا نتیجہ ہے۔ علم بغیر عمل کے بیکار ہے۔ اقبال کا پیغام بھی یہی ہے کہ انسان پیہم جد وجہد سعی اور عمل میں مصروف رہے۔

ے یورپ میں بہت روشنئ علم و ہنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یہی شعر ہماری تعلیم پر بھی بجنسہ صادق آتا ہے۔ موجودہ تعلیم صرف غیروں کی تقلید پر آمادہ کرسکتی ہے۔ مگر ہم اپنی مادری زبان اور مذہبی تعلیم سے بیگانہ رہتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

ے میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

انگریزی تعلیم نے ہمارے احساسات کو پامال کر ڈالا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ مادی علوم کی تحصیل بھی ضروری ہے۔ خود قرآن شریف میں آیا ہے "وقل رب زدنی علماً" اور ہمارے پیغمبر رسول پاک نے فرمایا ہے "علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے" یعنی علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ خواہ کتنی ہی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اس حقیقت سے اقبال کو بھی انکار نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال جس کی شاعری اسلامیت اور انسانیت کی شاعری ہے اور جس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ے خیمہ زن در وادئ طور شش کلیم شعر او تفسیر قرآن حکیم

اس کی نگاہ میں کونسی تعلیم پسندیدہ ہے۔ اقبال جذبۂ عمل کو نئے سرے سے بیدار کرنا چاہتا ہے وہ فلسفۂ خودی، سعی پیہم جد وجہد اور ذوق عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ اخلاقی قوت جوش عمل فکر اور سرگرمی یہ ہیں وہ صفات جنہیں وہ ایک انسان میں بیدار کرکے اسے صحیح معنی میں عالم بنانا چاہتا ہے۔ اس کے داہنے ہاتھ میں قرآن کی تلوار اور بائیں ہاتھ میں فلسفہ کی ڈھال ہے جس کی مدد سے وہ

نسل انسانی کو مادّہ پرستی کے قعر مذلت سے نکالکر ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا کلام زندگی کی حقیقت پر ایک بصیرت افروز تنقید ہے۔ اگر ہم اقبال کے کلام کو سمجھکر پڑھیں تو صرف اس سے اس قدر علم حاصل ہوگا۔ جو شاید موجودہ علوم و فنون کو ایک طویل مدت تک حاصل کرتے رہنے کے بعد بھی نہ مل سکیگا۔ اقبال کا کلام ایک شاندار مستقبل کی جھلک دکھاتا ہے۔ اقبال اپنے معیاری انسان کے لئے شاہین کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ پرندہ کبھی کسی دوسرے کا کیا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ یہ بہت بلند پرواز ہوتا ہے۔ اور اپنے قوت بازو سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے۔ اقبال یہی اوصاف انسانوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ غیرت حمیت اور خودداری یہ خوبیاں انسان کو ایسا بنا دیں گی کہ وہ صرف خدا سے ڈریگا۔ اور دنیا میں ہر ہر قدم پر جو دیوتا بنالئے گئے ہیں اور جن کے ڈر سے انسان اپنے خیالات کو ظاہر کرنے سے ڈرتا ہے۔ ایسے دیوتاؤں کی وقعت اس کے دل میں باقی نہ رہ جائے گی۔ فطرت کو پامال کرنا ہی سب سے بڑا ظلم ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "اگر کوئی انسان خود اپنے آپ کو کھو بیٹھے اور اس کے بدلے میں ساری کائنات بھی پا جائے تو بھی یہ نقصان ہی نقصان ہے" اقبال زندگی کا نقاد ہے اسکے کلام میں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق مخصوص تعلیم موجود ہے۔ موجودہ طریقہ تعلیم کو وہ بے نقاب کرتا ہے، اس کی کجروی اور خام کاریوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کی حیات مستعار کو دائم اور قائم بنا دے۔ وہ حالات کا غلام نہ بنے بلکہ حالات اس کے غلام بن جائیں۔ وہ اپنی زندگی کا خود مالک ہے اور جس طرح چاہے اسے بنا سکتا ہے۔ اقبال کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

۵ نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے — جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

۵ حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز — زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اقبال تغیر پسند قدامت سے بیزار اور دور جدید کا راہبر اور پیش رو ہے۔ اس نے اپنے کلام سے ملک اور قوم میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ زندگی کا صحیح مقصد یہ ہونا چاہئیے کہ "زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہونچ سکے" اور دل میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہو۔ یہ جذبہ انسانوں کے دلوں میں تعلیم کے ذریعہ سے بیدار کیا جا سکتا ہے۔" خدا اس سے محبت کرتا ہے جو خدا کے بندوں سے

محبت کرے" اقبال انسانوں میں یہی صفت دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ خوبی صرف روحانی تعلیم کے ذریعہ سے انسان میں پیدا کی جاسکتی ہے۔ روحانی تعلیم سب سے بہتر قرآن پاک کے ذریعہ سے دی جاسکتی ہے۔ قرآن پاک کی تعلیم مادری زبان میں ہونا چاہیئے۔ اور اس کے لئے ہمیں کسی مذہبی رہنما کی ضرورت نہیں اس کے علاوہ ہر قسم کی دنیاوی تعلیم بھی اس میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ انسان پہلے اپنے مذہب کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اقبال چونکہ خود ایک اسلامی شاعر ہے اس لئے وہ ہم کو اسلامی کاروان کے سالار ہونے کی حیثیت سے یہ ہدایت دیتا ہے کہ ہم مذہب کے دائرہ میں رہ کر روحانی ارتقا حاصل کریں اور روحانی ارتقا کے ساتھ ساتھ معاشرتی جسمانی اور ذہنی ارتقا بھی ممکن ہے۔ محض مادی تعلیم دہریت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ ملی شاعر اس کی تائید نہیں کرتا اس کی شاعری کو "جزویست از پیغمبری" سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اس لئے وہ وہی علم حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے جو انسان کو شاہین بنا سکے اور شاہین بنانے کے لئے ایسی ہی تعلیم کی ضرورت ہے جس میں خود بھی توانائی اور بلند آہنگی ہو۔ اقبال کہتا ہے۔

سہ نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر — تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

انسان میں جب خودداری اور خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی تو وہ کسی دوسرے کے سامنے سر نہیں جھکائے گا۔ کیا ہماری موجودہ تعلیم ہمیں خودداری اور خود اعتمادی سکھاتی ہے؟ ہرگز نہیں موجودہ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ انسان معمولی نفع حاصل کرنے کے لئے دوسروں کا دست نگر بننے پر آمادہ ہوجاتا ہے یہ یقیناً ناپسندیدہ حرکت ہے۔ صحیح تعلیم سے انسان شاہین کا مرتبہ حاصل کرسکتا ہے۔ مگر غلط اور ناموزوں تعلیم جو فطرت کی اپج کو پامال کر ڈالے انسان کو مردار خور کرگس بنا ڈالتی ہے۔

سہ پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

موجودہ تعلیم غیر زبان کی مدد سے دیجاتی ہے۔ یہی چیز سب سے زیادہ ہم کو محکومیت کی طرف مائل کرتی ہے۔ غیر زبان کو حاصل کرنے میں ہم زندگی کے بیش بہا اوقات صرف کر دیتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں دوسروں کے خیالات ہوتے ہیں۔ ہم غیر ملکی زبان میں سوچتے ہیں اور اس پر عبور حاصل کرنیکی

امید میں قیمتی وقت گنوادیتے ہیں۔ اس طرح شروع ہی سے تعلیم ہم کو غیروں کی محکومیت کی طرف مائل کردیتی ہے۔ محکومیت خودی کی موت ہے اور خودی کی موت انسان کو خود فروش بنادیتی ہے۔ اور اس طرح پست و غلامانہ افعال ایک محکوم قوم کی نظر میں معیوب نہیں رہجاتے۔

ؔ ز محکومی مسلمان خود فروش است گرفتار طلسم چشم و گوش است

ہماری موجودہ تہذیب اور ذوق کی اصلاح صحیح طریقہ تعلیم سے ہوسکتی ہے۔ جس کا سب سے بڑا جز خودداری ہونا چاہیئے اور خودداری خودی کو آسودہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے مشرق کا یہ شاعر اعظم اور فلسفی اسلامی تعلیم کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ؔ غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

اگر ہم اقبال کے خیالات کو اچھی طرح سمجھکر اپنے طریقہ تعلیم کی بنیاد از سر نو رکھیں تو شروع ہی سے انسان کے دل میں جوش عمل۔ جدوجہد۔ خودداری۔ خود اعتمادی اور رجائیت کی قدرو قیمت کا احساس پیدا کرسکتے ہیں۔ اقبال ہی کے کلام پر غور کرنے سے ہر مفید چیز اس میں نظر آجائے گی۔ اس کا کلام صرف جذبات کا مجموعہ نہیں بلکہ عقل و حکمت کا ایک سمندر ہے جس میں وہ بیش بہا خیالات موجود ہیں جو ہم کو عروج اور زوال کا فلسفہ سمجھا سکتے ہیں۔ اقبال انسان میں وہ طاقت پیدا کرنا چاہتا ہے جس کی مدد سے وہ دونوں جہاں کی تسخیر کرسکے۔

ؔ در دشت جنونِ من اقبال زبوں صیدے شیطان بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اقبال کا کلام مردوں میں زندگی کے آثار پیدا کرسکتا ہے۔ بےحس انسان کو حساس بنا سکتا ہے۔ اور یہی اثر ہر تعلیم کا ہونا چاہیئے کہ وہ انسانوں کی روح کو بیدار کردے اور ان کو پیہم جدوجہد اور عمل کی دعوت دے۔ موجودہ تعلیم کی خامی اقبالؔ کی زبان سے سن لیجئے۔

ؔ شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اقبالؔ انسان کو اور خصوصاً مسلمان کو خارہ شگافی کے طریقہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ فنِ شیشہ گری نے ان کے جذبات کو بالکل پامال کردیا ہے اور غلامانہ زندگی نے ذہنی نشو و نما کو بالکل

روک دیا ہے۔

ے تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

ے دل توڑ گئی انکا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ انکی پریشاں نظری کا

جو تعلیم انسان کے حق میں مفید ثابت ہو وہ روحانی تعلیم ہو سکتی ہے اور روحانی زندگی خودی کو حاصل کرنے سے ملتی ہے۔ وہ "ادب برائے زندگی" والے نظریہ کے قائل ہیں جو ہنر ضرب کلیمی کا حامل نہ ہو وہ ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

ے اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

ضرب کلیمی کس طرح حاصل ہو! یہ خودی کے سوز سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ے خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ — خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

تعلیم کے متعلق ان کا نظریہ زندگی کی بنیادوں پر قایم ہے۔ اور وہ اس کو انسانی زندگی کی اصلاح کا ایک اہم ذریعہ بنانا چاہتا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے اس نے اپنی شاعری کو آلۂ کار بنایا ہے۔ اس کی نظر میں اس عالم کی کوئی قدر نہیں جو زندگی کی کلفتوں سے بیزار ہو کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ بلکہ صحیح معنی میں صرف وہ انسان تعلیم یافتہ کہلانے کا مستحق ہے جو شاہراہِ حیات کی دشواریوں کو زیر و زبر کرتا ہوا ساری کائنات پر چھا جائے اور نہ صرف اپنی چند روزہ زندگی میں نام پیدا کرے۔ بلکہ زندگی دوام حاصل کرے۔ وہ کہتا ہے۔

ے جوہرِ انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں — آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

کیا آج کل کے تعلیم یافتہ انسان دائمی زندگی حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ دائمی زندگی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ جب تک ہم میں قوت عمل اور جوش و خروش نہ پیدا ہو۔ ہمارے اخلاق درست نہ ہوں۔ ہمارا ہر کام خدا کے حکم کے مطابق نہ ہو اس وقت تک دائمی زندگی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ جب خدا ہم سے خوش ہوگا اور ہم اپنے مذہب کے دائرہ میں رہ کر کام کریں گے تو اس وقت ہم میں دین و دنیا دونوں کو تسخیر کرنے کی قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔ یہ قوتیں صرف آزاد انسان ہی میں بیدار

ہو سکتی ہے۔ غلاموں میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسلام کے ہر فرد کو اپنی رائے اور اپنے خیالات میں آزاد ہونا چاہیئے اور صرف خدا سے ڈرنا چاہیئے۔ جب ہمارے پاس خدا کا بنایا ہوا دستور العمل موجود ہے تو ہمیں کسی دوسری قوم سے کوئی دستور مستعار لینے کی ضرورت نہیں۔ اقبال کا کلام دراصل قرآن پاک کی تعلیم کی زبانِ اردو میں تفسیر ہے۔ جس کو ہر پڑھا لکھا شخص سمجھ سکتا ہے۔ جس طرح مشک اپنی خوشبو سے دماغ کو معطر کرتا ہے۔ اسی طرح اقبال کے کلام کے مطالعہ سے دل ودماغ دونوں کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری قوم میں ایسے پیام بر دل کو تسلیم کرنے والے ابھی بہت قلیل تعداد میں پیدا ہوسکے ہیں۔ اقبال خود اس سے باخبر تھے۔

؎ بے نیاز از گوشِ امروز آمدم — من صدائے شاعرِ فرد استم

؎ نغمۂ من از جہانے دیگر است — ایں جرس را کاروانے دیگر است

جس طرح اقبال کی شاعری شاعری کی عام حدود سے نکل کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ چکی ہے اور ان من الشعر لحکمۃ سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ان کا معیارِ تعلیم بھی وہ اعلیٰ مرتبت رکھتا ہے۔ جو انسان کو صحیح معنی میں عالم بنا کر خدا کا نائب بنا دیتا ہے۔ شاعرِ اسلام فرماتا ہے۔

؎ نغمہ گر معنیٰ نہ دارد مردہ ایست

لیکن شاعری کا مقصد اگر اعلیٰ ہو اور اس سے مُردہ قوم میں جان ڈالنی مقصود ہو تو وہ شاعری الہامی مرتبہ کی چیز ہو جاتی ہے اور اقبال کی شاعری بلاشبہ الہامی شاعری ہے۔

؎ شعر را مقصد اگر آدم گری است — شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

یہی خیال اقبال کا علم کے متعلق بھی ہے۔ اگر علم کا مقصد آدم گری نہیں تو وہ علم کسی کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ ایک ایسے بلند خیال۔ دردمند۔ فلسفی شاعر کی شاعری سوائے اسلامی تعلیمات کے اور کہاں آسودہ ہوسکتی تھی۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ انسان کی قوتوں کے دو مرکز ہیں۔ دل اور دماغ۔ ایک عشق کا مقام ہے اور دوسرا عقل کا۔ کبھی ایک غالب آجاتا ہے اور کبھی دوسرا۔ دل میں جذبات کا ہجوم ہوتا

ہے اور دماغ میں خیالات کا۔ انسان نہ تو صرف جذباتی بنکر رہ سکتا ہے اور نہ بالکل ہی عقل کا پتلا۔ اگر وہ صرف جذبات کا غلام بنجائے تو جانور سے بھی بدتر ہے۔ اور اگر محض عقل کے پھندے میں پھنس جائے اور جذبات کو کچل ڈالے تو انسانی فطرت یکسر پائمال ہوکر رہ جائے گی۔ اور اس میں دنیا کی حسین ترین چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا احساس فنا ہو جائے گا۔ اقبال کا خیال بھی یہی ہے۔

؎ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال کے اس شعر میں ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عشق سے مراد عشقِ حقیقی ہے وہ خدا کی محبت کو انسانی زندگی کا اولین مقصد سمجھتے ہیں انکے کلام میں ہر جگہ عشق کا یہی مفہوم ہے۔ خدا کی محبت انسان کو خود آگاہی سکھاتی ہے اور دنیاوی علم کائنات سے آگاہی سکھاتا ہے۔ انسان چونکہ جماعت کا فرد ہے اس لئے اس کی ذاتی تکمیل صرف کائنات سے منسلک ہوکر ہو سکتی ہے اس تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود آگاہ ہو اور ساتھ ہی کائنات سے بھی آگاہ ہو۔ اقبال دل و دماغ دونوں کی تکمیل چاہتا ہے۔ اور اس طرح وہ وسیع کتابی علم اور روحانی علم دونوں کے حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جس طرح انسانی زندگی کے لئے دل و دماغ دونوں کا وجود ضروری ہے اگر ایک بھی بیکار ہو جائے اور اپنا کام ٹھیک طریقہ سے نہ کر سکے تو انسان کی زندگی بیکار ہو جائے گی اسی طرح صرف مادی یا دنیاوی علم بھی انسان کی تکمیل کے لئے بیکار ثابت ہوگا۔ اس کے ساتھ روحانی علم کا حاصل کرنا از حد ضروری ہے۔ روحانی علم خدا کی محبت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ علم کونسا ہے جو روحانی اور مادی دونوں کا مجموعہ ہو؟ اس کے لئے بھی اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے معلوم ہوگا کہ اس کا کلام عشق اور علم کی دو آنکھوں کا ایک نور ہے۔ جس قدر وسیع مطالعہ اقبال کا دنیاوی علم میں تھا شاید ہی کسی اور کا ہو۔ ان کا مقابلہ جرمنی کے مشہور فلاسفر نطشے سے کیا جا سکتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "اقبال ہند کا خدا پرست نطشے ہے"۔ خود اقبال نے کہا ہے۔

؎ اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

اس قدر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اقبال نے قرآنِ کریم کی تعلیم کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ان کے کلام کا ایک ایک لفظ اسلام کی تعلیم کو پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے تخیل نے جذبۂ اسلامیت کی روشنی میں بلند پروازی کی۔ ان کے لئے حسن وہی ہے۔ جو کامل شخصیت کو ظاہر کرے عشق وہی ہے جو اس کا تصور دل میں بٹھائے اور نغمہ وہی ہے جو شعلہ بنکر اس کو حاصل کرنے کی آگ دل میں لگا دے۔ انہوں نے تخیل کو عقیدے کا پابند کیا اور آرزو کو مذہب کا۔ ان کا کلام خالص ایمانی قوتوں کا ایک مظہر ہے جس سے انسانی ہستی مذہب و ملت اور آدمیت کے ایک خاص رنگ میں ڈوب جاتی ہے۔ صحیح علم حاصل کرلینے سے غلامی کی زنجیریں کٹ سکتی ہیں اور غلامی سے بڑھکر انسان کے حق میں کوئی دوسری چیز مہلک ثابت نہیں ہوسکتی۔ اقبال فرماتے ہیں۔

؎ غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — ہو ذوقِ عمل پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

؎ غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا!

؎ بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا!

موجودہ تعلیم جو غلامی کی زنجیروں کو اور زیادہ استوار بنا دیتی ہے۔ مذہب سے دُور لیجاتی ہے۔ خدا کی محبت تو کجا اکثر اوقات یہ تعلیم انسان کو دہریہ بنا دیتی ہے۔ اقبال کی نظر میں ایسی تعلیم کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پُرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے!

؎ ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں — غافل! تو نِرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

ذوقِ تجلی کو کھو کر صاحبِ ادراک بنجانا انسان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس کی تکمیل تو جب ہی ہوگی جب وہ خدا سے محبت رکھتا ہو اور قرآن پاک کی تعلیم پر عمل کرتا ہو۔ کسی زمانے میں اسی کی بدولت مسلمان ایک بے مثل قوت کے مالک ہوگئے تھے۔ اور انہوں نے ایران سے اسپین تک فتح کرلیا تھا۔ آج قرآن کی تعلیم کو بھول جانے سے ان کی کیا حالت ہوگئی ہے۔

؎ اسی قرآں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

؎ تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا معیار — تھی نہاں جنکے ارادوں میں خدا کی تقدیر

یہ موجودہ غلط تعلیم کا اثر ہے کہ مسلمانوں میں سے جذبۂ عمل مفقود ہو چکا ہے۔ اور وہ دوسروں کی غلامی میں رہکر خوش ہیں۔ دنیاوی تعلیم ہمیں دوسروں کی غلامی پر آمادہ کرتی ہے۔ اور اسلامی تعلیم صرف خدائے واحد کی اطاعت کرنا سکھاتی ہے۔ اقبال کے کلام میں جگہ جگہ دونوں کی مثالیں نظر آتی ہیں۔

؎ یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی — یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

؎ غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی — شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

ہماری خودی کیوں مردہ ہو گئی؟ یہ سب ہماری محکومیت کا نتیجہ ہے۔ اقبال کی زبان سے سن لیجئے۔

؎ اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ — ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ!

آج کل لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ تعلیم جو وہ یورپ کی اندھادھند تقلید میں حاصل کر رہے ہیں ان کے ہر مرض کا علاج ثابت ہوگی۔ لیکن اس کورانہ تقلید کا انجام کیا ہوگا؟ خود یورپ کو اس سے کیا حاصل ہوا؟ ایسی تعلیم کس طرح مفید ہو سکتی ہے۔

؎ بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات!

؎ وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات!

؎ ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!

اس دنیاوی علم کے ساتھ ساتھ وہ کیا چیز ہے جو ہماری تعلیم کا ضروری جز بنکر ہم کو کامل انسان بنا سکتی ہے وہ ایمان کامل اور ذوق یقین ہے۔

؎ علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے — لذت شوق بھی ہے نعمت دیدار بھی ہے

؎ پیر میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ — سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

علم تجربوں کے حاصل کرنے کا نام ہے۔ یہ تجربات ہم اپنے اسلاف کی تاریخ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اسلاف کے کارنامے وہ تجربات ہیں جو انہوں نے اپنی عقل ذہن اور دل و زبان سے مختلف وقتوں میں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کئے ہیں۔ اس تاریخ میں ہمیں تمدن تصوف شریعت فلسفہ معاشرت غرض سب ہی کچھ مل سکتا ہے۔ ہماری اپنی زبان سب سے زیادہ آسان اور مفید ہے جو بہت کم وقت میں سیکھی جا سکتی ہے۔ اس طرح زبان پر عبور حاصل کرنے کے بعد باقی وقت ہم دوسری چیزوں کے سیکھنے میں صرف کر سکتے ہیں اور اپنے ادب کو فروغ دے سکتے ہیں۔ اقبال نے اردو زبان کو بہت ترقی دی۔ وہ اپنی قوم ملک زبان سب کو نئے سرے سے زندہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ غیروں کی تقلید کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا یہ پیام صرف جاوید کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر ہندوستانی نوجوان کیلئے ہے۔

ـــــہ اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان — سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

ـــــہ مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

مغرب کی اسی موجودہ کورانہ تقلید کا نام فیشن ہے۔ یہی چیز ہمیں صحیح تعلیم سے دور رکھتی ہے۔ اقبال اس حالت کو دیکھ کر بے اختیار کہتا ہے۔

ـــــہ ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی — لہو مجھکو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

ـــــہ امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل — نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

اقبال انسانوں میں عقابی روح کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ ان میں صبر و استقلال۔ استغنا۔ بلند پروازی اور مسلسل حرکت و عمل کی خواہش دیکھنا چاہتا ہے۔ جب یہ اوصاف ایک انسان میں پائے جائیں گے تو اس کی ذہنی قوتیں بھی بیدار ہو جائیں گی اور اختراع و ایجاد کا مادہ اپنا کام بخوبی کر سکے گا۔ یہ خوبیاں تہذیب حاضر اور جدید تعلیم پیدا نہیں کر سکتی۔

ـــــہ نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلّی میں — کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ سلمانی

ـــــہ عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے اسکو اپنی منزل آسمانوں میں

عقابی روح صرف خوددار اور خود اعتماد انسان ہی میں بیدار ہو سکتی ہے جس کا سب سے بڑا جوہر خودی ہے۔ خودی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ثم سوّاہ و نفخ فیہ من روحہ" یعنی آدم کو پورے طور پر

بنا چکنے کے بعد اس نے اپنی روح کا ایک جزو یا ایک شمّہ اس میں داخل کیا۔ اقبال اسی کو خودی کا نام دیتا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے کہ خدا زمین اور آسمانوں کا نور ہے اقبال خودی کو اسی نور سے تعبیر کرتا ہے۔

؎ نقطۂ نوری کہ نام او خودی است　　زیر خاک ما شرار زندگی است

؎ خودی را از وجودِ حق وجودے　　خودی را از نمودِ حق نمودے

انسان اپنی خودی کو جس قدر حد اسے دور اور مادّیت یا خواہشات سے قریب تر کرتا جاتا ہے اس کا دل وضمیر مردہ اور زنگ آلود ہوتا جاتا ہے۔

انسان کامل کی ایک ضروری صفت فقر ہے۔ اقبال نے فقر کی فضیلت علم پر بار بار دکھائی ہے۔

؎ علم فقیہہ وحکیم فقر مسیح وکلیم　　علم ہے جویائے راہ فقر ہے دانائے راہ

علم کو صرف فلسفی اور فقیہہ کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اور فقر مسیح وکلیم کے بلند مرتبہ تک پہونچ سکتا ہے۔ صاحب فقر انسان اکثر اوقات باوجود ناواقف علوم ہونے کے بھی صحیح راہِ عمل سے واقف ہوتا ہے برخلاف اس کے حکیم وفقیہہ کو ہمیشہ اس کی ضرورت رہتی ہے۔

؎ فقر کے ہیں معجزات تاج وسریر وسپاہ　　فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

؎ علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل وخرد　　فقر کا مقصود ہے عفت قلب ونگاہ

اقبال شاعر حیات ہے شاعر سکون وجمود نہیں۔ ان کا نظریۂ حیات نطشے برگساں اور رومی سے مماثلت رکھتا ہے۔

؎ فریب نظر ہے سکون وثبات　　تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات،

؎ سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　فقط ذوق پرواز ہے زندگی

ذوق پرواز ایک آزاد شخص ہی کو حاصل ہو سکتا ہے، ایک غلام کی تو ساری قوتیں سلب ہو جاتی ہیں وہ بلند پروازی کا کس طرح خواہشمند ہوگا؟

؎ بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب　　اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

اقبال انسانِ کامل میں ذوق وشوق سوز وساز۔ فقر۔ خودی اور حرکت دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے نظریہ حیات میں زندگی حرکت کا نام ہے۔ اس کی نگاہ میں سکون اور جمود کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ جو لوگ خانقاہوں میں بیٹھ کر عبادت اور ریاضت کرتے ہیں اقبال ان کو نباتات اور جمادات کے زمرہ میں شامل کرتا ہے۔ وہ انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ دنیاوی مشکلات کا مقابلہ کریں اور اپنی قوت بازو اور جوش عمل سے دنیا کی ہر چیز کو تسخیر کر ڈالے۔ وہ انسان جو دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ رہنا پسند کرتا ہے اقبال اسکو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کوئی خوددار شخص کبھی کسی کا دست نگر رہنا پسند نہیں کرسکتا۔

؎ خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اسکی آب

؎ وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

"عظمت اور برتری کا اصلی امتحان دشواریاں ہیں۔ بزدل ان سے بھاگتا ہے۔ بیوقوف ان سے پریشان ہوکر رہجاتا ہے۔ صرف بڑے اور عالی مرتبہ انسان انہیں مسخر کرلیتے ہیں" اقبال کا بھی یہی خیال ہے کہ جب تک انسان مشکلات کا مقابلہ کر کے ان کو تسخیر نہ کرلے اس وقت تک اس کی تکمیل نہیں ہوتی۔

؎ میا را بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است

؎ بدریا غلط و با موجش در آویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

ان کے کلام میں متعدد جگہ یہ پیام موجود ہے۔ تجربات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ چونکہ انسان جماعت کا ایک فرد ہے اس لئے اس کی ذات کی تکمیل صرف اسی طرح ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے اندر جماعتی شعور پیدا کرے اور یہ جماعتی شعور وہ کائنات سے منسلک ہوکر حاصل کرسکتا ہے۔ دنیا سے الگ ہوکر کسی قسم کی ترقی ناممکن ہے۔ اپنی جماعت سے منسلک ہوکر انسان سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے دست نگر رہ کر اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد اپنی قوتوں کو مردہ کر ڈالتا ہے۔

؎ تھا جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی آج ان خانقاہوں میں ہے فقط روباہی

مگر اقبال ایک پُرامید شاعر ہیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے وہ مسلک رجائیت کے علمبردار ہیں۔

؎ ہے یاد مجھے نکتۂ سلمان خوش آہنگ دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ

؎ چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

اقبال چاہتے ہیں کہ تعلیم سے انسان کو اپنی شخصیت کے نمایاں کرنے کا اور اپنے مشاہدات وتجربات ظاہر کرنے کا موقع ملے۔ تجربات سے انسان غور و فکر سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور اپنے دل و دماغ کی قوت تحقیق و تجدید کو کام میں لاکر دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرسکتا ہے۔ سچائی بہادری اور بہترین اخلاق یہ خوبیاں ہیں جو اقبال ایک تعلیم یافتہ شخص میں دیکھنے کا متمنی ہے۔ لیکن برخلاف اس کے ہرطرف اسے یہی دکھلائی دیتا ہے کہ سچائی۔ جرأت اور صحیح ذوق وشوق کی کہیں کوئی قدر نہیں۔ صرف ظاہری حالت دیکھی جاتی ہے۔ گہرائی تک کوئی نہیں پہونچتا۔

؎ دل بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

آنکھ کا نور ظاہری علم ہے اور دل کا نور باطنی علم ہے۔ ظاہر اور باطن دونوں کی پاکیزگی ضروری ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے انسان کے دل میں بہت سی امنگوں اور آرزوؤں کا ہونا ضروری ہے۔ اقبال اسی امنگ اور آرزو کو سوز سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ صفت وہ ہر انسان کے دل میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہماری کتابی تعلیم بہت وسیع تر ہو۔ اور نوجوانوں کے ذوق وشوق کو ابھار سکے اس کی سیرت میں پختگی اور گہرائی اور شرافت کا بیج بو سکے۔ اخلاقی جرأت کی تعمیر کرسکے۔ قومی جمعیت کا احساس ہو۔ انسانی ہمدردی اور احساس اور مروّت کے جذبات بیدار ہوسکیں صبر و استقلال کا مادّہ پیدا ہوسکے۔ لیکن ہماری موجودہ تعلیم بے روح ہے۔ غیروں کی نقل اور تقلید کو اپج پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ہر انسان میں کچھ قدرتی صلاحیتیں موجود ہیں جن کو ہم تعلیم کے ذریعہ سے کارآمد بنا سکتے ہیں مگر افسوس کہ ہماری موجودہ تعلیم ان صلاحیتوں اور جذبات کو اندر ہی اندر پامال کرڈالتی ہے اور ان کو اظہار کا موقع ہی نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال ان ظاہری علوم سے خوش نہیں۔

؎ پڑھ لیئے میں نے علوم شرق وغرب — روح میں باقی ہے اب تک دردوکرب

اس کا جواب بھی سُن لیجیے۔

؎ دست ہر نا اہل بیمار ت کند — سوئے مادر آکہ تیمارت کند

موجودہ زمانے میں انسانوں کے خیالات اور جذبات کی کوئی قدر نہیں۔ ظاہری مرتبہ اور شان و شوکت کی عزت ہوتی ہے۔ سیرت اور اخلاق سے کہیں بڑھ کر ڈگریاں اور امتیازات ہی قابلیت کے جانچنے کا معیار گنے جاتے ہیں۔ آزاد رائے اور غور و فکر کرنے والے سے زیادہ اہمیت اس شخص کو حاصل ہے جو دوسروں کے خیالات کا غلام بن جائے اور خود اپنی رائے اس کے لئے کوئی وقعت نہ رکھتی ہو۔ یہ ہے ہماری موجودہ تعلیم اور اس کا معیار!

تکمیل انسانی کے لئے ضروری ہے کہ انسان خود اعتماد ہو اور خدا پر کامل بھروسہ رکھتا ہو۔ صرف سونے اور چاندی کی مورتوں سے اسے محبت نہ ہو بلکہ اس میں انسانی ہمدردی کا احساس ہو۔ اقبال کا فلسفہ تعلیم برٹرینڈرسل کے نقطۂ نگاہ سے مشابہ ہے۔ ایک اور ضروری وصف جو اقبال تعلیم یافتہ انسان میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ قوت ارادی اور ہمت ہے۔ ہر قسم کا ڈر اور خوف جو فطری کمزوری کی دلیل ہے۔ انسان کو ترقی کی راہ سے دور لیجاتا ہے۔ اور وہ قسمت پر بھروسہ کرکے خاموش بیٹھا رہتا ہے۔

؎ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اقبال ایک ماہر تعلیم اور بڑا فلسفی تھا۔ وہ انسانوں کو خود آگاہی سکھانا چاہتا ہے۔ اس کا پیغام تمام انسانوں کے لئے ہے۔ فلسفہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کا فلسفۂ عمل بھی گراں قدر ہے۔ اس نے اپنی شاعری سے عملی کام لیا ہے۔ اس کا کلام اس کے مقاصد کا صحیح ترجمان ہے۔ جو مُردہ دلوں میں زندگی کے آثار پیدا کرتا ہے۔ اور ان کو جوش عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے کلام میں زندگی کی حقیقت کا راز عیاں ہے۔ جو وہ ایک مکمل انسان میں دیکھنے کا متمنی ہے۔ اقبال کا فلسفہ حیات اور فلسفہ تعلیم ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم وہی ہے۔ جو انسان کو زندہ رہنے کے طریقے سکھائے اور جس پر عمل کرنے سے وہ اپنی زندگی کو دوامی زندگی بنا سکے۔ اقبال کی تعلیم انسانی ارتقا کے مراتب مختلف طریقوں سے

پیش کرتی ہے۔ اس نے مسئلہ حیات کو پیش کیا ہے۔ صوفیوں کے بنائے ہوئے مسئلہ تقدیر کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔

سہ تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اقبال نے انسان کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز خودی کو قرار دیا ہے۔ تعمیر خودی ہی سے کسی فرد کی شخصیت مکمل ہو سکتی ہے اور عملی دنیا کے لئے یہ سب سے اہم عنصر ہے۔ صوفیوں کا مسئلہ ہے کہ قطرہ دریا میں ملکر ہی دریا بن سکتا ہے مگر اقبال چاہتا ہے کہ قطرہ اپنی قوت سے بذات خود ایک دریا بن جائے۔ انسانی ترقی کا راز یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کو صحیح طور پر سمجھ لے۔ اور جو قوتیں اس میں قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں ان کو کام میں لاکر اپنی شخصیت کا اظہار دنیا کے سامنے کر سکے۔ انسان خودی کی تکمیل سے دین و دنیا دونوں کو اپنے قبضہ اور اختیار میں لا سکتا ہے۔

سہ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی تکمیل سے انسان ترقی اور آزادی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

سہ بے ذوقِ نمود زندگی موت تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

خودی کا ارتقا انسان کو خدا تک پہونچا دیگا۔ خودی کی موت سے موجودہ دور کی ترقی اور آزادی ختم ہوگئی۔ خودی کی موت گویا انسان کی موت ہے۔

سہ خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

اپنی بے پایاں شخصیت اور اس کے لامحدود کائنات کو سمجھنا ہی انسانی زندگی کا صحیح مقصد ہے۔ اقبال کی تعلیم فلسفۂ عمل کشمکشِ حیات اور جد و جہد کو پیش کرتی ہے۔ انسان دنیا میں خدا کا نائب بنکر آیا ہے اس لئے اس کا مقصدِ حیات بھی سب سے بلند ہونا چاہیئے۔

سہ ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

اقبال نے علم کے ساتھ عشق اور خبر کے ساتھ چشم بصیرت کو ضروری قرار دیا۔ عقل کے ساتھ دل اور دل کے ساتھ عقل کی رہنمائی ضروری بتائی ہے۔ اقبال کے انسان کامل اور نطشے کے انسان کامل میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایک دائرہ مذہب کے اندر ہے اور دوسرا اس سے بالکل الگ۔ اقبال کہتے ہیں۔

؎ اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

ایک آزاد خیال انسان جو بلا خوف و خطر اپنے نظریہ حیات کو جماعت کے سامنے پیش کر سکے اور جو وسیع النظر اور مفکر بھی ہو جس کے دل میں دوسروں کی تکلیف کا احساس ہو۔ جو انسانی ترقی کے لئے اپنی زندگی کے بہترین لمحات صرف کر سکے۔ نئے نئے طریقے سوچے اور ان کو تخلیقی زندگی کا پیغام دے۔ وہی صحیح طور سے تعلیم یافتہ کہلانے کا مستحق ہے۔ جب ہر فرد اپنی تکمیل خود کر سکے گا۔ اور زندگی کی گہرائیوں تک پہونچ سکیگا۔ تو جماعت خود بخود ترقی کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ بشرطیکہ کسی انسان میں خود غرضی کا ذرا سا شمہ بھی موجود نہ ہو۔ اقبال انسان کو مسائل زندگی سے آگاہ کرنا چاہتا ہے اس کو جو تمام دنیا کے علوم حاصل کرے مگر کامیاب زندگی بسر نہ کر سکے اقبال کی نظر میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

؎ زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

اہلِ دانش کے لئے ضروری ہے کہ وہ اہل نظر بھی ہو۔

؎ اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

اقبال کی تعلیم کا صحیح مقصد سوتوں کو جگانا ان میں حرکت پیدا کرنا اور انہیں کشمکش حیات سے آگاہ کرنا ہے۔ وہ ایسا علم چاہتا ہے۔ جو حیات بخش ہو۔ انسان کی تمام فطری قوتوں کو بیدار کر سکے اور دماغی اور اخلاقی ارتقا کا سبب بن سکے۔ اس کے لئے سب سے بڑی ضروری چیز قوت عمل ہے جسکی مدد سے تعلیم کا صحیح مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ عمل ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو ہم کو قعر مذلت سے نکال کر بام عزت پر پہونچا سکتا ہے۔ بغیر عمل کے علم بیکار ہے وہی علم کارآمد ہو سکتا ہے جس پر عمل کیا جا سکے۔ صرف کتابیں پڑھ لینا مفید ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ ان کی مہیّا کردہ معلومات کی مدد سے کوئی عملی کام نہ لیا جائے۔

؎ خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!

؎ تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں!

اقبال کے فلسفۂ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت خودی کو حاصل ہے چونکہ آجکل انسانوں میں

خودی کا مادہ فنا ہو چکا ہے اس لئے تعلیم سے بھی وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جو ان کے لئے ضروری ہیں۔

؎ فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب   کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

؎ رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید   ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف!

دماغی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے، اقبال تعمیر خودی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ تعلیم ایک ایسے انسان کے لئے ہی مفید ہو سکتی ہے جس کی خودی بیدار ہو چکی ہو۔ اقبال اپنا فلسفۂ تعلیم کا جزو اس شعر میں پیش کرتا ہے۔

؎ تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

غزل

حافظ محبوب الرحمٰن بسملؔ۔ بھوپالی متعلم سال دوم

آزاد وش توئی و گرفتارِ تو منم — تعزیرِ عشق کن کہ گنہ گارِ تو منم
سرمایۂ تکبر و پندارِ تو منم — تو یوسفی و گرمیِ بازارِ تو منم
ہاں اے متاعِ حسن ببازارِ عاشقی — چوں پیرزالِ مصر خریدارِ تو منم
فردا بگویم آنچہ من امروز گفتہ ام — عشق ست گر گناہ گنہگارِ تو منم
اے کاش تو مرا طلبی یا من رسی — صبرم نماند۔ طالبِ دیدارِ تو منم
وقت ست ایں کہ چارہ گرِ بے کسے شوی — اے چارہ سازِ خلق چو بیمارِ تو منم
اے گل چرا تو گوش بہ آہم نمی دہی — از بلبلانِ نالہ کشِ زارِ تو منم

کن یک نگاہِ لطف بریں حالِ زارِ من
بسملؔ ز تیغِ ابروئے خمدارِ تو منم

مولانا شبلی کا درجہ اُردو ادب میں

سعید الحسن متعلم انٹر فرسٹ ایر
مُسلم یونیورسٹی

ہماری اُردو کیا اور اس کی عمر کیا۔ لیکن پھر بھی اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جو ترقی اُردو نے اپنی قلیل عمر میں کی ہے وہ اتنے کم عرصہ میں شائد ہی کسی زبان نے کی ہو۔ اُردو نثر کا سال پیدائش بارہویں صدی ہجری مانا جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کی بھی چند تصانیف ملی ہیں لیکن وہ کتابیں صرف چند مذہبی کتابوں اور چند صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ اردو نثر کا آغاز ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ اس زمانہ میں اُردو کا ادب صرف چند قصہ کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ مصنفین کا رنگ بالکل نرالا تھا لوگ مقفّیٰ عبارت لکھنا اپنا فخر سمجھتے تھے اور زیادہ سے زیادہ مشکل عربی اور فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کو داخل کرنا منتہائے کمال تحریر سمجھتے تھے۔ اور اس لفاظی سے گویا اپنی علمیت کا اظہار کیا جاتا تھا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں جان گلگرائسٹ صاحب نے اُردو کی قواعد مرتب کی یہ زمانہ اُردو نثر کا دوسرا دور تھا۔ اس عہد میں طرز تحریر نے کچھ پلٹا کھایا اور بجائے دقیق زبان کے آسان زبان لکھی جانے لگی لیکن اس دور میں کوئی خاص کام انجام نہیں دیا گیا محض فارسی اور دیگر زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ اُردو میں کیا جانے لگا بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا مثلاً چار درویش جو میرامن کی بہترین یادگار ہے۔ ان کی طرز تحریر میں جدید اردو کا رنگ صاف جھلکتا ہے اور اکثر جگہ اس کو پڑھتے پڑھتے ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ کتاب آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے لکھی گئی ہے۔

رفتہ رفتہ یہ نونہال جس کے بڑھنے کے آثار شروع ہی میں نمایاں تھے مادر ہند کی سرزمین میں پرورش پانے لگا پھولا اور پھلا۔ دربار مغلیہ میں اس کو جگہ دی گئی۔ کمپنی نے اس کو اپنا وسیلہ حکومت بنایا۔ اس کے دو خاص اسکول قرار پائے ایک لکھنؤ اور دوسرا دہلی۔ مختلف نثار پیدا ہوئے اور سب نے اپنے علم کے خزانہ کو اردو نثر میں نہاں کرنا شروع کر دیا۔ غالب نے خطوط میں اپنا نیا طرز نکالا۔

لیکن اردو نثر کا اصل میدان ترقی سرزمین علی گڑھ ہے جہاں اس نے ہوش سنبھالا اور ترقی کے راستہ پر چلنے لگی اور ایسی بڑھی کہ دوسری زبانوں کی ہمسر بن گئی۔ اس دور کا آغاز سرسید کی تحریک کا نتیجہ ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا نے اس کو ایسی ترقی دی جس سے وہ آج اس منزل پر نظر آتی ہے۔

آزاد نے ایک نیا رنگ اختیار کیا اور زبان میں الفاظ کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا اور ان بے بہا موتیوں کو جو اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھے ہماری نظروں کے سامنے پھیلا دیا۔ انہوں نے تو اس طرز کو نبھایا لیکن ان کے بعد کوئی ان کی تقلید نہ کر سکا اور ان کا اسٹائل قریب قریب مٹ گیا دوسرے یہ کہ ان کے کلام کے بیشتر حصہ میں تصنع کی جھلک نمایاں ہے۔

نذیر احمد نے بامحاورہ زبان اور عربی اور فارسی کی مدد سے پند و نصایح کے خزانے بھر دئے لیکن انہوں نے ان زبانوں کی کچھ اس طرح ترکیب دی کہ وہ بے جوڑ ہو گئیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے کلام میں بے تکے اور بے محل انگریزی الفاظ بہت ہیں جو بے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے کلام کی خوبصورتی مٹ گئی ہے۔

حالی نے سب سے الگ رنگ اختیار کیا انہوں نے محض ثقاہت اور سنجیدگی کو ہی نبھایا جس سے انکا کلام بے لطف اور خشک ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ حالی کی تحریر تاثر، نصایح اور سوز و گداز سے پُر ہے لیکن پھر بھی لوگ سوائے چند کے اس کے پھیکے پن کی وجہ سے کچھ زیادہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں۔

ان سب مصنفین سے بڑھ کر مولانا شبلی کا رتبہ ہے۔ ان کا اسکول ہی دوسرا معلوم ہوتا ہے ان میں آزاد کی انشا پردازی، نذیر احمد کی بامحاورہ ٹکسالی زبان اور حالی کی سنجیدگی حد درجہ کی پائی جاتی ہے انکے کلام کا خاص موضوع تاریخ رہا ہے اور اس میں دوسرا ان کی ہمسری نہیں کر سکتا اگر ان کو ہم بقول مہدی "ملک میں تاریخ کا معلم اوّل" کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ تاریخی مواد جمع کرنے کے لئے انہوں نے ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اور ہر کتاب سے کچھ نہ کچھ اخذ کیا تھا۔ ان کی جانچ اس قدر صحیح تھی کہ بڑے بڑے مورخین کے بیان میں غلط بیانی فوراً معلوم کر لیتے تھے۔ انھوں نے بلاد اسلامیہ کا ایک بڑا دورہ کیا تھا اور مختلف کتب خانوں کی چھان بین کی تھی جس سے ان کے پاس علم کا ذخیرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔

انہوں نے بچپن سے تاریخ اسلام اور فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان دونوں چیزوں کو کچھ اس

طرح باہم ترکیب دیا ہے کہ ان کے مضامین افسانوں سے بڑھ کر زیادہ دلچسپ ہو گئے ہیں۔ ان کے کلام میں روانی اور سلاست حد درجہ کی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سنجیدگی بھی بہت ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ ان کے پاس اتنا ہے کہ اگر وہ برابر لکھتے چلے جائیں تو بھی کبھی ختم نہ ہو گا آپ کی زبان شستہ اور سلجھی ہوئی ہے اور آپ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ فصیح الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے کلام میں نذیر احمد کی سی انگریزیت نہیں پائی جاتی ہے اور وہ انگریزی الفاظ استعمال کرنا اپنا فخر نہیں سمجھتے ہیں اگر ضرورت کی وجہ سے وہ کوئی انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے صحیح اور سلیس معنی بھی درج کر دیتے ہیں۔

آپ نے فلسفہ اور منطق کی بنیاد اردو میں ڈالی ہے۔ اور تاریخ سے پُر کر کے اُردو کو ایک علمی زبان بنا دیا ہے۔ نہ تو آپ بیکار اور طولانی تمہیدوں سے اپنے مضمون کو پُر کرنا چاہتے ہیں اور نہ اپنے کلام کو لغو خرافات سے بھرتے ہیں بلکہ بغیر کسی لمبی چوڑی تمہید کے آپ اپنا مقصد بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ موضوع بے لطف نہیں ہونے پاتا بلکہ وہ اس کو اپنے طرز تحریر اور علمیت سے اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بیحد دلچسپ ہو جاتا ہے اور اس میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ ہر قسم کے آدمی کو خواہ وہ کیسا ہی مذاق رکھتا ہو اچھا معلوم ہوتا ہے۔

آپ کے کلام کا خاص موضوع فلسفہ اور تاریخ رہا ہے ان کا رنگ زیادہ تر مذہبی ہے اور ایک نئے قسم کا مذہبی لٹریچر رائج کر دیا ہے لیکن وہ مذہبی باتوں کو محض عقیدہ کی وجہ سے بغیر سوچے سمجھے درج نہیں کر دیتے ہیں بلکہ ہر بات کو ایسے دلائل اور ثبوت دیکر لکھتے ہیں کہ ایک غیر مسلم شخص بھی اس کو درست سمجھنے لگتا ہے۔ انہوں نے ان لوگوں کی تصانیف کو بالکل جھوٹا ثابت کر دیا ہے جنہوں نے اسلام پر جھوٹے الزام لگائے ہیں اور اس میں عیب نکالے ہیں۔

" فاضل شبلی نے ایک طرف تو بڑے میاں یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری اور ساتھ ہی یورپ کے نوخیز چلتے پرزوں یعنی فلسفہ اور سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا" ——— افادات مہدی۔

اوائل عمر میں شبلی پر مولویت کا رنگ بہت زیادہ چڑھا ہوا تھا یہ ان کے والدین کی پرورش کا نتیجہ ہے لیکن علی گڑھ میں جاکر سر سید کا اثر پاکر ان سے مولویت دور ہوگئی! اس کے وہ خود معترف ہیں۔ اس سے قبل وہ صرف ایک شرعی مسلمان تھے۔ لیکن اب وہ ایک سچے اور خدا پرست مسلمان ہوگئے۔ ان کے دل میں مسلمانوں کے لئے ایک سچا خلوص اور مذہب کی قیمت کا صحیح اندازہ ہوگیا اور انہوں نے مذہب کو اخلاقی سیاسی اور علمی پہلو سے دیکھا اور اس کو ایک نئی روشنی میں پرکھنا شروع کیا۔

مغربی سائنس اور فلسفہ جو کہ مذہب کے سخت دشمن ہیں اپنی چرب زبانی سے اور دلائل کے ذریعہ مذہب کو جھوٹا ثابت کر دیتے ہیں مولانا نے انہیں کے دلائل اور ثبوتوں سے مذہب کو اس قدر سچا ثابت کروایا ہے کہ ان کو منہہ کی کھانی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کی خداداد دماغی قوت کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شبلی نے استدلال کرنا سر سید سے سیکھا ہے لیکن یہ ایک حد تک غلط ہے میرے خیال میں جہاں تک لٹریچر کا تعلق ہے ان پر سر سید کا اثر بلاشبہ پڑا ہے کیونکہ وہ ان کے مقلدین میں سے تھے۔ لیکن جہاں فلسفہ اور مذہب کے استدلال کا سوال ہے یہ مولانا کی اپنی ذاتی قابلیت اور فکر کا نتیجہ ہے اور بقول مہدی "انہوں نے اپنے ملکہ راسخہ یعنی فطری قوت تصنیف سے وہی کام لیا ہے جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہوسکتا تھا"

اس فن میں وہ اپنے ہمعصر ادیبوں سے افضل ہیں وہ اگرچہ عمر میں اپنے ساتھیوں سے چھوٹے تھے لیکن ادبی خدمات کے لحاظ سے ان کا رتبہ سب سے بلند تر ہے انہوں نے اپنی دماغی قوت اور علم لامتناہی کی وجہ سے ایک ایسا وسیع موضوع بحث اختیار کیا کہ جس تک دوسرے خلاقین سخن کی پہنچ مشکل بلکہ ناممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ سب سے بلند مرتبہ پر بہت جلد پہنچ گئے۔ گو آج کل انکے اس نئے موضوع کی کچھ زیادہ قدر نہ ہوئی کیونکہ ابھی مذہب باقی ہے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب کہ مذہب کے خلاف آواز لگانے والوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی اس وقت ان کی تصانیف کی صحیح قیمت کا اندازہ ہوگا کہ شبلی نے مذہب۔ فلسفہ اور ادب پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ ان کی اسلامی تاریخ۔ مذہب اور فلسفہ کی کتابیں "قدیم تاریخ کا گویا نچوڑ ہے" ان پر یونانی فلسفہ اور موجودہ فلسفہ دونوں کا اثر پڑا ہے اور دونوں کی آمیزش آپ نے اس طرح کی ہے کہ اس کا رد ناممکن ہے اور صدیوں تک کوئی انکا جواب نہ دے سکیگا۔ انہوں نے

اکثر جگہ یونانی فلسفہ میں غلطیاں بھی نکالی ہیں۔ اپنے انکارناموں کی وجہ سے انہوں نے حیات جاوداں حاصل کر لی ہے جبکہ انکی کتابیں لوگوں کی زبان زد رہیں گی ان کا نام آفتاب کی طرح روشن رہے گا۔

یہ تو صرف ان کی مذہبی خدمات ہیں لیکن اگر ہم نظر غور سے دیکھیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اردو زبان پر بھی کس قدر احسان کیا ہے وہ زبان جس کی بنیاد محض نغو قصہ کہانیوں یا صرف چند مذہبی خشک کتابوں پر تھی اب اس کا دایرہ کتنا وسیع ہو گیا ہے اس کامیابی کا سہرا صرف چند افراد کے سر ہے جن میں سے ایک مولانا شبلی بھی ہیں۔ انہوں نے دکھا دیا کہ فلسفہ جواب تک صرف مغربی زبانوں کا ہی محتاج کہا جاتا تھا وہ اردو میں بھی ڈھل سکتا ہے اور اس خوبی سے ڈھل سکتا ہے۔ کہ مغربی زبانیں بھی اس پر رشک کریں۔ اس کی یہ کیا کم مثال ہے کہ شبلی کی تصنیف "سیرت النبیؐ" کا ترجمہ ترکی زبان میں ہوا ہے! انہوں نے اردو جیسی کم مایہ زبان کو ایسے قیمتی موتیوں سے پُر کر دیا ہے۔ آپ کی ترکیب، الفاظ کی نشست اس قرینہ سے ہیں کہ اہل زبان دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں ان کو زبان پر پورا عبور حاصل تھا اور ایک ایک لفظ کے بجائے دس دس الفاظ استعمال کر سکتے تھے۔ انگریزی الفاظ کا ترجمہ کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لفظ اسی لفظ کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس کی مثالیں ان کے کلام میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ انھوں نے اسلامی حکومت کے ایسے نقشے پیش کئے ہیں کہ اس عہد زریں کا سماں ہماری نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ انہوں نے اسلام کے بہادروں اور سورماؤں کا ذکر کیا ہے۔ جس کو سنکر ہمارا خون جوش مارنے لگتا ہے ان کی خاص خاص تصانیف شعر العجم۔ موازنہ انیس و دبیر۔ سفرنامہ روم و مصر و شام اور سیرت النبی ہیں۔ سیرت النبی گو ان کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکی لیکن جو کچھ ہے وہ مذہب اور زبان دونوں کی ایک بڑی خدمت کا نمونہ ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مولانا نے مختلف مضامین۔ مکالمے اور خطوط لکھے ہیں جو سب کے سب کافی مقبول ہیں اور اردو لٹریچر میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

غزل

شکیل احمد صاحب قادری بدایونی متعلم مسلم یونیورسٹی

ہم ہیں اور اُنکی خوشی ہے آجکل
زندگی ہی زندگی ہے آج کل

دل ہے اور افسردگی ہے آج کل
رنج و غم کی بن پڑی ہے آج کل

غم کا ہر عالم نیا ہے اندنوں
دل کی ہر دنیا نئی ہے آج کل

دور ہے نظروں سے کوئی مستِ ناز
زندگی بے کیف سی ہے آج کل

اُن کی یاد اُنکی تمنا ان کا ذکر
وقت کتنا قیمتی ہے آج کل

چاند بھی ہے سوگوارِ ہجرِ دوست
پھیکی پھیکی چاندنی ہے آج کل

زندگی ہے اک عذابِ مستقل
موت گویا زندگی ہے آج کل

جل رہی ہے دل میں شمعِ آرزو
غمکدے میں روشنی ہے آج کل

تو ہے اور دریا دلی ہے ساقیا
میں ہوں اور تشنہ لبی ہے آج کل

ایک مرکز پر ٹھہرتی ہی نہیں
ہر نظر بہکی ہوئی ہے آج کل

عرضِ غم پر مسکراتے بھی نہیں
برہمی سی برہمی ہے آج کل

دلِ میرا اور مایوسیوں میں اے شکیل
اتحادِ باہمی ہے آج کل

قطعہ

وہ گرمیٔ بزمِ عشق گئی وہ مہر و وفا کے گیت گئے
جب حوصلۂ دل پست نہ تھا ہاں ہاں وہ زمانے بیت گئے

ہم شانِ تحمل پر نازاں تم جورِ مسلسل پر قائم
للہ یہ بازی رہنے دو ہم ہار گئے تم جیت گئے

اُردو ادب میں ڈرامائی عناصر

جناب شاہد احمد صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی

ڈراما یونانی لفظ "ڈراؤ" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کام کرنے اور ایکٹ کرنے کے ہیں۔ یہ افعال انسانی کی جیتی جاگتی متحرک نمائش کا نام ہے۔ اس میں مسلسل اور دلچسپ گفتگو سے پلاٹ پیدا ہوتا ہے۔ تذکرے یا روایت سے کام نہیں لیا جاتا۔ یہ گویا واقعے کا بیان نہیں ہوتا بلکہ اس میں خود واقعے کو عملی طور پر پیش کیا جاتا ہے واقعے کا بیان فنِ نقل یا اداکاری کے ذریعے نظروں کے سامنے کیا جاتا ہے لیکن قصے یا واقعے کے اس طرح سے عملی طور پر پیش کئے جانے سے ہی ڈرامہ پُر اثر نہیں ہوسکتا۔ اُس کا اثر اور اُس کی کامیابی کہانی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ کہانی میں لطف صرف ایک قسم کی کشمکش یا جد و جہد سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ کشمکش ہیرو کی ذہنی کشمکش بھی ہوسکتی ہے۔ یا مختلف ہستیوں کی جد و جہد ایک دوسرے کے خلاف بھی ہوسکتی ہے۔ خود کردار اپنے حالات سے بھی کشمکش میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اگر یہ کشمکش معمولی قسم کی ہو اور اُس کا اظہار مزاحیہ طور پر ہو تو ایسے ڈراما کو فارس (Farce) یعنی نقل یا سوانگ کہا جاتا ہے۔ اگر یہ کشمکش سنجیدہ قسم کی ہو اور کہانی کا انجام اچھا ہو تو ڈراما کامیڈی (Comedy) یعنی داستان مسرت کہلاتا ہے۔ اور اگر انجام بُرا ہو تو ڈراما ٹریجڈی (Tragedy) یعنی داستان غم کہلاتا ہے۔ اگر اعلےٰ درجے کے ڈراموں کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کشمکش۔ دلبستگی اور ایک حیرت آمیز انتظار یا متجسانہ اضطراب (Suspense) ہر ایک ڈراما کا ضروری جزو ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا موجود ہونا پلاٹ پیدا کرتا ہے۔

ڈراما نگار کہانی کو واقعہ کی صورت میں لانے کے لئے مختلف ترکیبیں کام میں لاتے ہیں۔ سب سے زیادہ اہمیت اُس میں مکالمے کی ہوتی ہے۔ اکثر واقعات کا بیان۔ کرداروں کے خیالات اور ان کے کیرکٹر کی مکالمے کے ذریعے سے پیش کئے جاتے ہیں۔ بہت سی باتوں کا اظہار اسٹیج کے ساز و سامان سے کیا جاتا ہے

بہت سے واقعات مثلاً لڑائیاں ۔ ہنگامے ۔ تقاریر وغیرہ بعینہٖ پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن مکالمہ پر ہی ڈرامے کی کامیابی کا زیادہ تر دار و مدار ہوتا ہے۔ پلاٹ ۔ کردار نگاری اور ڈرامے کی جامعیت (unity) اسی مکالمہ سے سرِ صورت اختیار کرتے ہیں ۔

ہماری پرانی سوسائٹی میں نقالوں بھانڈوں اور بھان متی کے کھیلوں کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما اپنی ابتدائی حالت میں یہاں موجود تھا اور اداکاری کا فن بھی بالکل ناپید نہیں تھا۔ اردو میں مستقل ڈراموں کا رواج تو انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا ہے۔ لیکن اس سے قبل بھی ہمارے ادب کی دوسری صنوف میں ڈرامائی عناصر موجود تھے۔ اور اس مقالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ ان عناصر کو تلاش کر کے پیش کیا جائے ۔

غزل: ۔ غزل میں ہر شعر بذاتِ خود مکمل ہوتا ہے گویا ایک جامع نظم کا کام دیتا ہے۔ بعض اوقات ایک غزل ایک مقصد پر حاوی ہوتی ہے اور اشعار میں باہمی رابطہ ہوتا ہے۔ ایسی غزلیں مسلسل کہلاتی ہیں ۔ غزل میں ہر طرح کے مضامین مثلاً عشقیہ ۔ صوفیانہ ۔ فلسفیانہ وغیرہ بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات غزل میں اعلیٰ درجہ کے ڈرامٹک اشعار بھی کہے جاتے ہیں۔ اشعار کی اس خوبی کا نام " محاکات " ہے ۔ شبلی محاکات کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں " کسی چیز یا کسی حالت کو یوں بیان کرنا کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے ۔ محاکات ہے ۔ تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں صرف ظاہری اور مادی حالات ادا کر دئے جاتے ہیں۔ اور کسی قدر جذبات کی تصویر بھی ہوتی ہے۔ لیکن محاکات میں سیکڑوں گونا گوں حالات ۔ واردات اور جذبات ایک ساتھ ادا کر دئے جاتے ہیں۔ تصویر سے صرف اس قدر اثر پیدا ہوتا ہے کہ جس قدر اصلی شے کے دیکھنے سے ۔ لیکن محاکات اصلی سے زیادہ اثر کو تحریک دیتا ہے " اور یہی فرق ڈرامائی طرزِ ادا اور قصہ کے بیان میں ہے ۔

کامیاب غزلوں میں ایسے اشعار جو جذبات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کو سنکر وہی کیفیت ہم میں پیدا ہو جائے جو شاعر چاہتا ہے ۔ اکثر پائے جاتے ہیں۔ اور ایسے اشعار جو نظر کے سامنے چلتی پھرتی تصویریں کو پیش کر دیتے ہیں بہت وافر ہیں ۔ مثلاً یہ اشعار واقعات کی یوں تصویر اتارتے ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے ۔

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ — ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا (میرؔ)

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے — اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آئے (")

اُن کے آنے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے (غالبؔ)

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں (")

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ — یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت (")

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پر ہے یقین یاں رہ گیا واں رہ گیا (آتشؔ)

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

کبھی ہے شام غم مصیبت کبھی ہے صبح بہار عشرت
کوئی تلون مزاج شاید حجاب لیل و نہار میں ہے (اشرفؔ)

یہ کیفیت زیادہ تر اعلےٰ تشبیہ اور استعارات سے پیدا کی جاتی ہے۔ بعض اوقات جذبات کو واقعات کی صورت میں کامیابی سے پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ نسیمؔ یوں بیان کرتے ہیں ؎

خاک دیکھا کچھ شبستان جہاں میں اے نسیمؔ — ڈھیر پروانوں کا تھا شمع سحر کے سامنے

اپنی طبیعت کی یاس کو غالبؔ اس طرح سر و صورت دیتے ہیں ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

شادؔ اپنے ضبط کے پیمانے کو اس طرح چھلکتا ہوا دکھاتے ہیں ؎

اشک بھر آئے جس جگہ اُٹھ گئے اُس مقام سے
آج تلک بچائے ہیں عشق کی آبرو کو ہم

اسی ڈرامائی طرز بیان کی ایک صورت معاملہ بندی ہے۔ ہمارے شعرائے متقدمین کے دیوان معاملہ بندی کے اشعار سے بھرے پڑے ہیں۔ اکثر انہیں سفلی واقعات کی تصویریں ہیں۔ یہ اکثر عاشق و معشوق کے اختلاط کا بیان ہوتا ہے۔ بعض اوقات شعرا تہذیب اور اخلاق کی حدود سے آگے نکل جاتے ہیں۔ پھر بھی بہت

سے پاکیزہ اشعار معاملہ بندی کے اچھے نکل آتے ہیں۔ مثلاً ظفر ؎

نہ بولے منہ سے وہ اور ہم ہوئیں پر چار جب آنکھیں — رہی اک ٹکٹکی دو دو پہر دونوں کی جانب سے

نظام رامپوری ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ — دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

شاد ؎

جب میں کہتا ہوں گوارا میری ذلت نہ کرو — سر جھکا لیتے ہیں کہتے ہیں محبت نہ کرو

داغ اور شعرائے لکھنؤ کے ہاں معاملہ بندی کا خاص التزام کیا گیا ہے۔

جس طرح ڈراموں میں بعض اوقات سین (مناظر) صرف پس منظر کا کام دیتے ہیں اور اُن کا مقصود ایک خاص کیفیت پیدا کر دینا ہوتا ہے۔ اسی طرح اردو شعرا بعض اوقات پوری کی پوری غزل میں ردیف اور قافیہ کے تکرار یا دیگر لفظی صنائع سے مناسب پس منظر پیدا کر دیتے ہیں۔ اور وہ غزل ایک خاص کیفیت رکھتی ہے۔ غالب کی بعض مسلسل غزلیں یہ کیفیت کامیابی سے پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً اگر اس غزل کو ؎

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا — شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

شروع سے آخر تک پڑھا جائے تو کرب و بیچینی کے بعد یاس اور حزن کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح غالب کی یہ غزل بہت اعلےٰ درجہ کی سالی لوکی (کردار کی اپنے دل سے تقریر) ہے ؎

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا — ہوئی معزولئ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب — کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

میر کی بعض غزلیں بھی یاس کی کیفیت خوب ادا کرتی ہیں اور شعراء کے ہاں بھی یہ ڈرامائی خوبیاں ملتی ہیں۔ اچھے استعارے عموماً ڈرامائی کیفیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ استعارے جو حرکت سے لئے جائیں اس خصوصیت سے اور بھی زیادہ متصف ہوتے ہیں۔ غالب کے ہاں اس طرح کے استعارے بہت ہیں اُنکی تصویریں

انتہائی شوخ رنگوں سے مزیّن ہوتی ہیں اور ان میں انتہائی حرکت پائی جاتی ہے اس شعر میں ؎

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

مدت زندگی کی تصویر نہایت خوبی سے آنکھ جھپکنے اور رقص شرر کے استعارہ سے پیش کی گئی ہے۔ حرکت اور رنگ آمیزی دونوں موجود ہیں۔ اسی طرح ؎

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

میں زندگی کو ایک برق دم گھوڑے سے تعبیر کیا ہے۔

غزلوں میں بعض اوقات مکالمے بیان کئے جاتے ہیں۔ جو اگر کسی ڈرامے کا جزو کر دئے جائیں تو اُس کو چار چاند لگا دیں یہ ظاہر ہے کہ تنگنائے غزل میں طول طویل مکالمے تو سما نہیں سکتے لازماً مختصر ہی ہوتے ہیں۔ ایک قطعہ بند غزل قاضی محمد صادق خاں اختر کی بطور مثال پیش کی جاتی ہے ؎

کل بن کے شیخ مجتہد عصر سا قیا دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا
کہنے لگا زراہ تبختر مجھے بطنز معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں کیجے نہ مجھ کو آپ جو مورد عتاب کا
تقوے ہمارے آگے ہو جب آپکا درست اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا
مے ہووے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش اور واں مخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے گر پی نہ جائے جلد یہ ساغر شراب کا
اُس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا

اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

واسوخت:۔ انگریزی ادب میں رابرٹ براؤننگ نے "ڈرامیٹک مانولوگ" یعنی انفرادی ڈراما کو بڑا

فروغ دیا اس انفرادی ڈراما میں صرف ایک ہی شخص کسی خاص واردات یا حکایت کو نثر یا نظم میں یا ایک ہی وقت دونوں نثر اور نظم میں اس طرح بیان کرتا ہے گویا اُس پر اسوقت خود وہی واقعات گزر رہے ہیں۔ اور وہ اس واقعہ کا ایک پیکر متحرک بن جاتا ہے۔ ہمارے ہاں داستاں گو اور مرثیہ خواں اس طرح کے بیان میں مہارت رکھتے ہیں۔ علاوہ مرثیہ خوانی اور داستاں گوئی کے واسوخت بھی بڑی حد تک انفرادی ڈرامے کے لوازمات کو پورا کرتے ہیں۔ واسوخت میں ابتداءً شاعر عشق و محبت سے اپنی بیگانگی ظاہر کرتا ہے۔ پھر اپنا گرفتار محبت ہونا بیان کرتا ہے۔ ایک مدت تک مصائب و آلام فراق جھیل کر وصال حاصل کرتا ہے۔ چند روزہ مسرت کے بعد اغیار یا اقربائے محبوب خلل انداز ہوتے ہیں اور محبوب کج ادائی شروع کرتا ہے۔ عاشق کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے۔ وہ محبوب سے ازراہ طنز و تشنیع کہتا ہے کہ تجھ سے زیادہ حسین محبوب تلاش کروں گا۔ جو میرا مطیع ہوگا۔ اُس وقت تو شرمندہ ہوگا۔ اور اپنے جور و جفا پر نادم۔ غرض اسی طرح کے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ اس میں اکثر محبوب مخاطب ہوتا ہے اور کبھی کبھی سامع۔ امانت نے واسوخت کی ابتدا کی۔ امیر کے واسوخت اپنی طرز میں بے مثال ہیں ان میں لکھنؤ کے دور عشرت کا نقشہ کھنچا ہوا ہے۔ وہاں کے رسوم و آداب۔ انداز مجلس اور سامان آرایش۔ کی تصویریں اُن میں نظر آتی ہیں۔

قصائد۔ اردو کے قصائد میں تشبیب کبھی کبھی ڈرامائی طرز پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ مکالمہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ سودا کے بعض قصیدے مکالمہ سے شروع ہوتے ہیں۔ نواب احمد علی خاں کی مدح میں یہ تشبیب بڑے اچھے مکالمہ میں لکھی گئی ہے:۔

ہے سخن سنج اک جوان متین — فخر صائب جو وہ کرے تحسین
رات جاکر میں اُسکی خدمت میں — اُسے دیکھا تو تھا بہت غمگین
میں جو پوچھا کہا سبب مت پوچھ — خبث کرنا کسو کا خوب نہیں
لیکن اے یار تجھ سے کہتا ہوں — سن کے گو تجھ پہ سب کریں نفریں

بسنت خاں کا مشہور قصیدہ ؎

کل حرص نام شخصے سودا پہ مہرباں ہو — بولا نصیب تیرے سب دولت جہاں ہو

بھی مکالمہ سے شروع ہوتا ہے۔ قصیدہ در نصائحِ فن شعر و طعن بر شاعری و در مدح مہربان خاںؒ سوائے چند آخری اشعار مدح کے شروع سے آخر تک دلچسپ مکالمہ ہے۔ مطلع ہے۔

جب کہے موردِ تحسین ہیں اکثر اشعار   کہا استاد نے مجھسے مرے سُنکر اشعار

سوداؔ کے شہر آشوب میں فطرت کی مصوری بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے۔
غالبؔ کا قصیدہ ؎

ہاں مہہ نو سُنیں ہم اُس کا نام   جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

بڑی اچھی تقریب ہے۔ ذوق کے اکثر قصائد کی تشابیب میں مکالمے اور مناظر فطرت پیش کئے گئے ہیں۔

مرثیہ:۔ اردو میں مذہبی مرثیے بھی اعلیٰ درجہ کے انفرادی ڈرامے ہیں (ڈرامٹیک مونولوگ) میرانیس اور میرزا دبیر نے اس صنف سخن کو معراج کمال کو پہنچا یا۔ اُن کے مرثیوں میں واقعات کربلا بڑے ڈرامائی طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔

خود واقعہ کربلا دنیا کے عظیم ترین حزنیہ واقعات میں سے ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا مدینہ سے کربلا کا سفر، وہاں سوائے چند نفوس کے جو تعداد میں بہتر سے زائد نہ تھے سب کا ساتھ چھوڑ دینا۔ اور جن لوگوں نے بلایا تھا اُن کا بیوفائی کرنا۔ پھر اُسی میدان کرب و بلا میں اُن کا دشمن کی سپاہ میں گھر جانا۔ تین روز تک سامان خور و نوش کا بند رہنا۔ اُن بہتر آدمیوں کا باری باری جانبازی سے جنگ کرنا۔ حضرت عباسؑ کی نہر فرات پر معرکہ آرائی، حضرت عون و محمد کی شہادت اور آخر میں خود حضرت امام حسینؑ کی شہادت خود ایسے واقعات ہیں کہ جن کا بیان ہی ذہن میں تصویریں کھینچ دیتا ہے۔ لیکن ان واقعات کو جس طرح سے انیسؔ و دبیرؔ نے بیان کیا ہے وہ بہت ہی ڈرامائی ہے۔

میر انیس کو مرقع نگاری میں کمال حاصل تھا۔ صبح کا سماں۔ طلوع آفتاب۔ نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے شام کا سہانا وقت۔ چاندنی کا لطف۔ یا تاریکی کا بھیانک منظر سب آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ غرب کی دوپہر کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لوں کا وہ چلنا وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا اور تن پہ حرارت سے وہ ہتھیاروں کا جلنا
جنگل کے پرندے سبھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہ مظلوم کھڑے ہیں

خوفناک جنگل کا سماں اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچّے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچّے

تلوار کے چلنے۔ گھوڑوں کے بڑھنے۔ اور میدان جنگ کے مناظر ان کے ہاں اور میرزا دبیر کے ہاں کمال خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔ خصوصاً جنگ کی کیفیت ہر مرثیہ میں بڑے اہتمام اور التزام سے دکھائی گئی ہے۔ میر انیس گھوڑے کی تصویر یوں کھینچتے ہیں ؎

سمٹا۔ بہا۔ اڑا ادھر آیا ادھر گیا جمکا۔ بڑھا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں سے بے خطر گیا برہم کیں صفوں کو پروں سے گذر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اسکی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سر وہی کا وار تھا

میر انیس کو اظہار جذبات میں بھی کمال حاصل ہے۔ اور ساتھ ہی کہنے والے کی عمر اور جنس۔ موجودہ حالت وغیرہ کا بھی پوری طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ اُن کے مکالمے کردار نگاری کے اعلےٰ نمونے ہیں۔ ایک ایک لفظ متکلم کے کیرکٹر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اُن کے ہر ایک مرثیہ میں ایسے مکالمے موجود ہیں اور ان سے اُن کی اصول ڈراما نویسی سے کماحقہ واقفیت کا اندازہ اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ علی اکبرؓ کو جنگ کی اجازت دینے کے موقعہ پر بی بی زینبؓ کی زبان سے ماں کی فطری محبت کا موازنہ پھوپھی کی محبت سے کیا ہے ؎

سچ ہے کہ اُس کی جاہ سے نسبت مجھے کہاں — ہوں لاکھ انکی چاہنے والی وہ پھر ہے ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جان — آج آمنا کی ہے وہ قیامت کہ الاماں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خیر ہے
ماں ہو تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

اسی قسم کی کردار نگاری اور واقعات کی مصوری بڑے پُرجوش طریقہ پر اُردو کے اعلےٰ مرثیوں میں موجود ہے

مثنوی:۔ اُردو میں مثنوی بھی ایک بڑی اہم صنف شعر ہے۔ اچھی مثنویوں میں واقعات کو بالکل اسی طرح پیش کیا جاتا ہے گویا ہمارے سامنے ڈراما ہو رہا ہے۔ مثنوی سحرالبیان میں اُسوقت کے امراء کی شان وشوکت مصائب اور جدائی کے نقشے۔ شادی بیاہ کے سامان۔ اور اسلامی حکومت کے آخری دور میں سلاطین اور امراء کے ہاں جو جو حالتیں ایسے موقعوں پر گذرتی تھیں ان کا لعینہٖ چربہ اتار دیا گیا ہے۔ موقعہ بموقعہ مناظر پیش کرنا اس مثنوی کی خصوصیت ہے۔ یہ بالکل الزبتھ کے عہد کے دراج (*Pageants*) کی طرح ہماری نظروں کے سامنے سے گذرتے ہیں۔ شاہزادہ بے نظیر کے پیدا ہونے پر جو دھوم دھام ہوئی اُسے یوں بیان کیا گیا ہے ؎

وہ نذریں خواصوں کی کوچونکی لے — انہیں خلعت و زر کا انعام دے
کہا جاؤ جو کچھ کہ درکار ہو — کہو خانساماں سے تیار ہو
نقیبوں کو بلوا کے یہ کہہ دیا — کہ نقارخانوں میں دو حکم جا
کہ نوبت خوشی کی بجادیں تمام — خبر سُنکے یہ شاد ہوں خاص وعام
یہ مژدہ جو پہنچا کہ نقار چی — لگا ہر جگہ بادلہ اور زری
غلاف انپہ بانات پر زر کے ٹانک — شتابی سے نقاروں کو سینک سانک
بجے شادیانے جو واں اُس گھڑی — ہوئی گرد و پیش آکے خلقت کھڑی
سنی جھانجھ نے جو خوشی کی نوا — تھرکنے لگا تالیوں کو بجا
محل سے لگا تا بدیوان عام — عجب طرح کا اک ہوا اژدہام

دئے شاہ نے شاہزادے کے ناوں مشائخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر لشکر کو زر وزیروں کو الماس و لعل و گہر

مکالمات بھی بعض مثنویوں میں بہت اچھے ہیں اور کردار نگاری کے اچھے نمونے ہیں۔ میر حسن کی سحرالبیان میں شاہزادہ بے نظیر کو باغ میں دیکھ کر بدر منیر کی الّھڑ خواصوں کی گفتگو ملاحظہ ہو ؎

کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا کسی نے کہا چاند ہے یاں چھپا
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
کسی نے کہا دیکھیوا لے بوا کھڑا ہے کوئی صاف یہ مردوا
کسی نے کہا یہ تو دلدار ہے کسی نے کہا کچھ یہ اسرار ہے

اُن کی حیرت و استعجاب کا اظہار خود ان کی عقل کے مطابق خوب کیا گیا ہے۔

مثنوی گلزار نسیم میں مکالمات کا التزام بڑے فن کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مثلاً بکاؤلی آدمی زاد بن کر زین الملوک کو ملتی ہے تو سلطان اور بکاؤلی میں یہ گفتگو ہوتی ہے۔ سلطان نے ؎

پوچھا اے آدم پری رو انسان ہے پری ہے کون ہے تو
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے ہے کون سا گل چمن کدھر ہے
دی اُس نے دعا کہا بصد سوز فرخ ہوں شہا میں ابن فیروز
گُل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام کیا لیجیے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت پوچھا کہ طلب کہا قناعت

اپنی ڈرامائی خصوصیات کی وجہ سے مثنوی کو اُردو میں ڈراما اور "ایپک" یعنی رزمیہ نظم کا جواب کہا جا سکتا ہے۔

[illegible] کی تدوین کے بعد داستان امیر حمزہ" اور "طلسم ہوشربا" کی داستانوں کی اہمیت کو [illegible] نے محسوس کیا الف سے

مصوری کی گئی ہے اور باغوں کے نقشے دکھائے گئے ہیں۔ کہیں سراپا کھینچے گئے ہیں۔ کہیں قوت بیان کے زور سے جذباتی کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان میں مکالمے بھی اعلیٰ درجے کے پائے جاتے ہیں۔ کہانی سے کہانی نکل آتی ہے۔ یہ داستانوں کے مجموعے حقیقت میں آلی کے "نوویلا" کی طرح ہیں۔ طلسم ہوشربا میں خصوصاً ڈرامائی خصوصیات بہت ہیں۔ رزم اور بزم کی کیفیات دکھائی گئی ہیں۔ مکالمات اور کردار نگاری کے لحاظ سے بھی بعض حصص قابل تعریف ہیں۔ یہی نہیں کہ صرف واقعات تاریخ کی طرح ذہن میں آئیں۔ بلکہ اُنکی نثراتنی تخیّلی ہے کہ ساتھ ہی ساتھ واقعات ناٹک کے نظاروں کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرتے جاتے ہیں۔ ملکہ حیرت۔ کوکب روشن ضمیر۔ اسد ابن کرب غازی لالان خون قبا داؤد جادو۔ عمرو عیار اور ایسے ہی بیسیوں اور کردار نہ صرف کہانی میں ایکٹر ہیں۔ بلکہ بذاتہٖ ان میں سے ہر ایک اپنا ایک خاص کیرکٹر رکھتا ہے۔ جس کا نام سنتے ہی ہم اُس کا تصور ذہن میں قائم کر لیتے ہیں یہ صحیح ہے کہ وہ زمانہ تصنیف کی سوسائٹی کا پورا عکس نہیں ہیں اور نہ بھی وہ عام انسان ہیں۔ لیکن خیالی داستانوں میں اردو کے ان زندہ جاوید کرداروں کا رتبہ بہت بلند ہے۔ اور اپنے ماحول میں وہ خوب واضح طور سے دکھائے گئے ہیں۔

"فسانہ آزاد" کا طرز بیان بھی ڈرامائی ہے۔ منشی لشن نرائن در اُس کے متعلق لکھتے ہیں۔ "اگرچہ پلاٹ بذاتہٖ زیادہ دلچسپ نہیں ہے۔ لیکن دلکش جیتی جاگتی تصویریں الفاظ کا جادو۔ تخیّل کی کثرت مناظر کی چونچالی ایسی ہے کہ جب تک اُس آئینہ خانہ سے گذرتے ہیں تو کچھ شک کچھ یقین کرتے ہوئے ایک طلسم ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست بازیگر نے اپنے کرتبی ڈنڈے سے یہ سارا سماں باندھ دیا ہے۔" فسانہ آزاد میں ساری خوبی اشخاص قصہ کی باتوں میں ہے نہ کہ نفس قصہ کے بیان میں۔ سرشار مکالمہ کے اُستاد ہیں اور کیرکٹر نگاری کی خوبیاں طول طویل بیان سے نہیں بلکہ خود اُن اشخاص کی گفتگو سے نہایت کامیابی کے ساتھ دکھاتے ہیں۔

سرشار نے لکھنؤ کے اُس زمانہ کی سوسائٹی کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ اور اُن کے اشخاص گوشت پوست کے زندہ اشخاص ہیں۔ بٹیر باز۔ تپنگ باز۔ افیمی۔ زرق برق نواب۔ رنڈیاں۔ فقیر۔ بنگالی بابو اپنی مہین دھوتیوں کے ساتھ۔ غرض ہر قسم اور ہر قماش کے لوگ موجود ہیں لیکن کردار نگاری میں وہ اصلیت کے

ساتھ مبالغہ کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُنکے کرداروں میں ڈکنس اور تھیکرے کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اپنے اشخاص میں سے وہ خاص اور امتیازی باتیں چن لیتے ہیں۔ اور پھر اُنکی گفتگو کو ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہی ملنگے اشخاص کے اس جم غفیر میں "گیدیوں کے قبلہ گاہ۔ بدیوں کے پشت پناہ۔ گاودیوں کی جان بلکہ روح رواں دیوار حماقت کے پشتیبان میاں خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع عرف خوجی" آزاد اور حسن آرا غیر فانی کیرکٹر ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ سرشارؔ ایک سچے آرٹسٹ کی محنت اور شوق کے ساتھ کام کرنے سے جی چراتے تھے۔ اسی وجہ سے باوجود ایک خاص ڈرامائی استعداد رکھنے کے وہ مستقل ڈراما نہیں لکھ سکے۔ اور صرف واقعات کو ڈرامائی مناظر (Episodes) میں لکھدینے پر ہی اکتفا کر گئے۔ اکثر جگہ شکرم میں مسافروں کی گفتگو۔ سراؤں میں دلچسپ مکالمے میلوں تماشوں میں آزاد اور اُنکے ساتھیوں کی بھبتیاں۔ نوابوں کی بزموں میں مصاحبوں کی نوک جھوک۔ اسیطرح سائیسوں۔ بھٹیاروں وغیرہ کی گفتگوئیں اعلےٰ درجے کے ڈرامائی سین ہیں۔ جو تھوڑے سے ردوبدل کے بعد اچھے خاصے ایک ایکٹ کے ڈرامے بن سکتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے لکھنؤ کی براتوں اور میلوں کو بڑی رنگ آمیزی سے پیش کیا ہے۔ شررؔ کے ناولوں میں بھی جنگوں کے نقشے اعلےٰ ڈرامائی طریقے پر کھینچے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور کے تحریر کرنے سے یہ مقصد تھا کہ بعض احباب کے اس دعوے کی تردید ہو جائے کہ اُردو زبان میں ڈراما لکھنے کی اہمیت نہیں ہے۔ اس وقت تک اچھے اچھے ڈرامے مستقل تصانیف کی حیثیت سے لکھے جا چکے ہیں۔ ڈرامائی عناصر ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی تقریباً ہر طرح کی تصانیف میں موجود رہے ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیبوں کی استعداد فطری (Genius) ڈراما سے اختلاف نہیں رکھتی۔ پس ڈراما ہمارے ہاں بھی وہی معراج کمال حاصل کر سکتا ہے جو یونانی زبان میں یوریپڈیز (Euripides) اور سوفوکلیز (Sophocles) کے ڈراموں نے حاصل کی اور جو انگلستان میں شیکسپیر کے ڈراموں نے حاصل کی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ادیب اُن عناصر کو ڈراما کی ترکیب فنی (Technique) کے مطابق مستقل ڈراموں کی حیثیت میں پیش کریں۔ اُردو بھی اسی سرزمین کی پیداوار ہے جس نے کالیداس اور بھوبھوتی جیسے ڈراما نگار پیدا کئے ہیں۔ ڈراما اُردو میں ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اگرچہ ارتقا کی اولین منازل میں ہے۔ لیکن وسائل اور استعداد فطری موجود ہیں اور وہ دن دور نہیں جب اُردو میں اعلےٰ درجہ کے ڈرامے لکھے جائیں گے۔

تاثراتِ حبیب

از حبیب احمد صدیقی بدایونی متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

موسم ناؤنوش ہے ابر ہے جو بہار ہے — کاش کہ جلد آئیں آپ۔ آپکا انتظار ہے
خالقِ کائنات کو ناز ہے حسن و عشق پر — عشق بھی شاہکار ہے حسن بھی شاہکار ہے
کیسی بہار کیا شمیم۔ کیسا نکھار کیسا نسیم — تیرے بغیر ہر نفس۔ ذوقِ جنوں پہ بار ہے
کس سے کہوں کہ جذبِ دل ورد وبال بنگیا — عشق تو بیقرار تھا حسن بھی بیقرار ہے
دیکھ کے رندِ مست نے جام و سبو اُلٹ دئے — کس کی نگاہِ مے فروش بزم میں گرم کار ہے
آہ یہ میں نے کیا کیا۔ قصۂ غم سنا دیا — ہائے وہ جانِ آرزو مضطر و شرمسار ہے
تیرے نصیب میں کہاں ایسی بلندیاں خرد — عشق کی عظمتیں نہ پوچھ۔ حسن کا رازدار ہے

وہ نہ ملیں تو اے حبیبؔ یاد سے اُنکی کام رکھ
اُن پہ نہیں ہے اختیار۔ دل پہ تو اختیار ہے

خیالاتِ پریشاں

جناب سید ابن حسن صاحب شارق دہلوی

پیدا ہو جو ملت میں وہی جذبۂ بے باک — پھُنک جائے یہ تہذیبِ نوی کا خس و خاشاک
ہے صورِ سرافیل کی آواز فضا میں — آمادہ ہے شق ہونے کو شاید کرۂ خاک
پستی سے اگر ہے تری فطرت متنفر — تو خاک سے مُنہ موڑ کے اُڑ جانبِ افلاک
اُٹھ اور پکڑ بڑھ کے پھر اُمید کا دامن — کیوں بیٹھا ہے تو سر کو جھکائے ہوئے غمناک
باقی ہے ابھی تیری زمانے کو ضرورت — محتاجِ ہدایت ہے خلائق تہِ افلاک

میاں نظیر

جناب سید ابن حسن شارق ایم۔اے (پریویس)

نظیر تخلص ولی محمدؔ (۱۷۴۰-۱۸۳۲) نام دہلی میں پیدا ہوئے۔احمد شاہ ابدالی نے جب دہلی کو تاراج کیا تو ان کا گھرانا نقل مکان کر کے اکبر آباد چلا آیا یہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی لیکن چونکہ جب دودمان دھلی کے یہ چشم وچراغ تھے اس کی زبان کو ترے ڈھلی ہوئی ٹکسالی زبان شاہجہاں آبادی تھی اس لئے ان کا کلام صاف و سادہ ہے۔استعارات وصنائع بدائع سے پاک غیر فطری مبالغہ آمیزیوں سے بلند۔فارسی تراکیب اور دقیق تشبیہات کے بوجھ سے اُن کی نظمیں بوجھل نہیں ہیں۔تنقید جدید کی کسوٹی پر پرکھنے والے ناقد اُن کے کلام کو بعض حیثیتوں سے اُستادی کے درجہ سے گرا ہوا بتاتے ہیں۔تہذیب کی مروجہ اخلاقی اقدار جن سے اس عظیم الشان ایشیائی شاعر کی بے پناہ شاعری کا اندازہ لگایا جاتا ہے نوساختہ اقدار ہیں جن کی زنجیروں میں ایک ترجمان العصر کو جکڑا نہیں جا سکتا وہ ایک ترقی پسند شاعر تھے اور غالباً ہندوستان کے سب سے پہلے ترقی پسند شاعر تھے جنہوں نے مذہبی اور عصبی امتیازات سے بلند ہو کر سماج کا ایک عامی کی حیثیت سے مطالعہ کیا اور ایک عام زاویہ نگاہ سے اس کی نقاشی کی نہ وہ خود بورژوا طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور نہ انہوں نے کبھی خدا کی اس عجیب مخلوق کی خوشامد کی لکھنؤ کے نواب سعادت علی خاں نے ان کو بڑے اعزاز و اکرام سے بلانا چاہا۔راجہ صاحب بھرت پور نے بہ منت طلب کیا۔لیکن اُن کے پائے استقامت کو جنبش نہیں ہوئی اور طبع مستغنی پر مطلق اثر نہ ہوا۔لالہ بلاس رام کے لڑکے کو بمشاہرہ سترہ روپیہ ماہوار پڑھاتے رہے اور ایک رنگین مزاج نوجوان کی طرح دنیا کا تماشہ دیکھتے اور لذت اُٹھاتے رہے۔یہ دعوٰی کہ وہ صوفی مشرب۔فقیر حال مست اور خاموش طبع انسان تھے غلط ہے۔ اُن کے کلام اور حیات دونوں سے اس کی تردید ہوتی ہے۔مذہباً وہ ہمہ اوست کے ضرور قائل تھے اور تعصب و فرقہ پرستی سے بلند لیکن اپنے زمانہ کی معاشرت کا وہ اس قدر گہرا مطالعہ و اس شدت کے ساتھ کر رہے

تھے کہ اُن کو ہر ہر کام میں عملاً شریک ہونے میں لطف آتا تھا وہ سوسائٹی کی روح اجتماعی میں سرایت کر گئے تھے اور اُنہوں نے جماعت کی انتہائی گہری تہہ میں پہونچکر اُس کو دیکھا تھا۔ اگر وہ مناظر قدرت کی عکاسی کرتے ہیں اور برسات اور بہار کا سماں کھینچتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی تیراکی کے میلے اور ریچھ کے بچے پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں۔ وہ ورڈزورتھ کی طرح صرف مطالعہ فطرۃ میں محو ہوکر چاند سورج شفق اور چاندنی رات ہی کے ہوکر نہیں رہ جاتے بلکہ شیکسپیر کی طرح وہ ہمہ داں ہیں جب وہ بے جان چیز تک میں رُوح و حیات ڈال دیتے ہیں تو اُن کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ ہولی دیوالی عید بقرعید پر کچھ نہ لکھیں جو ہماری معاشرت کے ضروری تہوار ہیں اور جن سے ہزاروں لاکھوں انسان اپنے جذبات کو متاثر کرتے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ہمہ گیری میں فواحش و ہزلیات بھی نہیں چھوڑتے۔ اسی وجہ سے اُن کا کلام رکیک اور مبتذل ہوگیا ہے۔ علامہ شبلی تک نے یہ فتوٰی دیدیا ہے کہ نظیر کے کلام میں ابتذال نہ ہوتا تو میر تقی میر کے کلام سے ٹکر کھاتا اُنکی اوباشانہ روش اور آزادانہ طرز حیات کی جھلک جو ہم کو اُن کے کلام میں دکھائی دیتی ہے اکثر ناقدین کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ وہ جس وقت کوئی حقیقت عریاں بیان کرتے ہیں تو در اصل نہ تو وہ خاص اپنے احساسات کی تصویر کشی کرتے ہیں نہ کسی دوسرے انسان کی بلکہ وہ سماج کے ایک گھناونے پہلو سے پردہ ہٹاکر اُسے ننگا دکھا دیتے ہیں لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہماری علیل سماج کے اکثر پہلو بدنما اور دوزخ نگاہ ہیں۔ جو شخص سماج کے سچے جذبات کی ترجمانی کے فرائض انجام دے رہا ہو اور جس پر معاشرت کی مصوری کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو وہ از روئے انصاف ان حقائق کو نظر انداز نہیں کر سکتا اگر ہماری معاشرت میں مصائب موجود ہیں تو وہ منظر عام پر ضرور آنے چاہیں۔

ایک ترقی پسند شاعر کی تیز نگاہوں سے بچکر اسقام پنپ سکتے ہیں دور نہیں ہو سکتے یہاں ہم کو یہ بات مان لینی ہوگی کہ علاوہ ایک ترقی پسند اور نیچرل شاعر ہونے کے وہ ایک ناصح اور مصلح کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کی پند اور اُن کی موعظت کبھی بالواسطہ ہوتی ہے اور کبھی بلا واسطہ بلا واسطہ تو جب وہ شیخ سعدی کی طرح نصیحت کا دفتر کھول بیٹھتے ہیں اور بالواسطہ جب وہ محض تصویر کشی کرکے اُس کو ادھورا چھوڑ دیتے ہیں اب یہ دیکھنے والے کا کام ہے کہ وہ اُس سے کیا سبق حاصل کرتا ہے۔ فقیرانہ

بلی نامے۔ پتنگ بازی۔ مرغ بازی سب میں اُن کی اخلاقی تعلیم موجود ہے۔

جس وقت میاں نظیر پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں ایک عجیب سیاسی ابتری پھیلی ہوئی تھی اس لئے وہ قدرتاً غم پسند ہیں لیکن کیسے غم پسند جو کھیل تماشوں سے جی بہلا کر بچوں کی طرح غم غلط کر رہا ہو جو دنیا کو فلسفیانہ نگاہ سے نہیں بلکہ ایک سیدھے سادے بھولے بھالے طفلِ شیرخوار کی نگاہ سے دیکھ رہا ہو۔ اُس انقلابی پُرآشوب عہد میں جبکہ دولت و ثروت ڈھلتی پھرتی چھاؤں تھی۔ پوتڑوں کے امیر چشم زدن میں فقیر بنائے جارہے تھے۔ ایک شاعر کا دنیا اور اُس کے لوازم سے بیزار ہو جانا کوئی غیرمعمولی بات نہیں تھی تعجب تو اس امر پر ہوتا ہے کہ انہوں نے پھر بھی خیام کی طرح لذائذ دنیاوی سے متمتع ہوکر مرنے کو اپنا فلسفۂ حیات قرار دیا۔ ترک دنیا کی تعلیم دی لیکن اس طرح دی کہ دنیا کا کوئی مزہ بغیر چکھے نہ رہ جائے۔ وہ عوام الناس کے شاعر ہیں اور ہماری نیچرل شاعری کے باوا آدم ہماری معاشرت کے سچے مصوّر، کھرے نقاد اور بے لاگ ناصح ہیں۔ نہایت معمولی چیزوں کی وہ ایسی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ اُن کی وسعت نظر پر حیرت ہوتی ہے۔ جمہور انام کے خیالات اور جذبات کو بے تکلف۔ عریاں اُن ہی کی سوقیانہ زبان میں ادا کرنے میں اُن کو کمال حاصل ہے نہ وہ کسی کا قصیدہ کہتے ہیں نہ ہجو البتہ جو نظر آتا ہے اس کو بیان کرنے میں نہیں جھجکتے کسی بیرونی تحریک سے وہ شعر نہیں کہتے تھے بلکہ جب دل چاہتا تھا بے دریغ کہتے تھے اور بے نظیر کہتے تھے۔ یہ اُن کی لسانی دیانت داری ہے کہ وہ ہمارے عیوب بیان کرنے میں مطلق نہیں چوکتے اور ہم کو ہماری صورت شعر کے آئینے میں صاف صاف دکھا دیتے ہیں۔ اُن کی ظرافت میں انشا کا سا پھکڑ پن نہیں ہے کہ درباریوں کی طرح اپنے آقا کی خوشنودیٔ خاطر کے لئے جس کی چاہی بھٹی کردی اور جس کو چاہا خدا سے بڑھا دیا اُن کی ظرافت تازیانۂ نصیحت ہے۔

اُن کے کلام کو پرکھتے وقت یہ بات بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ وہ عقیدتاً ہندی تھے۔ ہندی ریت رسم اور زبان کے سچے پرستار تھے۔ انہوں نے دو لاکھ شعر کہے تھے جس کا بچا کھچا چھ ہزار شعر کا کلیات نولکشور نے شائع کیا ہے۔ "جذبات اپنے لئے الفاظ خود بنا لیتے ہیں" یہ بات اُن ہی کے کلام کو پڑھکر متیقن ہوجاتی ہے، لیلیٰ مجنوں اور ہیرا دیو کا بیاہ ایسے منظم ڈرامے ہیں جن میں کل محاسن شعری جمع ہیں۔ اُنکے دیوان کا

مطالعہ کرکے اس امر کا ثبوت مل جاتا ہے کہ اگر کوئی شاعر عربی اور فارسی زبانوں کا احسان اُٹھانا پسند نہ بھی کرے تب بھی ہماری زبان میں اس قدر الفاظ موجود ہیں جو ہر قسم کے مضامین کے بیان کی قدرت رکھتے ہیں اور ایک شاعر کو اُستاد بنا سکتے ہیں ایک ترقی پسند شاعر کی طرح اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ شاعری اور دیگر تمام فنون حیات انسان کے لئے ہیں۔ انسان شاعری کے لئے خلق نہیں کیا گیا۔ حیات انسانی کی اس قدر اہمیت پر عملاً اصرار کرنے والے سرمدی شاعر میاں نظیر ہیں وہ اُس وقت آگرہ میں عوام الناس کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے جس وقت انیس لکھنؤ کے امام باڑوں اور مجالس عزا میں رُلانے کے لئے اپنی رجزیہ نظمیں تصنیف کرتے تھے۔ زمانے نے دونوں کی قدر کی مذہبی تقدس وابستہ ہونے کی وجہ سے مراثی خواص سے اُتر کر متوسط طبقہ تک ہر دلعزیز ہو گئے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ نچلے طبقے اور اوسط طبقہ کی اکثریت میاں نظیر کی بے نظیر نظموں کی شیدائی ہے اور ہر غریب ہر فقیر کی زبان پر اُن کا عالمگیر کلام موجود ہے برسوں گذر گئے لیکن اُن کی سیدھی سادھی نظموں کی تر و تازگی مرجھانے نہیں پاتی اُن کی گرفت لاکھوں کروڑوں عوام کے ذہنوں پر اس قدر عرصے رہی اور اس شدت سے رہی ہے کہ اُن کو ہم اپنی زبان کا پہلا نیچرل ترقی پسند اُستاد نہ مانیں تو یہ ہماری بے انصافی بلکہ کم نگاہی ہو گی۔ اُن کے چند اقتباسات ہدیۂ ناظرین ہیں۔

خودی کی تعلیم:۔

لے آئنے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ — صورت بھی میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ
خال سیاہ اور خط مشکبار دیکھ — زلف و دراز طرۂ عنبر نثار دیکھ

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

خوشامد:۔

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے — آدمی جن و پری بھوت بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے — شاہ خسرو غنی شاہ و گدا راضی ہے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حق تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

فنا:- پڑھ علم گئے اس دنیا میں گر کامل ذی ادراک ہوئے — اور لاد کتابیں اونٹوں پہ ہر معنی کے دراک ہوئے
معقول پڑھے منقول پڑھے ہر منطق میں چالاک ہوئے — یاں جتنے علم کے دریا میں اُن دریا کے پیراک ہوئے
سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضئے پاک ہوئے

طفلی:- کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دودھ کے چھوٹے — ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے

خمسہ:- گو کہ ہے مے پینے میں بدنامیاں — عزت و حرمت کا جاتا ہے نشاں
ہم تو سمجھے ہیں یہ لا ساقی میاں — گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

روٹی:- جب ملی روٹی ہمیں سب نور حق روشن ہوئے — رات دن شمس و قمر شام و شفق روشن ہوئے
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے — اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

معاشی:- کہتے ہیں جس کو شرم و حیا ننگ و نام آہ — وہ سب حیا و شرم اڑاتی ہے مفلسی
قائم ہے جسم گو کہ نہیں کس غنیمت است — جیتے تو ہیں اگرچہ نہیں بس غنیمت است
سو عیش ہم کو گر نہ ملے دس غنیمت است — وقت خزاں چو گل نبود خس غنیمت است
پیری کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است
وز شاخ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

زر پرستی:- زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا — دکھ اس میں تری روح بہت پائیگی بابا
ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائے گی بابا — دولت جو تری مال ہے نہ کام آئیگی بابا
پھر کیا تجھے اللہ سے ملوائیگی بابا

پیسے ہی کا امیر کے دل میں خیال ہے پیسے ہی کا فقیر بھی کرتا سوال ہے
پیسہ بھی فوج پیسہ ہی جاہ وجلال ہے پیسے ہی کا تمام یہ جنگ وجدال ہے
پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

بہار:- شب کو چمن میں واہ واہ کیا ہی بہار تھی پھول کھلے تھے پھول پھول غنچے کھلے کلی کلی
بیلا چنبیلی رائے بیل موتیا جوہی سیوتی یا دصبا بھی چلتی تھی عطر گلاب میں بسی
حوض بڑے چھلکتے تھے نہر بلور بہتی تھی شوخ لعل میں غنچہ لب کے نتھوں کی تازگی
صبح کے ڈر سے ہڑبڑا یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آگئے مفت بہار لٹ گئی

نعت:- محمد رحمۃ اللعالمین ہے حبیب حق شفیق المذنبین ہے
رسول پاک ختم المرسلین ہے کوئی ایسا خدائی میں نہیں ہے
لگا تحت الثریٰ سے تا بہ افلاک

بے ثباتی عالم:-

کیا ہندو اور مسلماں کیا رند گبر و کافر نقاش کیا مصور کیا خوشنویس شاعر
جتنے نظیر ہیں اک دم کے ہیں مسافر رہنا نہیں کسی کو چلنا ہے سب کو آخر
دو چار دن کی خاطر یا گھر ہوا تو پھر کیا

نذرِ عقیدت

بخدمت جناب معظم و محترم خادم اسلام و مخدوم محمد علی جناح قائد اعظم ملت اسلامیہ ادام اللہ فیوضہم

مژدۂ عشرت بجاں آید ہمی | جاں بجانِ ناتواں آید ہمی
فرحت آگیں می وزد باد بہار | گل بسوئے گلستاں آید ہمی
اے علی گڑھ شاد باش و شاد زی | شادمانی راز ماں آید ہمی
گر تو کنعاں نیستی خود مصر باش | کاں عزیزت میہماں آید ہمی
قائد اعظم کہ نام نامیش | از دو نام خوش عیاں آید ہمی
اولین نام محمدؐ کنز عدم | بہر او بہر دو جہاں آید ہمی
دیگر آں نام علیؓ کنز مہر او | نور عرفاں خود بکاں آید ہمی
چوں سعادت یافت ست از ایں دو نام | او سعادت را نشاں آید ہمی
مہر ہستی و علی گڑھ خاور است | مہر سوئے خاور آں آید ہمی
عہد گل ہستی علی گڑھ گلستاں | عہد گل در گلستاں آید ہمی
یوسفی و ایں علی گڑھ ہست مصر | مصر یوسف را مکاں آید ہمی
کانگریس نازم کہ اینک قوم ما | رستہ از خواب گراں آید ہمی
لوث طینت بیں کہ ہر بد ذوق را | نام پاکستاں گراں آید ہمی
بر دعا ختم سخن سازم کہ طول | طبع نازک را گراں آید ہمی

باد ظلِ رحمت رب بر سرت
در نظر تا ظل عیاں آید ہمی

ہدیہ زہیدہ از نیاز کیش
غلام سجاد بسمل بدایونی

"سرسیدؒ کی شاعری"

سلطان احمد صدیقی (علیگ)

سرسیدؒ کو بحیثیت شاعر کوئی نہیں جانتا۔ ان کی شاعرانہ حیثیت ایک ایسی حقیقت ہے جو اب تک منظرِ عام پر نہیں لائی گئی۔ سرسیدؒ کی اُن کے زمانہ میں اس قدر موافقت اور ساتھ ہی ساتھ شدت سے مخالفت میں مضامین لکھے گئے، کسی میں ان کی شاعری کا ذکر نہیں آتا۔ تمام "تذکرے" اس بارے میں خاموش ہیں یہاں تک کہ ان کی کامل و مکمل سوانح حیات "حیات جاوید" میں بھی اس چیز پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ اس کا سب سے بڑا سبب غالباً یہ ہوسکتا ہے کہ اس عظیم المرتبت شخصیت کی دوسری بے نظیر خصوصیتیں اس قدر اہم اور نمایاں تھیں جن کے آگے شاعری کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔ دوسرے سرسیدؒ نے شاعری کو دوسروں کی طرح اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ چنانچہ ان کے ایک ہمعصر تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ "شاعری دون مرتبہ اُوست" جو کہ بالکل درست ہے۔

ان کی اعلیٰ دماغی قابلیتوں کی موجودگی میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان کی بلند حوصلہ طبع اس مذاق لطیف کی طرف توجہ نہ کرتی۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے طرز تمدن، شرفا کا طریقہ معاشرت اور اُردوئے معلیٰ سے سرسیدؒ کا خاندانی تعلق ایسے امور ہیں جو ان کے شاعرانہ مذاق کی ضمانت کے لئے کافی ہیں۔ پھر سرسیدؒ دہلی میں پیدا ہوئے جہاں کے ہر گلی کوچے میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ ٹمٹما رہا تھا سلطنت و حکومت کا دائرہ بہت محدود ہوگیا تھا تاخت و تاراج کی وجہ سے شاہی خزانے خالی ہوچکے تھے۔ خاندان مغلیہ کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر خود بڑے اچھے شاعر تھے اور شاعروں کے قدردان بھی۔ انکا دربار اکثر بزم سخن کا منظر پیش کرتا تھا۔ غالبؔ۔ ذوقؔ۔ مومنؔ۔ احسانؔ وغیرہ اپنی شاعری کی آب و تاب سے دہلی کی رونق بڑھا رہے تھے۔ اس لئے سب پر شاعری کا رنگ غالب آگیا تھا اور اس عہد کے شرفا اور امرا میں شاعری منجملہ لوازمات شرافت و امارت سمجھی جاتی تھی۔

ایسے ماحول میں پیدا ہو کر اور سانس لے کر سرسید کے لئے کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس عام کلیہ سے مستثنیٰ رہتے۔ انکا دل جذبات کا دریائے مواج تھا۔ ان کے کارہائے نمایاں انھیں جذبات کی لہریں تھیں عنوان شباب میں رنگین صحبتیں بھی ملی تھیں۔ ہر وقت سوسائٹی میں شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ ان سب باتوں کا اقتضا تھا کہ وہ شاعر بھی ہوں، چنانچہ ان کی اُردو فارسی کی نظمیں ہمارے دعوے کی موید ہیں۔

سرسید کی بسم اللہ دہلی میں بڑی دھوم دھام سے وہاں کے مشہور اور مقدس بزرگ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ نے پڑھائی تھی جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ اور جانشین تھے، اس پر سرسید ہمیشہ ناز کرتے تھے چنانچہ اس کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی ز فیضِ نقشبند وقت جانِ جان جانانی

اسی طرح سے انکا ایک تغزل کا شعر ہے ؎

بتوں پر دل ودیں فدا کر رہے ہیں بنارس میں یاد خدا کر رہے ہیں

یہ شعر اس وقت کا ہے جب آپ بنارس میں منصف تھے۔

فارسی میں ان کی ایک غزل مشہور ہے جس میں ان کے مذہبی جذبات کا زبردست تموج ہے ؎

فلاطون طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم مسیحا رشک می دارد بہ درمانے کہ من دارم
خدا دارم دل بریاں ز عشق مصطفیٰ دارم ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
ز جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم
فلک یک جلوہ خورشید دارد با ہمہ شوکت ہزاراں ایں چنیں دارد گریبانے کہ من دارم

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنہ ۶۹-۱۸۶۹ء میں موزوں ہوئے ہوں گے کیونکہ یہی زمانہ خطبات احمدیہ کی تالیف کا تھا۔ یہ کتاب عشق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوش و جذبہ میں لکھی گئی ہے۔

انھوں نے جب سنہ ۴۵-۱۸۴۴ء میں آثار الصنادید تصنیف کی تھی تو اس کے دیباچہ میں سر ٹامس مٹکاف کی تعریف میں اٹھاون اشعار کی ایک مثنوی لکھی تھی۔ ابتدا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ممدوح زمانہ راستائم صد دفتر وصف او کتائم

بندم ز گل بہار اوصاف — گلدستہ بدست طبع وصاف
آرم بحضور بارگاہش — ریزم گل صد ثنا براہش
از بحر سخن گہر برآرم — بر فرق سرش گہر ببارم
ہر لولوئے شاہوار وصفش — ہر گوہر آبدار وصفش
در سلک کشم بحسن وترتیب — ترتیب دہم بحسن وتہذیب
مضراب زنم بتار گفتار — صد نغمہ برآورم ازیں تار
وز ہر بن و مو ترانہ گویم — صد رنگ بہر ترانہ جویم
در جام سخن مئے معانی — ریزم بہ ہزار کامرانی

ہر عقدہ کہ اشتدم بہر کار
بکشائم ازیں شگرف اسرار

ان اشعار میں دیکھئے کس قدر سادگی سلاست اور روانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا آہستہ آہستہ بہتا چلا جا رہا ہے۔

جب علی گڑھ میں ۱۸۶۴ء میں ہز آنر ڈرمینڈ نواب لفٹنٹ گورنر سائنٹفک سوسائٹی کا سنگ بنیاد نصب کرنے کے لئے آئے تو رسم ادا کرنے کے وقت سر سید نے تقریر سے پہلے ان اشعار میں اپنے جذبات ادا کئے ؎

ہم غریبوں کی یہ قسمت ہو کہ آپ آئے یہاں — ورنہ شاہوں کو گداؤں سے کوئی ہے التیام
آپ کی بندہ نوازی سے ہوئی دولت نصیب — آپ کے تشریف لانے سے ہوئی عزت تمام
ہمتیں دونی ہوئیں اور آپ کے چرچے ہوئے — بندہ پرور آپ کے قدموں کے ہیں سارے کام
آپکی تشریف دولت یوں ہی جلوہ گر ہوئی — پایۂ محفل نے پایا پایۂ والا مقام
آپ کے تشریف لانے سے ہوئی ہمت قوی — ورنہ ہم کیا ہیں کہ ہم سے ہو کوئی کام انصرام
صورت امید پیش آئی کہ آپ آئے یہاں — کیا مبارک مدعا یعنی رفاہ خاص و عام

اک بڑی بات آپ کا تشریف لانا ہو کہ آپ — مرجع آفاق ہیں اور مامن خیل انام
اک عنایت تھی کہ آپ اس جا کرم فرما ہوئے — ورنہ ایسے نامیوں کو ہے کوئی پروائے نام
اب دعا یہ ہے کہ اشفاق آپ کا قائم رہے — جب تلک باقی ہے دنیا میں نشان صبح و شام

ان دو نظموں سے زیادہ لطیف ایک نظم وہ ہے جو ۱۸۹۱ء میں لکھی گئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سرسید ڈپوٹیشن لیکر بھوپال اور حیدر آباد گئے تھے اور بھوپال میں نواب شاہجہاں بیگم (خلد مکان) نے انکا بڑا احترام کیا، باریابی کے وقت سرسیدؒ نے مدرسۃ العلوم کی کیفیت، مسلمانوں کی حالت اور ان کو حسب مقتضائے زمانہ تعلیم کی ضرورت، اور اُن کے تنزل کی صورت بیان کی۔ دوسرے دن سرکار خلد مکان نے بارہ ۱۲ ہزار روپیہ سرسید کے پاس بھیجے۔ سرسید نے ایک نظم اس عطیہ کے شکریہ اور رسید میں پیش کی ؎

اے شاہ جہاں، باد جہاں حسب مرتب — دارائے جہاں یاور افلاک غلامت
ہم حکم تو نافذ بہ دل خلق جہاں باد — ہم نظم جہاں باد بہ عنوان نظامت
بدخواہ تو پامال لگدکوب حوادث — طغرائے ظفر باد بہ منطوق کلامت
آنان کہ بد اندیشۂ مدح تو گرائید — بالائے ترا ز اندیشۂ عنان باد مقامت
اے نصرت اسلام بہ ذات تو مسلم — وے سکۂ دیں پروری امروز بنامت
دانی کہ چہ وقت ست و چہا می رود امروز — بر امت خیر البشر از نکبت و شامت
کارش ز تنزل برسید است بجائے — کش ساختہ خلقے ہدف تیر ملامت
طوفاں زدہ شد کشتی اسلام مبادا — کز دست رود رشتۂ امید سلامت
وقت است کہ آنرا برہانند ز طوفان — زاں پیش کز و ہیچ نہ یابند علامت
تا ہست درت تکیہ گہ دولت اسلام — یزدانت معین باد جہاں باد بکامت
تو شاہ جہاں باشی و خورشید شریعت
پیوستہ درخشاں بود از گوشۂ بامت

کبھی کبھی دو چار شعر کسی خاص جذبہ میں بھی موزوں ہو گئے ہیں چنانچہ یہ شعر ؎

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ و نہ طور　　　ایں دلم ہست کہ زیں گونہ ہزاراں دیدہ است

جو اُن کے سنگ مزار کا کتبہ ہے یا مثلاً نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں ؎

میانِ احمدؐ و مہدی نہ بود ہیچ حجاب　　　تو خود حجاب خودی احمد از میاں برخیز

اس شعر کا پورا لطف حاصل کرنے کے لئے، اس خط کے جس میں یہ شعر ہے چند جملے پڑھیے "جسقدر دل کو مسرت آپ کے خط سے ہوئی۔ بیان نہیں کر سکتا۔ اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی۔ جس جذبہ محبت سے لکھا تھا وہ ان لفظوں میں موجود تھا اور آنکھ سے برابر دل میں پہنچا تھا۔ جس محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے ان کو پڑھ کر میں ایسا محو ہوا گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں۔ اس کیفیت سے وحدت وجود کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ میاں احمد الخ"

ایم اے او کالج کے لئے ایک جلسہ کیا خود انہوں نے اور ان کے دوستوں نے سوانگ بھرا اس موقع پر دل ہلا دینے والی تقریر بھی کی اور آخر میں خواجہ حافظ کی مشہور غزل "ساقیا برخیز و درِدہ جام را" میں اس شعر ؎

ہر کہ دید آں سرو گل اندام را　　　ننگرد دیگر بسرو اندر چمن

کے بعد دو شعر اضافہ کر کے خاص انداز میں سنائے ؎

کیست آں سرو سہی کاندر سرش　　　باختم دیں و دل و آرام را

قوم ما اے قوم ما کز بہر تو　　　کردہ ام برباد ننگ و نام را

سرسیّد کو شاعری کا پورا ذوق تھا اور اچھے شعر سے لطف حاصل کرتے تھے۔ اچھے شعرا کے قدر شناس تھے اردو اور فارسی میں قومی شاعری کی بنیاد بھی انہیں سے قائم ہوئی۔ حالیؔ۔ شبلیؔ۔ نذیر احمد کی شاعری کا رنگ اُن ہی کے فیض سے بدلا۔ حالیؔ نے ان کی فرمائش پر اپنا مشہور مسدس مد و جزر اسلام لکھا۔ جس کے لئے سرسید لکھتے ہیں کہ اگر "خدا پوچھیگا کہ میرے لئے دنیا سے کیا تحفہ لایا ہے تو کہوں گا کہ حالیؔ سے یہ مسدس لکھوالایا ہوں"۔ اسی طرح قومی اور وطنی مثنویاں اور نظمیں انھیں کی فرمائش پر لکھیں۔ ایرانی شعرا میں مرزا کمال الدین سنجر طہرانی نے سب سے پہلے قومی رنگ سرسید اور علی گڑھ کے اثر سے اختیار کیا سرسیّد مرزا سنجر کے بڑے قدر دان تھے۔ گھنٹوں شعر و سخن کا چرچا رہتا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "اس ایرانی

بچے نے مجھکو جوان کر دیا" مولوی احمد علی شوق کی قومی رباعیاں بہت پسند تھیں اور ان کو "نمونۂ شوق" کہتے تھے۔ یہی صحبتیں اور یہی چرچے تھے جن سے کالج کے طلبہ میں قومی نظموں کی طرف رجحان ہوا۔

سرسیدؒ نے غزل گوئی اور قصیدہ خوانی کو اپنا پیشہ نہیں بنایا اور کبھی شاعروں میں اپنا کلام سُنا کر دادِ سخن حاصل نہیں کی، سرسید کا نثر نگاروں میں درجہ متعین ہے۔ ان کو میر انیس کی طرح اپنی زبان پر ناز تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی کسی تحریر یا تقریر میں نہیں کیا لیکن ان کی خانگی زندگی میں اس کی ایک مثال ملتی ہے جس کو قارئین کی دلچسپی کے لئے لکھتا ہوں۔ ایک مرتبہ سرسید اور جسٹس محمود میں کسی لفظ پر بحث تھی۔ مسٹر محمود جس طرح کہتے تھے سرسید کو اس سے اختلاف تھا۔ کچھ دیر بحث و تمحیص کے بعد مسٹر محمود نے ناز کے لہجے میں کہا کہ جس بزرگ گھرانے میں میں نے پرورش پائی ہے۔ وہ زبان اُردو کی ٹکسال ہے۔ لہٰذا جو لفظ میری زبان پر ہے وہ صحیح ہے۔ بزرگ باپ نے دلیل کی صحت سے اتفاق کر کے فرمایا لیکن میری زبان کی صحت تم سے زیادہ معتبر ہے اور اسکا سبب یہ ہے کہ تمہاری پرورش کے زمانہ میں یورپ کی رہنے والی ایک دایہ ملازم رہی تھی اس کے لب و لہجہ سے کسی قدر اثر پذیر ہونا لازمی تھا۔ اب جو تم غلطی کر رہے ہو یہ اسی کا نتیجہ ہے لیکن میری پرورش ان مخدرات نے کی جنکی زبان مسلمہ طور پر فصیح اور صحیح تھی کیونکہ میری پرورش میں علاوہ اور احتیاطوں کے صحت اور درستی زبان کا بھی خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا۔ اس لئے زباں دانی کے معاملے میں میری زبان بطور "سند" کے ہے۔

سرسید نے ادبیات اُردو میں حسین اور دلنشین اصطلاحوں اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اپنے خاص دوستوں کو خط لکھتے لکھتے کبھی وہ بعض باتوں کی ایسی شاعرانہ توجیہ کر جاتے ہیں اور ایسے فقرے لکھ جاتے ہیں کہ عبارت منظوم معلوم ہونے لگتی ہے۔ سرسید کا یہی مذاق سخن انکے لائق فرزند جسٹس محمود کو ورثہ میں ملا تھا اور وہ بھی بے مثل نقاد اور سخن فہم تھے۔ وہ شعر بہت کم کہتے تھے اور جو ہوتا تھا وہ شاعری کا بہترین نمونہ ہوتا تھا نامور باپ اور محترم دادا کے اس مذاق کا اثر راس مسعود مرحوم میں بھی موجود تھا۔

سرسید کا غدر سے پہلے کا کلام قلمی اور مطبوعہ صورتوں میں تھا جو ہنگامہ غدر میں برباد ہو گیا۔ کہیں کہیں کسی کے پاس کچھ اوراق اور پرچے باقی ہونگے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انکو یکجا جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ امید ہے کہ یونیورسٹی کے علم دوست حضرات اسکی طرف توجہ فرمائیں گے۔

ڈانواں ڈول

مسعود حسین خاں صاحب ایم۔ اے (علیگ)

سن! "روشن ہیرے" انمول
میں پھرتا ہوں ڈانواں ڈول

سارا پکّا آج ہے کچا! خود جیون جھوٹا یا سچا؟
شک سے گھیرے گھیرے ہیں یہ کیا بتلاؤں کیا ہے اچھا
ہاں جیون ہے ایک ٹھٹھول
میں پھرتا ہوں ڈانواں ڈول

ایک دھڑک ہی میرے من میں سلگن سی ہے سارے تن میں
کیسا پکا، کیسا سچا؟ پگھلن ہے سارے جیون میں
راز دے جیون کا اب کھول
میں پھرتا ہوں ڈانواں ڈول

سونا یہ سنسار نیا اب جیون بھی اک بار نیا اب
اپنے بوجھ سے آپ ہی دبنا بھاگ ہی کھیون ہار نیا اب
اپنی ہستی غم میں گھول
میں پھرتا ہوں ڈانواں ڈول

جو بھی مقصد سامنے آئے وہ پانی سا بہتا جائے،
پھر بھی اس دھارے پر بہنا یہ جیون آشا کہلائے،
جب آشا کرتی ہے کلول،

میں پھرتا ہوں ڈانوں ڈول

من کی ساری قوت زائل پھر بھی آشا کھینچ پہ مائل
کتنا سادھا لیکن آخر ڈوبا اور دو ہاتھ پہ ساحل

کیا سارا جیون ہے بول
میں پھرتا ہوں ڈانواں ڈول

میں ہنستا ہوں رو لیتا ہوں میں پاتا ہوں کھو دیتا ہوں
اس سے لے اسکو دیتا ہوں میں دکھ کو سکھ کر لیتا ہوں

مکھ سے اپنے کچھ تو بول
میں پھرتا ہوں ڈانواں ڈول

چاند سا کچھ غمگین ہوں رہتا جیون اندھیارے کو تکتا
ڈھل جاتے ہیں من کے دھبے جب ہر من میں پریم دمکتا

کیسے کروگے پریم کا تول؟
میں پھرتا ہوں ڈانواں ڈول

میرا سونا من پر پرکھو ایک سنہری ریکھا کھینچو
جوہری وہ جو دیکھ کے پھینکے من پرکھے تم بھی مت پھینکو

کیوں نہیں کرتے اس کا مول؟
میں پھرتا ہوں ڈانواں ڈول

ٹھوکر

جناب مصباح الحسن صاحب صدیقی بی ایس سی (فائنل)

"ایک زندگی کے چند منتشر اوراق"

" زندگی چند خوشگوار قہقہوں اور ان گنت آنسوؤں کے مجموعہ کا نام ہے"۔ اُس نے کہا۔ دو ننھے آنسو رخساروں کو چومتے ہوئے اُس کی آغوش میں گم ہو گئے۔ کسی نے کہا۔ بیوقوف تو ان بیش بہا موتیوں کو اس طرح لٹا رہا ہے۔ زندگی صرف قہقہوں کا نام ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو مسکرا ہنس قہقہے لگا۔ دنیا ایک سراب ہے تو تو بھی معمہ بن جا۔ دنیا میں ترقی کا راز ہی یہ ہے۔

وہ مسکرایا۔ میں غلطی پر تھا۔ میرے عالم تخیل کی وہ معصوم دنیا جیسیں انسانیت۔ محبت۔ ہمدردی وراستبازی آباد تھیں۔ وہاں انسانیت کا خون۔ محبت کی توہین۔ ہمدردی کی تحقیر۔ نیکی کی شکست اور راستبازی کی دھول اُڑتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے (life is for living) اس نے کہا اور مسکراتا ہوا چلدیا۔

(۲)

وہ حسین تھا۔ اور نوجوان۔ اُس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں ایک خاص کشش پنہاں تھی۔ چہرے پر رنج و ملال کے آثار نے اسے اور بھی جاذب نظر بنا دیا تھا۔ اُس نے زندگی کی پندرہ منزلیں یتیم خانہ کے تاریک گوشوں میں طے کی تھیں۔ اُس کی خاموشی اور تنہا پسندی نے اُس کے ساتھیوں کو خود ترقی سے سنایا۔ وہ اُس کی بنائی ہوئی چیزوں سے انعامات اور منتظمین کی خوشنودی مزاج حاصل کرتے۔ وہ دیکھتا اور خاموش رہتا۔ اُس کو بچپن ہی سے تعلیم اور مصوری کا شوق تھا۔ چنانچہ اس نے صنعتی تعلیم کے علاوہ میٹرک کا امتحان بھی دیدیا۔ وہ نتیجہ کا منتظر تھا۔ اور مستقبل کی خیال آرائی میں گم۔ وہ بھی آزاد زندگی کا خواہاں تھا۔ نتیجہ امتحان کے فوراً بعد اُس نے اپنے گہوارہ کو خیرباد کہا۔ اُس نے سوچا میٹرک پاس کر لیا ہے فن بھی ہاتھ میں ہے۔ کیوں نہ شرافت اور آزادی کے ساتھ زندگی گذاروں۔ وہ تمام دنیا کو اپنا ہی جیسا سمجھتا تھا۔ اُس نے بہت سوچ سمجھ کر دنیا میں قدم رکھا۔ اس کا مطمح نظر راستبازی

؛ ورسچائی کے ساتھ خدمتِ خلق تھا۔ لیکن اُس نے جتنے قدم اٹھائے۔ اِس فریبی دنیا نے اس کو اُتنے ہی پیچھے ہٹا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا لیکن سنھلتا۔ وہ صبح کو بھٹکتا لیکن شام کو واپس آجاتا۔ حقیقی معنوں میں آسے دنیا میں قدم رکھے ہوئے کچھ ہی دن گذرے ہوں گے کہ اُس پر دنیا کی حقیقت کا راز کھلنے لگا۔ اُسکے طلسمی پردے چاک ہوتے ہوئے نظر آئے۔ اُس نے کتاب دنیا کا مطالعہ شروع کیا۔ Might is Right اس کتاب کی پہلی سرخی تھی۔ جس کا ہر ہر لفظ زہر ہلاہل میں بجھا ہوا تھا۔ جس کی ہر ہر بوند انسانیت کا خون کر سکتی تھی۔ اِس کتاب میں اُس نے ایسی ایسی خونین داستانیں پڑھیں جن کو پڑھکر اُس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اُس نے دیکھا دنیا عیاشوں کی ہمدم۔ دولت مندوں کی عیش پرستی کا اڈا۔ دولت کی غلام غریبوں کے خون کی پیاسی۔ اور راستبازی کی جانی دشمن نظر آئی جس میں ترقی کا راز خوشامد۔ حق تلفی۔ دوستی کی آڑ میں دشمنی اور خود غرضی تھا۔ جہاں عیاری کا مہذب نام پالیسی اور دولت کا غربت پر اثر حکومت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ بھی خاک سے تخلیق کیا ہوا انسان تھا۔ کب تک سنبھلتا۔ آخر ٹھوکر کھائی اور دنیائے رنگ و بو میں ایک نئے رنگ سے داخل ہوا سنسان جنگل میں ایک خشک درخت کے نیچے اس نے یہ الفاظ کہئے (Life is for Living) ایک زبردست قہقہہ جنگل کے سکوت کو توڑتا ہوا فلک سے جا ٹکرایا۔ دنیا خوش تھی۔ فضا نے پھریری لی۔ نیکی کو شکست فاش ہوئی۔

(۳)

برسات کی ایک پُرفضا شام تھی۔ سورج اپنی دن بھر کی ناکام کوششوں کے بعد مغرب میں مُنہ چُھپانا چاہتا تھا۔ کالے کالے بادل اپنی فتح پر نازاں آسمان پر محوخرام تھے۔ خُنک ہوا فضا میں تیر رہی تھی۔ مال روڈ کے ایک خاموش حصہ پر ایک شاندار موٹر کے پاس ایک خوبصورت نوجوان بوسیدہ لباس میں ملبوس کھڑا تھا۔ ..... "ارے نوجوان میں نے تم کو کئی مرتبہ اِدھر پھرتے دیکھا۔ تم بہت پریشان معلوم ہوتے ہو۔ تم نے یہ راہ نوردی آخر کیوں اختیار کر رکھی ہے۔ تمہیں کچھ کام بھی آتا ہے"

جی ہاں میں نے فن نجاری سیکھا ہے۔ مگر مصوری سے زیادہ شوق ہے۔"

"مصوری... بھائی واہ۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔" ایک بھدے جسم کے رئیس نے موٹر سے اُترتے ہوئے

کہا: ارے بیوقوف تو تم اپنے فن سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے .... تم ... تم دولت حسن سے مالا مال ہو۔ عزت۔ دولت۔ حسن۔ سب کچھ خرید سکتے ہو۔ چلو میرے ساتھ۔ روپیہ جس قدر چاہو مجھ سے لو ... مصوری کی کشش سے حسین و رنگین تتلیاں خود ہی کھنچیں گی۔ تم انہیں اپنے حسن کے جال میں پھانسو۔ پھر روپیہ ... روپیہ تمہارا غلام ہے .... میرے گھر روپیہ کی کھیتی ہوتی ہے۔ ... چلو .... ارے رکتے ہو .... تم نادان ہو لڑکے .... دنیا اسی کا نام ہے .....

(۴)

لاہور کی سالانہ نمائش میں آرٹ گیلری پر بہت ہجوم ہے۔ صدہا تصاویر دعوت نظارہ دے رہی تھیں مگر سب سے زیادہ جاذب نظر تصویر ایک نئے مصور تنویر کی ہے .... تصویر میں دو راستے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک نہایت سیدھا راستہ ہے جو چند خشک درختوں کے بیچ سے گذرتا ہے۔ اور بہت دور جا کر اختتام پر کچھ سرسبز درخت نظر آتے ہیں۔ چند مرجھائے ہوئے پھول اور لاتعداد خشک پتے اس راستہ کی زینت ہیں .... دوسرا راستہ بہت ہی خوبصورت باغ سے گذرتا ہے۔ جس میں قسم قسم کے رنگین پھول ..... سبزہ اور سرسبز کنج دکھائی دیتے ہیں۔ ایک کنج کے نزدیک چند حسین لڑکیاں کھڑی ہیں۔ ایک نوجوان دونوں راستوں کے نقطہ اتصال پر کھڑا ہے۔ اس کا رخ سیدھے راستہ کی طرف ہے۔ لیکن قریب کے گلاب کی خار دار ٹہنی اُس کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ نوجوان کا چہرہ لڑکیوں کی طرف ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا ہے ... "جانا ہی پڑا"

لوگ تصویر کی تعریف کر رہے تھے ایک فقیر یہ کہتا ہوا گذرتا ہے۔ تصویر کی تعریف تو کر رہے ہو۔ اس کو سمجھنے کی کوشش بھی کرو۔

(۵)

تنویر کے نگار خانے میں ایک حسین دوشیزہ کسی خیال میں گم ایک قیمتی صوفہ پر متمکن ہے۔

"معاف کرنا رابعہ۔ تم کو انتظار کی تکلیف برداشت کرنی پڑی" تنویر نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔

رابعہ۔ "انتظار کی تلخی میں بھی ایک شیرینی ہے تنویر"

تنویر۔ اول۔ یہ بات ہے رابعہ.... ... ... یہ دنیا فانی ہے اس کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہماری محبت بھی۔ رابعہ منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔

رابعہ ۔ ایسا نہ کہو تنویر...... عورت صرف ایک مرتبہ محبت کرتی ہے پیارے۔ میری طرف دیکھو میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں......... تم میرا دل نہ دکھاؤ۔ ایسا منحوس خیال ہی کیوں دل میں لاتے ہو۔

تنویر اپنی غیر متوقع کامیابی پر معنی خیز ہنسی ہنستا ہے۔

(۶)

رات ..... سیاہ رات۔ کسی حسین دوشیزہ کی کالی زلفوں کے مانند سیاہ۔ گناہوں کی دنیا بسائے نت نئے ڈرامے دکھانے کو تیار تھی۔ سنسان اور پُر سکوت فضا اپنے اندر تمام معصیتیں اور آلودگیاں سمیٹے دولت اور شباب کو دعوت عمل دے رہی تھی۔ تنویر رابعہ کو لئے موٹر سے اُترا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر چلے ہونگے کہ دو مضبوط نوجوانوں نے تنویر کو باندھنا شروع کیا۔ رابعہ یہ روح فرسا منظر دیکھ کر بیہوش ہو گئی۔ تنویر تو گھر پہونچا دیا گیا۔ اور رابعہ۔ .. معصوم رابعہ اس دولتمند بھیڑئے کی ہوس رانی کا شکار ہوئی...... بیچاری رابعہ بھگتے دھوکا دیا گیا.... یہ کوئی نئی بات نہیں..... دولت ہمیشہ ہی اس قسم کے سودے کیا کرتی ہے۔

(۷)

دوسرے روز رابعہ ملول و مضمحل تنویر کے کمرے میں اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ تنویر یہ کہتا ہوا داخل ہوتا ہے "رابعہ مجھے تعجب ہے کہ اب تم میرے پاس کیوں آئی ہو۔ کیا تم اپنے گرم گرم آنسوؤں اور پُر درد آہوں سے اپنی پارسائی کا ثبوت دینا چاہتی ہو۔ رابعہ میں نادان نہیں..... تم جا سکتی ہو........ میں تمہارے حسن سے نہیں دوشیزگی سے محبت کرتا تھا۔ میری محبت اب کراہیت میں بدل گئی.........

(۸)

رابعہ مجبوراً وہیں دکھائی دیتی ہے جہاں رنگینیوں اور دلفریبیوں کا بازار لگتا ہے۔ جہاں حسن اور جوانی کے سودے چُکائے جاتے ہیں۔

(۹)

رات وہ رات ... جبکہ ماہِ عالمتاب اپنی پوری ضو فشانی کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا۔ تنویر کسی خیال میں غرق ایک صاف چٹان پر بیٹھا ہے ...... "میرے پاس دولت۔ عزت۔ شہرت کسی کی کمی نہیں۔ رابعہ۔ حسینہ۔ ارونا۔ ایلن اور کئی حسین لڑکیوں نے مجھ سے محبت کی۔ مجھے خوش رکھنے کی کوشش کی لیکن کیوں میرا دل کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ کیوں میری روح میرے جسم سے بیزار ہو کر نکل جانا چاہتی ہے۔ ......

.... اے خوبصورت چاند۔ مجھے ایسی جگہ پہونچا دے جہاں کی زمین میں یہ سناٹا۔ جہاں کے آسمان میں یہ تاریکی۔ جہاں کی فضا میں یہ ہیبت۔ جہاں کے نشیب و فراز میں یہ بےلطفی نہ ہو ...... میں وہاں جانا چاہتا ہوں جہاں کے ذرے ذرے میں دلکشی۔ پتے پتے میں تازگی۔ جہاں کی بلندی و پستی میں ایک دلربائی ہو ..... مگر میں تنہا نہیں جانا چاہتا ..... آہ صبیحہ تو نے۔ مجھ پر جادو کر دیا۔ میں تجھے بھی دھوکا دینا چاہتا تھا ــــ کاش میں اس سندر جال میں نہ پھنسا ہوتا ... حسین تو سب ہی تھیں۔ سب نے مجھ سے سچی محبت کی ..... مگر ..... تجھے دھوکا نہیں دے سکتا ...... شاید اس لئے کہ تو میرے لئے ایک نیا پیغام زندگی لائی ہے۔

(۱۰)

باغ کے ایک خاموش گوشے میں تنویر صبیحہ کا انتظار کر رہا تھا .... "آج میں سب کچھ کہدونگا میں اب تک اسے دھوکا دیتا رہا۔ میں ہرگز اُس کے قابل نہیں .... کاش میں صبیحہ سے آزاد محبت کر سکتا۔

صبیحہ کنج سے نکلکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھدیتی ہے۔

تنویر گھبرا کر۔ صبیحہ مجھے نہ چھوؤ میں پاپی ہوں۔ فریبی ہوں۔ دوشیزگی کا دشمن ہوں ... صبیحہ تم جاؤ میں تمہارے قابل نہیں۔ میں نے تمہیں دھوکا دیا۔

صبیحہ۔ تنویر تمہیں کیا ہو گیا۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہو۔ میری آرزوؤں کا خون کر کے ــــ کیا تمہاری محبت کے وہ سُریلے گیت سب جھوٹے تھے۔

تنویر۔ صبیحہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ معصوم محبت ...... اسی لئے تو دور رہنا چاہتا ہوں کہ کہیں میری معصیت تمہارے دامن کو نہ چوم سکے۔ صبیحہ تم مجھے بھول جانے کی کوشش کرو ..... میں چلا جاؤنگا۔

۔۔۔ بہت جلد۔ کسی نامعلوم مقام پر۔ صبیحہ میری زندگی گناہوں کا افسانہ ہے ۔۔۔۔۔ یہ پودا معصومیت کو ذبح کر کے اس کے خون سے سینچا گیا ۔۔۔۔ تم چلی جاؤ صبیحہ ۔۔۔۔ کہیں اس کے چھینٹے تمہارے دامن کو داغدار نہ کر دیں۔

صبیحہ۔ تنویر۔ یہ کیا کہہ رہے ہو ۔۔۔۔ خدارا میرے حال پر رحم کرو ۔۔۔ میں تمہاری ہوں اور تمہاری ہو کر رہونگی۔ اگر صبح کا بھولا مسافر شام کو واپس آ جائے تو وہ بھولا نہیں کہلاتا۔ تم آئندہ کے لئے توبہ کر لو۔ اگر اپنے لئے نہیں تو میرے لئے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے کچھ تو بتاؤ۔

تنویر۔ صبیحہ تم میری روداد زندگی سُننا چاہتی ہو۔ اچھا سنو شائد اسی کو سن کر مجھ سے نفرت کرنے لگو میں یتیم خانہ میں پلا بڑھا۔ مجھے اپنے حسب ونسب کے متعلق کچھ علم نہیں۔ میں تلاش معاش میں دربدر ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ مجھے ایک دولتمند بڈھا ملا۔ اُس نے مجھے خرید لیا۔ اپنا آلہ کار بنانے کے لئے اپنی دولت اور میرے حسن سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے لئے۔ اس نے بڑی بڑی قیمتوں پر مجھ سے حسین تتلیاں خریدیں۔ جن کو میں نے اپنے حسن کے جال میں پھانسا ــــ آج میرے پاس جو کچھ ہے سب اسی کی بدولت۔ میری رگ رگ میں معصوم دوشیزاؤں کا خون تڑپ رہا ہے ۔۔۔ میرا ریشہ ریشہ آلودگی سے پرورش پا رہا ہے ۔۔۔ سن لیا صبیحہ اب جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔

صبیحہ۔ (روتے ہوئے) تنویر میں تمہیں اس تاریک غار سے نکال لوں گی۔ اگر تم چاہو۔

تنویر۔ صبیحہ تم بہت نازک ہو۔ مجھے اس غار سے نہیں کھینچ سکتیں۔ میرا جسم گناہوں سے بھاری ہے۔

صبیحہ۔ کچھ بھی ہو تنویر میں نہیں جاؤں گی۔ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ خواہ جان ہی کیوں نہ جائے۔ تنویر صبیحہ کو آغوش محبت میں لیکر پیار کرتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا مقدس بوسہ تھا۔

تنویر۔ صبیحہ۔ تم نے مجھے نئی زندگی عطا کی۔ تم میرے لئے شمع ہدایت بنیں۔ میں تمہاری پرستش کروں گا۔

صبیحہ مسرور تھی۔ تنویر زود پشیماں۔ دونوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند مستقل مسکرا رہا تھا۔ ستارے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ فطرت بھی شائد اس کھیل سے محظوظ ہو رہی تھی۔

(۱۱)

تنویر کے نگار خانے میں صبیحہ اور تنویر خوش خوش بیٹھے ہیں۔

صبیحہ۔ (ہنستے ہوئے) تنویر مگر تم نے اُس خونخوار بھیڑیئے کا نام بھی نہیں بتایا۔

تنویر۔ چھوڑو صبیحہ اب میں اُس مردود کا نام بھی نہیں لینا چاہتا۔

صبیحہ۔ لیکن میں تو اس سے اُن معصوم لڑکیوں کا انتقام لینا چاہتی ہوں۔ جو اس کی حیوانیت کی شکار ہوئیں تم کو بتانا ہی ہوگا۔

تنویر۔ صبیحہ میں اس سے انتقام نہیں لینا چاہتا۔ کیوں ۔ اس لئے کہ اسی کے بدولت میں نے تمہیں پایا ہے۔ (ہنستے ہوئے) لیکن میں تمہیں اس سے ملا ہی کیوں نہ دوں۔

صبیحہ۔ (مسکراتے ہوئے) مجھے بھی دھوکا دینا چاہتے ہو۔

تنویر۔ ہاں ۔ اور خود کو بھی۔

(۱۲)

تنویر اور صبیحہ اُنہیں گناہ آلود چٹانوں پر پھر رہے تھے جن سے ٹکرا ٹکرا کر کئی بار بے بس اور باریک چیخیں فضا میں گم ہو گئی تھیں ۔ جہاں آج سے پہلے کئی بار دولت انسانیت کے خون سے ہولی کھیل چکی تھی۔ جہاں کئی مرتبہ معصوم التجائیں کرخت قہقہوں سے ٹھکرا دی گئی تھیں ۔۔۔ آج وہیں عطر بیز بادِ نسیم محوِ خرام تھی۔ کائنات خاموش اور فضا پر سکوت تھی۔ صبیحہ کی چیخ نے تارِ سکوت توڑا ۔ چٹان کی آڑ سے دو مضبوط نوجوانوں نے تنویر پر حملہ کیا۔ دوسری طرف سے سیٹھ صاحب نے نکلکر صبیحہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "اے حسین چڑیا۔ اُس کو بھول جا۔ وہ نادار چھوکرا میرے ٹکڑوں پر پلا ہے۔ صبیحہ روالور کا رخ سیٹھ کی طرف کر دیتی ہے۔ لیکن یکایک چیخ مار کر بیہوش ہو جاتی ہے۔ سیٹھ۔ ایں۔ کون۔ صبیحہ۔ میری بیٹی میری بیٹی۔ آہ۔ چھوڑ دو ظالموں اِس کو۔ . . . . . میں پاپی ہوں۔ خونی ہوں۔ بیٹی۔ بھاگتا ہے۔ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر پہاڑ سے نیچے گر جاتا ہے۔

(۱۳)

لاہور کی سالانہ نمائش اپنے اندر تمام رنگینیاں اور دلفریبیاں لئے ہوئے ہے۔ آرٹ گیلری پر بہت

ہجوم ہے۔ وہاں دو تصویریں بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو وہی ہے جو گذشتہ نمائش میں انعام حاصل کر چکی تھی دوسری اسی مصور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ تصاویر دونوں قریب قریب ایک ہی سی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اُس نوجوان کے ساتھ ایک دوشیزہ ہے۔ دونوں کا رُخ سنسان اور سیدھے راستہ کی جانب ہے تصویر کے نیچے لکھا ہے۔ "ٹھوکر کے بعد"

صبو
تنو
صبو
تنویر

تنقید و تبصرہ۔ کتاب العلم

(مولفہ محمد سعید بیگ و محمد اسمٰعیل نعیم)

قیمت پہلے حصہ کی ۱۲؎ ۔ ملنے کا پتہ دلی ایسٹرن اسٹیشنری اینڈ پبلشنگ لمیٹیڈ۔ لاہور

کتاب العلم کو جیسا کہ اس کے مولفین کا دعویٰ ہے' اُردو کی پہلی انسائیکلوپیڈیا سمجھنا چاہیئے۔ بادی النظر میں خیال ہوتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کا تصور مشرق نے مغرب سے مستعار لیا۔ درحالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے عہد جدید میں یورپ میں سب سے پہلے اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں علوم کے دریا کو پہلی دفعہ کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس سے صدیوں پیشتر ایران میں ایک انجمن 'اخوان الصفا' قایم ہوئی تھی جس کے رسائل نے اس دور کے تمام علوم کا بخوبی احاطہ کر لیا تھا۔ جس طرح ہندوستان کی روئی لنکا شایر سے واپس آنے کے بعد قطعاً پہچانی نہیں جاتی۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے اسلاف کے علمی کارناموں پر افرنگ کی صیقل کی خیرہ کن چمک شناخت میں حارج ہوتی ہے۔ اور ہمارے احساس کمتری کو شدید تر کر دیتی ہے۔ کیا عجب کہ اس شعر میں ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اقبال کا اشارہ نہ صرف ہمارے انمول ادبی نسخوں کی طرف ہو جو مغربی کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کے ذہن میں وہ نہریں بھی ہیں جو اہل یورپ نے ان سرچشموں سے نکالیں۔ وہ نہریں جن کے کمزور دھاروں سے اب خود ہمارے کھیتوں کی آبیاری ہو رہی ہے۔

گذشتہ ایک سو چالیس سال میں خصوصاً اور گذشتہ چار صدیوں میں عموماً سائنس کی ترقی کے ساتھ علم کے ذخیرہ میں تعجب انگیز اضافہ ہوا ہے جس کا نتیجہ (اور ایک حد تک سبب بھی) (Specialization) یا مہارت خصوصی کا فروغ ہے۔ قدما عام طور پر تمام علوم میں جو ان کے عہد میں رائج تھے خاصی دسترس بہم پہونچا

لیتے تھے۔ مثلاً حکیم بوعلی سینا بیک وقت فقیہ، منجم، طبیب، اور فلسفی تھا۔ عمر خیام اپنے زمانے میں بہ نسبت شاعر ہیئت داں اور ھندس کی حیثیت سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں علم کا ذخیرہ بڑھتا گیا دماغ علم کے تمام شعبوں پر عبور پانے سے قاصر ہوتے گئے۔ شجر سے توجہ شاخوں، شاخوں سے پتیوں تک محدود ہوگئی اور اگر موجودہ (Specialization) کو مدنظر رکھا جائے تو استعارے کو پتیوں کی نسوں تک طول دینا پڑے گا۔

لیکن اگر محض مہارتِ خصوصی پر اکتفا کیا جائے تو ہمارے دماغ کی نشو و نما یک طرفہ اور ناقص رہ جائے گی۔ دوسری طرف یونانیوں کے عہد کے بعد ہمارے زمانے میں توجہ انسان کے تمام قوا اور صلاحیتوں کو فروغ دینے کی جانب مبذول ہوئی ہے۔ اور ایک متمدن انسان کے لئے ہر علم سے سرسری سا تعارف لازمی قرار دیا گیا ہے۔ پس ضرورت محسوس ہوئی ایسی کتابوں کی جن سے کسی علم میں عمیق دخل حاصل کئے بغیر انسان تمام علوم کی مبادیات سے واقف ہوسکے۔ اور اپنی مشکلات کو وقت ضرورت حل کرتا رہے۔ اس ضرورت کا نتیجہ انسائیکلو پیڈیا، مخصوص لغات، اور کتب الاستناد ہیں۔

کتاب العلم کے مولفوں کی جتنی ہمت افزائی کی جائے کم ہے۔ اگرچہ ہمارا نظامِ تعلیم (انگریزی اور عربی) اس قدر ناقص ہے کہ جن لوگوں کی دسترس انگریزی کتابوں تک نہیں ان کی دلچسپی دینیات، یا ضرب اور تقسیم تک محدود رہتی ہے۔ اور جو انگریزی سے واقف ہیں، وہ اردو میں "نیازمند ہیں" یا اردو سے بے نیاز ہیں۔ تاہم ہماری ضروریات کی تشفی اور ہماری خصوصیات کی نمائندگی یہ کتاب مغربی قوامیس العلوم سے بہتر کر سکے گی۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوگا جب محض ہماری زبان سے واقفیت ایک انسان کو متمدن گنوانے کے لئے کافی ہوگی۔ اردو کا کوئی کتب خانہ اس کتاب سے خالی نہ ہونا چاہیئے۔

کتاب العلم میں مختلف شعبوں مثلاً معدنیات، حیاتیات، فلکیات، طبیعات، انسانیات، علم ایجادات، میکانیکیات، اقتصادیات، علم کائنات، اور فنونِ لطیفہ پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ خالص اردو داں طبقہ کے لئے ایک نئی چیز ہوگی۔ اندازِ بیان عام طور پر سلیس اور دلکش ہے۔ تصویری محاسن کا آغاز سرورق سے اور اختتام آخری صفحہ پر ہوتا ہے، بے شمار رنگ برنگی تصاویر نہ صرف کتاب کی آرائش

بلکہ مضمون کی وضاحت کی ضامن ہیں۔ طباعت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ چنانچہ ٹائپ چھوٹا ہونے کے باوجود مطالعہ میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ کتابت کی صحت بتاتی ہے کہ پروف ریڈنگ نہایت جانفشانی سے کیا گیا ہے۔ طرزِ تحریر جیسا کہ ذکر آچکا ہے عام طور پر سلاست لیتے ہوئے ہے۔ لیکن گاہ گاہ فاضل مدیروں کے قدم ڈگمگا گئے ہیں۔ اور انہوں نے نوشتِ مضمون نگار۔ دل کی طرح ثقیل، ہموزن، مشابہ اور ہم معنی الفاظ بکثرت محض عبارت کی تزئین کے لئے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً

"گویا موجودہ گلدستہ علمی وفنی ایک عجیب وغریب شے ہے۔ جس میں رنگ۔ برنگ اور خوشنما پھول باصرہ نوازی کو، ان کی عطر بیزی شامہ نوازی کو، ان کا کیف آور حال دلنوازی کو ... موجود ہے ..."

اسی اقتباس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صحتِ زبان کی کماحقہ پابندی نہیں کی گئی۔ "رنگ برنگ پھول"۔ افسوس کہ صحت کتابت پر ہمیں کامل اعتماد ہے۔ "کٹھن مشکلات" یہ سہو بھی اسی ذیل میں آتا ہے ایک شایہ نقص جس کا تعلق الفاظ سے کم اور معانی سے زیادہ ہے ان مثالوں میں ملے گا۔

"دیوانہ وار راست روی پر قائم رہے"

"راہِ عمل پر قائم رہے"

اس کا مطلب صرف یہ ہوسکتا ہے کہ راہِ عمل میں مصنفین کا پہلا قدم آخری قدم تھا لیکن کتاب العلم کا وجود ان کے اس انکسار کی تغلیط کرتا ہے۔ اس میں مولفین نے غالباً پامال فقرہ "راہِ عمل پر گامزن رہے" سے اجتناب کی کوشش کی ہے۔ جدت صحت کا دامن چھوڑ دے تو اس سے پرانی لکیر پیٹنا بہتر ہے۔

کہیں کہیں محاورہ میں لغزش ہوئی ہے۔ مثلاً "طاقِ نسیاں پر رکھ چھوڑی"۔

موجودہ اسلوبِ نگارش "معیار و محک" قسم کے مترادف الفاظ کے اجتماع کی خواہ وہ زورِ بیان کے لئے کیوں نہ ہوں۔ اجازت نہیں دیتا۔ اور یہ بلند پروازیاں ایک علمی کتاب کے لئے جس میں تلون اور تنوع اور اینچ کی گنجائش نہیں قطعاً ناموزوں ہیں۔ تاہم کتاب العلم میں اس قسم کے اسقام بہت شاذ ہیں اور نظر انداز کئے جاسکتے ہیں اور ممکن ہے کہ مطالعہ کی رو میں ان کے وجود کا احساس بھی نہ ہو۔ لیکن یہ عذر ایک دوسری خامی کی صفائی میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے صفحہ پر یہ سطور خود پڑھیے۔

اور اپنے عزیزوں کو پڑھنے کے لئے دیجئے۔ تحفۃً دینے کے لئے بے نظیر کتاب ہے" ایک علمی کتاب کے لئے شایانِ شان نہیں۔ علم کے شوالے میں بازار کی فضا پیدا کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔

ہماری رائے ہے کہ زیر نظر کتاب میں کچھ ٹھوس خوبیاں ایسی ہیں جو اس کے مدیران اعلیٰ کو اسکی تعریف سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

کتاب کی ترتیب حروف تہجی کے بجائے موضوعات کے اعتبار پر ہے۔ جیسا کہ مولفین نے تفصیل کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ یہ ترتیب بہتر اور زیادہ سود مند ثابت ہوگی خصوصاً اس کتاب کے لئے جو بالاقساط نکل رہی ہو۔

سلطان الاسلام

سابق ایڈیٹر علی گڑھ میگزین

(انگریزی)

نوائے مختار (فانی کی یاد میں)

از جناب مختار سبزواری بدایونی تلمیذ فانی مرحوم

کیسا یہ تار آیا دکن سے کہ ہائے ہائے — نکلی صدائے نالہ دہن سے کہ ہائے ہائے
رخصت ہوئی یہ کس کی چمن سے کہ ہائے ہائے — شعلے سے اٹھ رہے ہیں بدن سے کہ ہائے ہائے
تن کی خبر ہے مجکو نہ کچھ دل کا ہوش ہے
جو سانس آ رہی ہے قیامت بدوش ہے

کس جبر کو اٹھایا ہے بس کچھ نہ پوچھیے — کیا داغ دل پہ کھایا ہے بس کچھ نہ پوچھیے
قسمت نے کیا دکھایا ہے بس کچھ نہ پوچھیے — ہم سے کسے چھڑایا ہے بس کچھ نہ پوچھیے
اہل ہنر تھا صاحب عقل و تمیز تھا
وہ کون تھا جو دل سے زیادہ عزیز تھا

کہتا ہے کون جا کے یہ اپنے مکاں سے دور — "ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور"
اس کی لحد بھی آہ بنے گی یہاں سے دور — "اس آپ کی زمین سے الگ آسماں سے دور"
دنیائے بے ثبات میں اب جس کا نام ہے
آج اُس کی زندگی کی کہانی تمام ہے

نازش۔ رضی۔ اسیر و تولا بھی چل بسے — بسمل۔ قمر۔ زلالی۔ و اعلیٰ بھی چل بسے
تجوید۔ مذاق۔ عالی و شیدا بھی چل بسے — منظور و مست۔ میکش و رسوا بھی چل بسے
جن کی نہ تھی نظیر وہ اہل نظر اُٹھے
کیا کیا وطن کی خاک سے صاحب ہنر اُٹھے

سنئے دوستو کہ حضرت فانی کی وفات تھی ۔ ارباب علم و فن کی یہی کائنات تھی
افسوس یہ خوشی بھی مگر بے ثبات تھی ۔ دن گیا ڈھلا کہ ڈھلتے ہی اب غم کی رات تھی

وہ صدر بزم سحر بیانی بھی چل دئے
یعنی جہاں سے حضرت فانی بھی چل دئے

فانی نہ تھا مجسمۂ سوز و ساز تھا ۔ ہر شعر اُس کا عشق میں زہرہ گداز تھا
جینا بھی اُس کا راز تھا مرنا بھی راز تھا ۔ وہ مر گیا کہ جس پہ بدایوں کو ناز تھا

استاد وقت ۔ کامل دوراں نہیں رہا
وہ فخر میر فانی ذیشاں نہیں رہا

وہ شہریار ملک معانی کہاں گیا ۔ وہ تاجدار سحر بیانی کہاں گیا
وہ راز دار رمز نہانی کہاں گیا ۔ بزم ادب اُداس ہے فانی کہاں گیا

[illegible] عیش تلخ ہے بیکار زیست ہے
فرقت میں اُس کی [illegible] آہ و زیست ہے

فانی کا رنج دل سے بھلایا نہ جائے گا ۔ یہ داغ وہ ہے جس کو مٹایا نہ جائے گا
اس طرح پر مزاج کو لایا نہ جائے گا ۔ کھویا ہوا تلاش سے پایا نہ جائے گا

نظریں تلاش کرتی پھریں در بدر لئے
پائیں گی اس جہاں میں نہ اب عمر بھر اُسے